

پیش لفظ

شاہراہے روحانیت، مولانا وحید الدین خان صاحب کی انگلش کتاب "Leading a Spritual Life" کے اردو ترجمہ پر مشتمل ہے۔ اس کا موضوع روحانیت ہے جو کہ ہر دور میں اہل علم کا موضوع رہا ہے۔ لہذا زمانہ قدیم سے آج تک اس پر بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے۔ لیکن جدید سائنسی دور نے زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کیا ہے۔ پرانا اسلوب گفتگو نئی نسل کے عقلی سانچے کے تقاضے پورے نہیں کرتا ہے۔ نئی نسل سائنس کی طالب علم ہے۔ یہ تصدیق شدہ دلائل کی روشنی میں مذہب اور روحانیت کو سمجھنا چاہتی ہے۔ لہذا یہ ضروری تھا کہ اس موضوع کی وضاحت و تشریح نئے اسلوب اور مسلمہ دلائل کی روشنی میں کی جائے۔ اُس زبان و آہنگ میں کی جائے جس کو نئی نسل آسانی سے سمجھ سکے۔ مولانا نے یہ کام با احسن خوبی انجام دیا ہے۔ انھوں نے ارد گرد بکھری چیزوں، خلا میں موجود ستاروں اور سیاروں کی حرکت و گردش کی طرف توجہ دلائی۔ کہکشاؤں کی حیران کن وسعت اور کائنات کا لامحدود پھیلاؤ اور دنیا کے نظم کی مثالیں دے کر ناظم اعلیٰ کی طرف متوجہ کیا اور کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے، کہ نظم ہو مگر ناظم نہ ہو، دلکش و خوبصورت باغ ہو مگر باغبان نہ ہو۔ بلند و بالا عمارت ہو، مگر معمار نہ ہو۔ انھوں نے دور جدید میں مظاہر فطرت پر ہونے والی تحقیقات سے ایمان و یقین کو کشید کیا ہے۔ پھر ان سوالوں کے بھی جواب دیئے کہ روحانیت کیا ہے اور اس سے انسان اور معاشرے کو کیا فائدہ ہوتا ہے؟ اور کہا کہ روحانیت اللہ سے گہرے تعلق کا نام ہے۔ جب اللہ سے تعلق قائم ہو جاتا ہے پھر انسان کے قول و فعل اور کردار و اخلاق میں تبدیلی آتی ہے، اور اُس کی مثبت سوچ سے اُس کا خاندان، معاشرہ اور پوری انسانیت فیض حاصل کرتی ہے۔ وہ بے ضرر اور فیض رساں بن جاتا ہے۔ لیکن اس کے لیے اللہ سے تعلق ضروری ہے۔ لہذا لازم ہے کہ پورے شعور و یقین کے ساتھ خدا کی وحدانیت کو تسلیم

کیا جائے۔ مولانا نے خدا کے وجود کے دلائل سائنسی علوم اور مسلمہ دلائل کی روشنی میں دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ، اس کتاب میں تحریکی (Motivational) مضامین بھی شامل ہیں جو ذہنی جمود کو توڑتے، اور دانشورانہ ارتقا کا باعث بنتے ہیں۔ میں نے ترجمہ کرتے ہوئے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ مولانا کی فکر کو من و عنان بیان کر دیا جائے، ترجمہ لفظی نہ ہو بلکہ با محاورہ ہو، اور غلطی سے مبرا ہو۔ تاہم پوری کوشش کے باوجود کسی کتاب کا ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرتے ہوئے، سو فیصد اغلاط سے پاک ہونا، بڑے علماء کے لیے تو ممکن ہے۔ لیکن میرے جیسے طالب علم کے لیے یہ سوچنا بھی محال ہے۔ کہیں نہ کہیں معنی و مفہوم اور گرائمر کے متنے پر چلتے ہوئے جھول آ ہی جاتی ہے۔ اس لیے کتاب کے ترجمہ میں جو بھول چوک ہوئی ہے، اُس کے لیے میں پیشگی معذرت خواہ ہوں اور درخواست گزار ہوں، کہ جہاں کہیں غلطی نظر آئے، تو براہ مہربانی اُس سے ضرور مطلع فرمائیں، تاکہ آئندہ اشاعت میں اُس کی تصحیح کر دی جائے۔ تقریباً دو برس قبل میں نے اس کتاب کا ترجمہ کیا تھا۔ لیکن اس کی اشاعت کے مرحلے مجھے قدرے بھاری معلوم ہوتے تھے۔ لہذا یہ کتاب چھپ نہ سکی۔ میں ڈاکٹر عالیہ فاروقی صاحبہ (اسلام آباد) کا شکر گزار ہوں کہ جب انھیں اس کتاب کے ترجمہ کا پتا چلا، تو انھوں نے میری حوصلہ افزائی فرمائی اور رہنمائی بھی کی۔ جس کے نتیجے میں آج یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے مزید اس کتاب کے ترجمہ کے دوران، میری بھتیجی مہوش سہیل جو کہ میری بہو بھی ہے، میری معاونت کرتی رہی، جس کے لیے میں دعا گو ہوں کہ اللہ اُسے جزائے خیر دے (آمین)۔ یہاں یہ ذکر کرنا بھی مناسب ہوگا۔ کہ جن دنوں میں ترجمہ کر رہا تھا تو ایک روز میرا محترم جمیل اطہر قاضی صاحب، مدیر اعلیٰ روز نامہ جرأت لاہور کے پاس جانا ہوا، تو حسن اتفاق سے باتوں باتوں میں مذکورہ کتاب کے ترجمہ کا ذکر ہوا۔ تو انھوں نے پوچھا، کتاب کا کیا نام رکھا ہے؟ میں نے کہا، مختلف نام زیر غور ہیں لیکن ابھی تک کسی پر دل نہیں ٹھہرتا۔ تو انھوں نے فرمایا اس کا نام ”شاہراہ روحانیت“ مناسب رہے گا۔ مجھے یہ نام بہت پسند آئے۔ اور اس کتاب کا نام شاہراہ روحانیت رکھ دیا۔ میں محترم جمیل اطہر قاضی صاحب کا اس رہنمائی پر دل سے شکر گزار اور ان کی جسمانی و روحانی صحت کے لیے دعا گو ہوں۔

محمد فاروق

از میرٹاون لاہور

0334-0146341

شجر۔ ایک خاموش داعی

تبدیل کرنے کا ہنر سیکھیں تو آپ کے لیے ساری دنیا روحانی فیض کا ذریعہ بن جائے گی

ہر شخص ایک ایسے گھر کو پسند کرتا ہے جو سبز درختوں کے بیچ و بیچ واقع ہو۔ کیونکہ ہریالی ہماری دنیا کو دلکش بناتی ہے۔ یہ یہی وجہ ہے۔ کہ سرسبز کھیتوں میں فارم ہاؤس تعمیر کیے جاتے ہیں۔ تاہم ایسے شخص کا ملنا بہت مشکل ہے جو درختوں کا خاموش پیغام سننے کی صلاحیت رکھتا ہو یا ایک شجر کے طرز عمل کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال سکے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ شجر کاری کا رجحان عام ہے لیکن مثل شجر زندگی گزارنے کا رجحان خال خال ہے۔ اشجار ہمارے گھروں کو تو ضرور خوبصورت بناتے ہیں۔ لیکن وہ گھروں میں رہنے والے افراد کی زندگی کو خوبصورت نہیں بناتے۔

اگرچہ درخت اور انسان ایک ہی دنیا کے مکین ہیں لیکن انسان کی زندگی ذہنی تناؤ، کینہ، نفرت اور تشدد سے متاثر ہے۔ اس کے مقابلے میں درختوں کی زندگی سے یہ منفی اوصاف مکمل طور پر منہا (خارج) ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو انسان بھی ایک چلتے پھرتے درخت کی مانند ہے۔ لیکن یہ درختوں کا طرز عمل اپنانے میں ناکام ہو گیا ہے۔ درخت ہماری دنیا میں مثبت حصہ ڈالتے ہیں۔ اس کے برعکس انسان کے لیے یہ ہی دنیا شکایت، نفرت اور ذہنی دباؤ کا مسکن بن گئی ہے۔ دنیا ایک ہی ہے لیکن درختوں اور انسانوں کے لیے مختلف معنی رکھتی ہے۔ جو دلکشی ہم درختوں میں دیکھتے ہیں وہ ہماری ہی دنیا کی دین ہے یہ کسی بیرونی دنیا سے درآمد نہیں کی گئی ہے۔ پھر سوال یہ ہے کہ

درختوں کے لیے یہ حسن و خوبصورتی کیسے ممکن ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ درختوں نے فطری طور پر اشیاء کو بدل دینے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔ وہ جان گئے ہیں کہ چیزوں کو اپنے فائدے کے لیے کیسے بدلا جاتا ہے۔

درخت کیا کرتے ہیں؟ وہ نمکیات اور پانی زمین سے لیتے ہیں اور ان کو اپنی خوراک میں تبدیل کرتے ہیں۔ مزید درخت ضیائی تالیف (Photosynthesis) کے ذریعہ سورج سے روشنی کی صورت میں توانائی حاصل کرتے ہیں۔ اور اُس کو کیمیائی توانائی میں تبدیل کرتے ہیں۔ جو کہ ان کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے میں استعمال ہوتی ہے۔ یہ تبدیلی کے ہنر کا ثمر ہے۔ کہ ہر درخت انسان کو ایک خاموش پیغام دیتا ہے۔ کہ وہ اشیاء کو بدل دینے کا ہنر سیکھے نتیجتاً ساری دنیا تمہارے لیے روحانی فیض رسانی کا ذریعہ بن جائے گی۔ اس لیے ساری دنیا کو اپنی شخصیت کی تعمیر کے لیے ایک عالمگیر ذریعہ بنائے۔ اس طرح آپ اس دنیا میں بے شکایت بن کر رہنے کے قابل ہو جائیں گے۔

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص ایسی بات کرتا ہے۔ جو کہ آپ کے خیالات کے برعکس ہے۔ تو آپ پریشان نہ ہوں بلکہ اُس شخص سے تبادلہ خیال کریں۔ اُس کو سمجھنے کی کوشش کریں اگر کوئی آپ کو ایسی ناگوار بات کہتا ہے۔ جو آپ کے مزاج پر گراں گزرتی ہے۔ تو آپ اس ناگوار بات کو خود دریافتی کا ذریعہ بنا لیں۔ اگر آپ کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ تو آپ اس سے یہ سبق لیں کہ آپ کو اپنے اندر ایسی خوبی کو مزید بڑھانے کی ضرورت ہے جس کی کمی کی وجہ سے آپ کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا گیا۔ اگر کوئی آپ کو اشتعال دلاتا ہے۔ تو آپ ایک طرفہ اعراض کی حکمت عملی اپنا کر اس کی تدبیر کو ناکارہ کر دیں۔ اگر کوئی آپ کو غصہ دلاتا ہے۔۔۔ آپ کو چاہیے کہ اس کو معاف کرتے ہوئے۔ پرسکون رہیں اگر کسی کا نکتہ نظر آپ سے مختلف ہے آپ اُس سے باہمی گفت و شنید کریں۔ اس طرح اپنی دانشوارانہ صلاحیت کو فروغ دیں۔

ایک کہانی ہے۔ کہ ایک دفعہ کسی نے رام کو پتھر مارا۔ اس کے بدلے میں رام نے اس شخص گلے لگا لیا۔ اس طرح رام نے پتھر پھینکنے کے عمل کو ایک مثبت صفت راسخ کرنے کا ذریعہ بنا لیا جو کہ انسانیت سے محبت ہے۔

یہ کہانی ہمیں سبق سیکھاتی ہے کہ درختوں کا طرز عمل اپنی زندگی میں کیسے اپنایا جائے۔ مثلاً اگر آپ درخت کو پتھر مارتے ہیں وہ اس کے جواب میں وہ آپ کو پھل دے گا۔ یہ مثبت طرز عمل ایک اعلیٰ ترین قسم ہے۔ یہ ہی اعلیٰ اخلاقی طرز عمل اپنا کر آپ ساری دنیا کو اپنا ہم نوا بنا سکتے ہیں۔ جیسے کہ درخت کرتے ہیں

یہاں ہر کوئی آزاد ہے اور یہ آزاد طرز عمل دنیا میں تضاد و اختلاف کا باعث ہیں۔ یہ ہی تضاد و اختلاف دوسروں کے بارے میں منفی سوچ کا باعث بنتے ہیں۔ تو پھر اس طرح کی صورت حال میں رہنے کا کیا ہنر ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ زندگی میں پیش آنے والے ہر اختلاف کو کسی نہ کسی طرح ایسی مثبت عمل میں تبدیل کر دیں جو آپ کے لیے مفید ہو۔



گلشنِ روحانیت

کارخانہ فطرت صرف ایک خوبصورت دنیا ہی نہیں
بلکہ یہ حیرت انگیز طور پر گلشنِ روحانیت بھی ہے

کبھی آپ ایسی خوبصورت جگہ کی سیر کریں جہاں بلند و بالا پر بت، بل کھاتے دریا، ہرے بھرے لائے اشجار، فضا میں اڑتے پرندے، آسمان پر تیرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے سفید بادلوں کے ٹکڑے اور چمکتا سورج موجود ہو۔ ایسے حسین مقام پر بے ساختہ آپ پکاراٹھیں گے کہ یہ کتنے حسین مظاہرے فطرت ہیں! غور کریں یہ خوبصورت مظاہرے فطرت محض ایک حیرت انگیز عجوبے ہی نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ناقابل یقین حد تک روحانیت بھرا گلستان ہے۔ نظر غائر سے دیکھیں تو آپ کو کائنات کی ہر چیز روحانیت کا احساس و ذوق دیتی ہے۔ مثال کے طور پر جب آپ شہد کی مکھی کو پھولوں کے اوپر منڈلاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ تو اچانک آپ کو احساس ہوتا ہے کہ جس طرح پھول کے ہر حصہ میں رس (Nectar) موجود ہوتا ہے۔ اس طرح کارخانہ فطرت کے بھی ہر حصہ میں بھی روحانیت کا رس موجود ہے۔ جب آپ یہ رس لیں گے۔ تو

ایک خود کار عمل کے تحت آپ کی ذات ایک روحانی شخصیت میں تبدیل ہونا شروع ہو جائے گی۔
روحانیت کے حوالے یہ بات بالکل عیاں ہونی چاہیے کہ کہ روحانیت کسی پر اسرار
کیفیت یا بخوددی کا نام نہیں ہے۔ کیونکہ بخوددی تو ایک نیم بیہوشی کا عالم ہوتا ہے۔ یا ہم کہہ سکتے
ہیں کہ یہ ایک غنودگی جیسی کیفیت ہے جس میں ذہن واضح طور پر غور و فکر نہیں کر سکتا ہے۔ جب کہ
روحانیت اس سے بالکل مختلف حالت ہے۔ اس کو ہم دانش و آگہی کی اعلیٰ سطح کہا سکتے ہیں۔
دوسرے الفاظ میں روحانیت شعور و عقل کا بیدار ہونا ہے۔ یہ دماغ کی نیم خواب آوار کیفیت کے
مقابلے میں عقل و دانش اور شعور و ہوش مندی کی بہترین حالت ہے۔

سائنسی دور سے پہلے دل کو مرکز روحانیت سمجھا جاتا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ روحانیت کو
مراقبہ سے وابستہ کیا جاتا تھا۔ یہ دل کی اساس پر مبنی روحانیت تھی۔ جب کہ سطحی سانچوں کو
یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دل سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ لہذا وہ روحانیت بھی سوچنے
سمجھنے سے عاری تھی نتیجتاً گذشتہ روحانیت انسان میں صالح اور با اصول (Discipline) زندگی
مرتب نہ کر سکی۔ اس لیے یہ فرسودہ مفروضات کے مقابل کمزور ثابت ہوئی۔

اب ہم سائنس کے دور میں رہتے ہیں۔ اب یہ ممکن ہے کہ ہم روحانیت کو عقل و شعور کی
اساس پر نشوونما دیں۔ کیونکہ روحانیت بھی دوسرے سائنسی علوم کی طرح ایک سائنسی علم ہے۔ اس
لیے روحانیت کو غور و فکر سے عاری مراقبہ کے ساتھ منسلک نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ روحانیت کو تدبیر و
تفکر کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیے۔ چونکہ طبعیاتی سائنس فطرت کے مختلف پہلوؤں کا مقداری لحاظ
سے کھوج لگاتی ہے۔ اس لیے یہ جو کچھ دریافت کرتی ہے وہ لازمی طور پر مادیت سے وابستہ ہوتا
ہے۔ اس کے برعکس روحانی سائنس کا دائرہ کار فطرت کے معیاری اور اعلیٰ اخلاقی پہلوؤں پر غور و
فکر ہے۔ مزید یہ سائنس مظاہر فطرت سے بالکل ویسے ہی روحانیت کشید کرتی ہے جیسے شہد کی مکھی
پھول سے رس کشید کرتی ہے۔ آج روحانیت کے اس پہلو کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہے۔

شہد کی مکھیوں کے لیے پھول بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں ایک شہد کی مکھی کے لیے
ساری دنیا پھولوں کی دنیا ہے۔ یہ اپنا وقت دوسری چیزوں میں ضائع نہیں کرتی ہے۔ یہ اپنی پوری
توجہ پھولوں پر مرکوز کرتی ہے۔ اور ان سے شہد حاصل کر کے اپنے چھتے میں واپس آ جاتی ہے۔ یہ

ہی لائحہ عمل ایک باشعور شخص کے لیے بھی ہے۔ اُس کے لیے بھی ساری دنیا ایک روحانی دنیا ہے۔ وہ ہر چیز سے روحانیت کشید کرتا رہتا ہے۔ اس طرح باشعور شخص اپنی روحانیت کو وسعت و فروغ دیتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ یک قومی ہیكل روحانی شخصیت بن جاتا ہے۔

روحانی سائنس ایک شخص کی فہم و فراست کو ترقی دے کر اُسے اس قابل کرتی ہے کہ وہ معاملات کا تجزیہ یا مقصد طریقہ سے کرے۔ روحانیت اُس کو پیچیدہ معاملات میں صحیح فیصلہ کرنے میں مدد کرتی ہے۔ اس کی معاونت سے ایک فرد معاملات زندگی کو اس زاویہ سے دیکھتا ہے کہ تمام فکر و نظر کے الجھاؤ زائل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ایک شخص پوری یکسوئی (Clarity) سے غور و فکر کر سکتا ہے۔ دل کے اساس پر مبنی روحانیت ماسوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ وہ ایک خود فریبی ہے۔ جبکہ عقل دانش کے اساس پر مبنی روحانیت شعور و آگہی کی اعلیٰ شکل ہے۔

جیسے نظام شمسی کی سائنس نے بتدریج ترقی کی ہے اسی طرح روحانی سائنس نے بھی اپنے ارتقائی مراحل طے کیے ہیں۔

ازمنہ قدیم میں انسان زمین مرکزی نظریہ پر یقین رکھتا تھا۔ نتیجتاً سائنس کے میدان میں اس کی پیش رفت نہ ہونے کے برابر تھی تاہم دور جدید میں انسانی فکر میں تبدیلی آگئی ہے۔ اب زمین مرکزی نظریہ کی جگہ سورج مرکزی نظریہ تشکیل پا گیا ہے۔ جس کی بنیاد پر نظام شمسی منظم ہوا ہے۔ اسی طرح روحانیت کے لحاظ سے بھی غور و فکر میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ ماضی میں روحانیت با اصول اور صالح زندگی مرتب کرنے میں کارگر نہ ہو سکی کیوں کہ سائنس سے پہلے دور میں لوگ عقل و فہم کے بجائے دل کی اساس پر مبنی روحانیت کے قائل تھے آج عقل و خرد (Science) کا دور ہے اب روحانیت عقل و شعور سے وابستہ ہے اس روحانیت میں پرامن اور با اصول طرز زندگی مرتب کرنے کے لامتناہی مواقع موجود ہیں۔ اور ہماری دنیا ایک ایسے گلستان کی مانند ہے جس میں ہر طرح کی اعلیٰ سے اعلیٰ اشیاء موجود ہیں ایسے میں روحانیت ہی فرد واحد کو یہ صلاحیت دیتی ہے کہ وہ صالح زندگی گزار کر اس گلستان سے مستفید ہو۔



عملی روحانیت

روحانیت ایک باطنی خوبی ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ یہ خارجی افعال میں وقوع پذیر ہو تو ہمیں روحانیت کو عملی شکل دینا پڑے گی

ایک شخص اپنا مال و متاع گھر یا حتیٰ کہ اپنی پسندیدہ کار فراری بیچ کر تنہا ایک جنگل میں جا بسا۔ اُس کی نقل مکانی کا مقصد وحید فقط یہ تھا کہ وہ مظاہر فطرت، مثلاً ہرے بھرے درختوں، کھلتے پھولوں، چچھماتے پرندوں، کے درمیان رہ کر روحانیت سے سرشار ہو۔ شاید وہ اپنے مقصد حیات سے بہر مند ہو گیا ہو۔ تاہم اس کی یہ روحانیت صرف اپنی ذاتی اطمینان تک تھی اپنی فیض رسانی میں عام نہ تھی۔ کیونکہ یہ روحانیت عملی روحانیت نہ تھی۔ جس سے دیگر افراد اُس شخص کے مثبت فکر و نظر (Personal Spiritual experinece) سے فائدہ حاصل کر سکتے۔ ایسے دو روحانی اشخاص کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے ایک وہ شخص جو معاشرے میں رہتا ہے۔

اور اپنے صالح اعمال (Supertual experince) سے اپنے ساتھ رہنے والے افراد کو آسائیاں فراہم کرتا ہے۔ دوسرا وہ شخص جو گوشہ عزلت کو اپنا مسکن بناتا ہے۔ پھر زندگی گزار کر دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔۔ کسی کے دکھ درد میں شریک نہیں ہوتا۔

روحانیت ایک ایسی صفت ہے جو ہر قسم کے تعمیری کاموں کو فروغ دیتی ہے۔ اور انسان کو مثبت زاویہ نظر دیتی ہے۔ ہر معاشرے اور قوم کو ایسے ہی روحانی افراد کی ضرورت ہوتی ہے جو مثبت سوچ اور تعمیری ذہن کے حامل ہوں۔ دوسری طرف جو شخص تارک الدنیا ہو کر تنہا جنگل میں چین (Peace) اور سکون سے رہے گا وہ تو اپنی قیمتی روحانی استعداد کو ضائع کر دے گا۔ لوگوں سے تعلق ہو کر گوشہ نشینی اختیار کرنا روحانیت سے استفادہ نہ کرنے کے مترادف ہے۔ یہ ظاہری طور پر روحانیت ہے لیکن اس کی رسائی بہت معمولی ہے۔ حقیقت میں جب بھی مثالی معاشرہ تشکیل دیا جاتا ہے تو صالح افراد (Spiritual person) کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک روحانی معاشرہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ امن پسند اور بے ضرر افراد کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اور یہ

ہی روحانیت کی اصل ہے جو انسان کو نیک انسان میں بدل دیتی ہے۔ ہمیں مہذب معاشرہ کے قیام و بقا کے لیے ماہر دانشور افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ماہرین کے بغیر ممکن نہیں کہ ہم ایک باضابطہ مہذب معاشرہ قائم کر سکیں۔ جیسے ماہر دانشور مہذب معاشرے کی ضرورت ہوتے ہیں بالکل ویسے ہی روحانی افراد بھی سماج کی ضرورت ہوتے ہیں۔ کیونکہ روحانیت ایک شخص کو کردار، ایمانداری، فرض شناسی اور ذہنی مستعدی کے حوالے سے ایک صالح اور پختہ فکر بناتی ہے۔ اس لیے روحانی شخص بہترین راہنمائی فراہم کر سکتا ہے۔ اور معاشرے کی گاڑی کو صحیح خطوط پر چلا سکتا ہے۔ یہی روحانیت ہے جس کو ہم نے عملی روحانیت کا نام دیا ہے۔

بادی النظر (Basic Sense) میں روحانیت ایک انسان کا ذاتی اثاثہ ہے۔ لیکن وسیع تر مفہوم میں اس کے کئی پہلو ہیں۔ جہاں خالی روحانیت ایک انفرادی معاملہ ہے وہاں عملی روحانیت روحانیت کی ایک عالمگیر صورت ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ کسی شخص کی عملی روحانیت سے صرف دوسرے افراد ہی مستفید نہیں ہوتے بلکہ خود روحانی شخص بھی اس سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔ مثلاً جب ایک روحانی شخص (Spiritual Person) دوسروں کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتا ہے۔ تو درحقیقت یہ اپنی مثبت فکر (Spirituality) کو مزید توانا کرتا ہے۔ جیسے کہ یہ بات معلوم ہے کہ معاشرے میں رہتے ہوئے تجربات حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ تجربات کسی بھی شخص کی روحانیت میں دانائی کا اضافہ کرتے ہیں۔ دانائی کے بغیر روحانیت ادھوری ہے۔ دانائی اور روحانیت مل کر ایک بہترین انسان کو وجود میں لاتے ہیں۔ روحانیت اور دانائی جملہ صالح عمل ہیں۔ اگر روحانیت سے دانائی نکال دیں تو روحانیت خواب و خیال کے سوا کچھ نہیں ہے۔

روحانیت ایک باطنی خوبی ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ یہ خارجی افعال میں وقوع پذیر ہو تو روحانیت کو عملی شکل دینا پڑے گی۔ عملی روحانیت سے مراد ہے کہ معاشرے میں مثبت فکر اور تعمیری سوچ (Spirituality) کو فروغ دینے والا بن کر رہنا ہے۔ مثال کے طور پر جیسے ایک گائے دودھ دیتی ہے جو کہ جسمانی صحت کے لیے مفید ہے۔ اس طرح وہ شخص جو روحانیت کو عملی

شکل دیتا ہے، وہ معاشرے کی صحت مندانہ فکر و نظر کے لیے مفید ہے۔
 عملی روحانیت کیا ہے؟ اگر آپ دوسروں کے خیر خواہ بن کر جینے کی اہمیت کو جان لیں،
 اور فیصلہ کر لیں دنیا میں بطور انسانیت کا خیر خواہ بن کر زندہ رہنا ہے۔ تو پھر آپ روحانی شخص ہیں
 اور باعمل روحانیت کی راہ پر گامزن ہیں۔ مثلاً اگر آپ کو اپنے ہمسائیوں کی طرف سے برے
 سلوک کو سامنا ہے۔ مگر آپ رد عمل کا طریقہ اختیار نہیں کرتے اور اپنے مزاج میں اعتدال رکھتے
 ہوئے ہمسائیوں سے مسکرا کر ملتے ہیں۔ تو یہ عملی روحانیت کی شکل ہے۔ روحانیت اعلیٰ اخلاقیات
 پر مبنی ہوتی ہے۔ اور عملی روحانیت سے مراد معاشرے میں دیگر افراد کے ساتھ معاملات کرتے ان
 اعلیٰ اخلاقیات پر قائم رہنا ہے۔ پہلی نظر میں باعمل روحانیت کچھ عطا کرنے کا نام ہے۔ لیکن یہ
 حقیقت بھی مسلم ہے کہ ہر عطا کنندہ وصول کنندہ بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ قدرت کا قانون ہے۔
 دینے والا محض دینے والا نہیں ہوتا بلکہ وہ لینے والا بھی ہوتا ہے۔ اور جن لوگوں کے ساتھ اُس نے
 نیکی کی ہوتی ہے۔ ان کی طرف سے عطا کنندہ تحسین و تعریف، اچھا نام، اچھے تعلقات حاصل کرتا
 ہے۔



روحانیت کا مطلوب۔۔۔ تربیت یافتہ ذہن

لوگ نشانیاں دیکھتے ہیں، لیکن بغیر مشاہدہ کیے پاس سے گزر جاتے ہیں۔ تاہم وہ شخص جو تربیت
 یافتہ ذہن رکھتا ہے۔ وہ ان نشانیوں کو پہچان لیتا ہے۔ اور ان پر غور و فکر کرتا ہے۔

سی وی رامن (1888-1970)، مشہور بھارتی سائنسدان سے کسی نے کہا کہ سائنسی
 دریافتیں حادثاتی طور پر واقع ہوئیں ہیں۔ رامن نے جواب دیا: ”جی ہاں، لیکن یہ حادثات تب
 واقع ہوتے ہیں جب ذہن تربیت یافتہ ہوں۔“ یہ حقیقت ہے کہ سائنسی دریافتوں کے تمام
 امکانات پہلے ہی سے کارخانہ فطرت میں موجود ہیں۔ لوگ اُن کے پاس سے بے خبر گزر جاتے

ہیں اور ان کو دریافت کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ جبکہ ایک تربیت یافتہ سائنسدان فوراً ان امکانات کو پہچان لیتا ہے اور سائنسی ضرورت کے مطابق اس معاملے پر غور و فکر کرتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اچانک فطرت کے کسی قانون کو دریافت کر لیتا ہے۔ اس طرح سائنسی دریافت تکمیل کو پہنچتی ہے۔ یہی طریقہ روحانیت میں بھی کارآمد ہے۔ روحانیت کی نشانیاں پوری دنیا میں منتشر ہیں۔ حقیقت میں فطرت کے ہر حصہ میں چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا روحانی نشانیاں موجود ہیں۔ لوگ انہیں دیکھتے ہیں لیکن بغیر مشاہدہ کیے پاس سے گزر جاتے ہیں۔ صرف وہ شخص جو تربیت یافتہ ذہن رکھتا ہے۔ وہ اس قابل ہوتا ہے۔ کہ وہ ان نشانیاں کو پہچان لے۔ اور ان کو غور و فکر کا محور و مرکز بنا لے۔ دریافت اور غور و فکر کا خوبصورت امتزاج ہی روحانیت کو نشوونما دیتا ہے۔

موتی رام اور رام رتن کا پیلا دود دوست تھے اول الذکر جو ہری تھا موخر الذکر ایک اے سی انجینئر تھا۔ ان دونوں کی عادت تھی کہ وہ صبح کی سیر دہلی کے ایک سنسان علاقہ میں کیا کرتے تھے ایک دفعہ انہیں راستے میں ایک چمکتی ہوئی چیز ملی۔ رام رتن کا پیلا نے اس کو اٹھا لیا اور اسے کانچ کا ٹکڑا سمجھا۔ جبکہ موتی رام نے فوراً اس کو پہچان لیا کہ یہ تو ہیرا ہے۔ اس کا دوست اگرچہ ایک سند یافتہ ایرکنڈیشنگ انجینئر تھا۔ مگر وہ ہیرے کو پہچاننے میں مکمل طور پر ناکام ہو گیا۔ موتی رام جو ایک جوہری تھا ایک لمحے میں ہیرے کو پہچان گیا۔ کیونکہ جوہرات کے حوالے سے وہ ایک تربیت یافتہ ذہن رکھتا تھا۔

یہ واقعہ ذہنی تربیت کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ جو شخص بھی روحانیت سے معمور زندگی گزارنا چاہتا ہے وہ لازماً اس پہلو سے اپنی تربیت کا اہتمام کرے۔ جو شخص اپنی تربیت سے غفلت کرتا ہے وہ کبھی اس قابل نہیں ہوگا کہ وہ زندگی کے تجربات سے روحانی خوراک حاصل کر سکے۔ حتیٰ کہ اکثر روحانیت کے وسط میں رہنے کے باوجود، وہ مسلسل روحانی افلاس کا شکار رہے گا۔

ذہنی تربیت کیا ہے؟ یہ ایک خود تربیتی عمل ہے۔ چونکہ روحانیت کو خارجی عوامل سے حاصل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے صرف وہ لوگ جو اپنی تربیت میں منہمک رہتے ہیں وہ روحانیت سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں۔ جو شخص اپنی تربیت سے پہلو تہی کرتا ہے۔ وہ بطور ایک روحانی شخص کبھی بھی اپنی شخصیت کی تعمیر نہیں کر سکتے۔

خود تربیتی عمل کی کئی صورتیں ہیں۔ مثال کے طور پر کسی بھی پیش آمدہ واقعہ میں یہ پہچاننے کی صلاحیت کون سا پہلو مناسب ہے اور کون سا نامناسب ہے۔ تاکہ ایک بہتر لائحہ عمل مرتب کیا جائے۔ اسی طرح اس بات کا مکمل شعور ہونا چاہیے کہ کیا چیز اہم، اور کیا غیر اہم ہے۔ کیونکہ اس خوبی کے بغیر انسان روحانیت کے تجربے سے نہیں گزر سکتا۔

انتہائی اہم چیز جو ایک شخص کو خود تربیتی روحانی عمل کے دوران کرنی چاہیے۔ وہ تشدد، جارحیت اور غصہ (Offence) سے اعراض کرنا ہے۔ جس لمحہ اُس نے اپنے آپ کو پر تشدد (Offence) رویے کے حوالے کر دیا، اسی لمحے اس نے روحانیت کا دروازہ بند کر دیا۔ مزید سیکھنے کا عمل ہمیشہ معاشرے کے اندر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ معاشرتی تعلقات میں انسان اپنے مافی الضمیر کا اظہار اپنے دماغ سے کرتا ہے۔ نہ کہ دوسروں کے دماغ سے۔ اس لیے معاشرتی تعلقات میں یہ ضروری ہے کہ ایک فرد کو سونی صدمہ یا مقصد گفتگو کرنی چاہیے۔ کیونکہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ جہاں مقصدیت معدوم ہوگی وہاں جارحیت (Offence) موجود ہوگی اور جو شخص جھجھلاہٹ اور غصہ کا شکار ہوتا ہے درحقیقت وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ مقصد سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہے۔

ہمیشہ آپ کے سامنے سوچ بچار کے دو راستے کھلے ہوتے ہیں۔ ایک حقیقت پسندانہ (Spiritual) اور دوسرا غیر حقیقت پسندانہ (Subjective)۔ اگر آپ روحانیت کے خواہاں ہیں تو غیر حقیقت پسند سوچ بچار سے اجتناب کریں۔ اگر آپ جذباتی اور ہیجان انگیز طرز فکر (Subjective) کو ترک کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ تو پھر روحانیت ہمیشہ آپ کی رسائی سے باہر ہوگی۔

خیال رہے کہ روحانیت جسمانی ورزش سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ جسمانی کسرت (ورزش) اور روحانیت کا آپس میں دور دور کا تعلق نہیں ہے۔ موخر الذکر کا تعلق ذہن کے مثبت طرز فکر سے ہے۔ اس لیے متوازن ذہنی سطح پر ہی روحانیت برک و بار لاسکتی ہے۔ لہذا جو بھی شخص روحانیت کا آرزو مند ہے اُسے اپنے دماغ کو اس مقصد کے مطابق تربیت دینی چاہیے۔ ورنہ روحانیت خواب و خیال کی بات رہے گی۔



روحانیت کا اثر

مثبت رویے کی طاقت منفی رویوں کو سرنگوں (Trump over) کر سکتی ہے۔

کچھ لوگ پیدائشی طور پر غیر معمولی اوصاف کے حامل ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ ہر قسم کے حالات سے نمٹ لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ جب بھی محفل میں آتے ہیں تو لوگوں کے دل و دماغ کو اپنی مٹھی میں لے لیتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ آئے، انھوں نے دیکھا، اور فتح کر لیا۔

تاہم جیتنے کی اس قابلیت پر صرف غیر معمولی افراد کی اجارہ داری (Monopoly) نہیں ہے۔ بلکہ کوئی بھی عام آدمی لوگوں کے دل و دماغ کو جیت سکتا ہے بشرطیکہ وہ قدرت کے قانون روحانیت کی طاقت سے واقف اور اس کو استعمال کرنا جانتا ہو۔ اللہ کے تخلیقی منصوبے کے مطابق تمام زن و مرد مختلف خوبیاں رکھتے ہیں۔ ایک انا اور دوسرا ضمیر ہے۔ انا تکبر کی، جبکہ ضمیر انکساری کی علامت ہے۔

مثال کے طور پر اگر زید و بکر نامی دو افراد کے درمیان کوئی تنازع کھڑا ہو جاتا ہے، اور زید کڑوی کسلی باتیں کر کے بکر کی عزت نفس کو مجروح کرتا ہے۔ نتیجتاً زید کی بد اخلاقی بکر کے لیے اشتعال کا باعث بنے گی۔ پھر رد عمل کے طور پر بکر زید سے بدلہ لینے کی کوشش کرے گا۔ ایک ماہر نفسیات نے اسی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے: ”جب کوئی شخص کسی دوسرے فرد کو زچ کرتا ہے، تو زچ ہونے والے فرد کی انا مزید شدت اختیار کر جاتی ہے۔ اور نتیجہ پریشان کن

حالات کی صورت میں نکلتا ہے۔“

مندرجہ بالا صورت حال میں زید نے بکر کو لاکارا۔ جس کی وجہ سے بکر کی شخصیت بکرنہ رہی، بلکہ مجسم انا اور رعونت میں تبدیل ہوگی۔ یقینی طور پر یہ جارحانہ رویہ زید کے خلاف جائے گا۔ اور زید بکر پر اپنی بالادستی قائم کرنے میں ناکام ہوگا۔ اب اسی معاملے کو ایک دوسرے پہلو سے دیکھتے ہیں۔ فرض کریں زید و بکر کے درمیان کسی بات پر کشیدگی ہے۔ جس کے دوران زید عاجزی و انکساری سے وابستہ رہتے ہوئے بکر کو غصہ دلانے سے اجتناب کرتا ہے اور ایک طرفہ مصالحت کے راستہ پر گامزن رہتا ہے۔ زید کا یہ رویہ بکر کے ضمیر کو متوجہ کرے گا۔ اور وہ خود بینی (Introspection) کے عمل سے گزرے گا۔ اور وہ سارے تنازع پر از سرے نو غور کرے گا۔ بلاخر وہ اپنے رویہ پر پچھتائے گا جو کہ دونوں کے درمیان تناؤ کا باعث بنا۔ پہلے اس کے خیال میں زید اس کا حریف تھا اب اس کو معلوم ہوگا کہ وہ تو میرا دوست ہے۔

زید کا اچھا برتاؤ سارے پس منظر کو تبدیل کر دے گا اور مختلف صورت حال ظاہر ہوگی۔ یہ ثابت ہو جائے گا کہ جب کسی کی اخلاقی حس (Conscience) کو ابھارا جاتا ہے تو اس کا ضمیر زیادہ طاقتور ہو جاتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ امن کی صورت میں نکلتا ہے۔

یہ دوسرا طریقہ ہر شخص کی پہنچ میں ہے۔ اور ہر کوئی بڑی آسانی سے اس کو استعمال کر سکتا ہے۔ کوئی بھی معمولی قابلیت رکھنے والا شخص جب کسی کے ضمیر کو آواز دیتا ہے۔ تو درحقیقت وہ اپنے حریف کو اس کے اپنے خلاف لڑنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اور یہ بات سچ ہے کہ ایک شخص دوسروں کے خلاف تو لڑ سکتا ہے لیکن کسی شخص میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ اپنے خلاف لڑے۔ ایک منکسر شخص (Modest Person) کی کامرانی اسی راستے میں ہے۔

کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ موخر الذکر طریقہ پر خطر ہے اس میں یہ بھی امکان ہے کہ منکسر طرز عمل دوسرے شخص کو مزید متکبر بنا دے گا۔ اور وہ رد عمل میں مزید جارحیت کا مظاہرہ کرے اور پہلے کی نسبت زیادہ خطرناک ہو جائے۔ تاہم یہ نقطہ نظر مکمل طور پر بے بنیاد ہے۔ کیونکہ یہ زاویہ نگاہ فطرت کی طاقت یا مزید بہتر الفاظ میں روحانیت کی طاقت سے بے خبری کی وجہ سے ہے۔

قدرت کے قانون کے مطابق اگر آپ کسی کی انا کو لگا کرتے ہیں۔ تو آپ کی کامیابی کے امکانات مبہم ہوتے ہیں۔ لیکن جب آپ کسی کے ضمیر پر دستک دیتے ہیں۔ تب آپ کی کامیابی یقینی ہے۔

عام طور پر لوگ صرف لڑنے کی طاقت کو جانتے ہیں لیکن ایک عقل مند شخص آپ کو بتائے گا۔ کہ ضمیر کی طاقت، انا کی طاقت سے زیادہ مؤثر ہے۔ تنازع کے وقت، اگر آپ لڑنے کا انتخاب کرتے ہیں، تو آپ کو ہتھیار کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن جب آپ روحانی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ تو آپ کو فریق مخالف پر فتح حاصل کرنے کے لیے ہتھیار کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ مثبت رویے منفی رویوں کو سرنگوں کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ جبکہ منفی رویے کسی بھی چیز کو فتح کرنے میں فعال نہیں ہو سکتے۔ یہ صرف تباہی کی طرف لے جاسکتے ہیں۔



اللہ سے محبت کا مفہوم

اللہ سے محبت صرف فلسفیانہ معاملہ نہیں ہے

یہ جذبہ تو انسانی فطرت میں گہرائی سے پیوست ہے

محبت سے مراد گہرا تعلق ہے۔ یہ ایک قدرتی چیز ہے اور اُس شخص کے لیے بہترین مثبت تاثر ہے جیسے آپ قابل محبت سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ ہر کوئی جانتا ہے کہ محبت خلا میں تخلیق نہیں کی جاسکتی، اس کو الفت (Affection) کی مضبوط اساس درکار ہوتی ہے۔ اسی طرح محبت الہی کی بنیاد بھی یہی ہے۔ اس کو بھی گہری الفت کی اساس درکار ہوتی ہے۔ کیونکہ جب کوئی شخص یہ دریافت کر لیتا ہے کہ اللہ نے اُس کو نہ صرف تخلیق کیا ہے۔ بلکہ اُسے زندگی کو رواں دواں رکھنے والا نظام مثلاً یہ ہرے بھرے درخت، شفاف پانی، تازہ ہوا اور رہنے کے لیے زمین بھی دی ہے۔ وہ جان جاتا ہے کہ ان اشیاء کو تخلیق کرنا اُس کے بس میں نہ تھا۔ یہ قیمتی تحائف تو اللہ کی دین ہیں۔ اس حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے بعد اُس کو اللہ سے پیارا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی دریافت کا ما حاصل (Out come) اللہ کی محبت بن کر ظاہر ہوتی ہے۔

ہر غور و فکر کرنے والے شخص کی زندگی میں ایک مقام آتا ہے۔ جب وہ چند بنیادی سوالات سے دوچار ہوتا ہے۔ مثلاً کبھی دل میں خیال گزرتا ہے کہ وہ کیسے وجود میں آیا؟۔ کبھی وہ سوچتا ہے یہ دنیا میری ضروریات کے ساتھ کمال درجے کی مطابقت کیسے رکھتی ہے؟۔ انسانی ضروریات اور باقی دنیا میں ایسی کمال درجے کی مطابقت ہے کہ یہاں ایک طرف عام سا شخص بھی یہ جانتا ہے کہ انسان اور باقی دنیا کے درمیان بے مثال ہم آہنگی ہے۔ دوسری طرف سائنس بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔ کہ یہ کائنات انسانی تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق بنی ہے۔ محبت اسی حقیقت کا اعتراف (Acknowledgment) ہے۔ جب ہم اپنے اللہ کے احسانات کا شکر ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو ہم اس عمل کو خدا کی محبت کہتے ہیں۔

اگرچہ محبت ایک باطنی (Inner) احساس ہے۔ تاہم یہ قدرتی طور پر انسان کے خارجی افعال (External experssion) میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ انسان ایک معاشرتی جانور ہے، لہذا قدرتی طور پر انسان کی باطنی اُنس و محبت سماجی تعلقات میں ظاہر ہونا چاہیے۔ اس باطنی کیفیات کے معاشرتی اظہار کو امن کہا جاتا ہے۔ اللہ کے حوالے سے محبت ایک خالق کا شعوری طور شکر ادا کرنا ہے۔ اور معاشرے کے لحاظ سے محبت پر امن طور سے ارکان سماج کے ساتھ رہنا ہے۔

یہاں یہ سوال مناسب نہ ہوگا اگر ہم کہیں کہ ہم کیسے اپنی محبت کا اظہار اللہ کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ جب کہ ہم اُس کو دیکھ ہی نہیں سکتے۔ یہ بحث جوہری (Nuclear) سائنس کے دور سے پہلے ہوتی تو شاید معتبر ہوتی۔ جوہری سائنس کے ظہور میں آنے کے بعد یہ بحث مکمل طور پر بے بنیاد ہو چکی ہے۔ جوہری سائنس نے بڑے وثوق کے ساتھ ثابت کر دیا ہے۔ کہ اس دنیا میں کوئی بھی چیز قابل مشاہدہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ہر کوئی اپنے ماں سے محبت کرتا ہے۔ لیکن سائنس کے مطابق، کوئی بھی اس قابل نہیں کہ اپنی ماں کو دیکھ سکے۔ کسی شخص کی ماں اور اس طرح دوسری بے شمار اشیاء غیر مرئی (invisible) الیکٹرونز کے مجموعہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ حقیقت میں ماں داخلی طور پر ناقابل مشاہدہ وجود ہے۔ جس کو ہم بیرونی جسم کے حوالہ سے دیکھ سکتے ہیں۔ بالکل اسی طرح اللہ کی ذات ناقابل مشاہدہ ہے۔ جس کو ہم اس کی تخلیقات کے ذریعہ دیکھ سکتے

ہیں۔ عصر حاضر میں یہ کہنا قطعاً خلاف عقل ہے کہ کوئی یہ کہہ کہ وہ اللہ سے محبت نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اُس کو دیکھ نہیں سکتا۔

خدا سے محبت محض فلسفیانہ معاملہ نہیں ہے۔ یہ جذبہ تو انسانی فطرت میں ازل سے موجود ہے۔ اگر کوئی شخص آپ کو قیمتی تحفہ دیتا ہے۔ تو آپ قدرتی طور پر اس کا شکر یہ ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح اللہ نے آپ کو ان گنت نعمتوں سے نوازا ہے اس لحاظ سے اللہ سے محبت بھی ایک قدرتی امر ہے۔ جو اس کی نعمتوں کا اعتراف ہے۔ مزید فطرت کا قانون ہے کہ اگر آپ ایک چنگلی رنگ کی پانی کے گلاس میں ڈالیں، گلاس کا سارا پانی رنگین ہو جائے گا۔ یہ اصول محبت کے معاملے میں بھی لاگو ہوتا ہے۔ جو شخص خالق کے لیے اپنے دل میں محبت رکھتا ہے اس کے لیے یہ ممکن نہیں کہ دل میں اللہ کی محبت کے ساتھ ساتھ ہمسائے کی نفرت کو رکھے اس برقی دور (Electronic age) میں ساری دنیا ہر شخص کی ہمسایہ ہے۔ لہذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کہ محبت کے دو پہلو ہیں۔ ایک نظریاتی اور دوسرا عملی۔ نظریاتی حوالے سے محبت کا مطلب ہے اللہ کا شکر ادا کرنا۔ اور معاشرتی لحاظ سے محبت کا مطلب پوری انسانیت کے لیے خیر خواہانہ جذبہ رکھنا ہے۔



ربانی دسترخوان

مادی خوراک آپ کو جسمانی صحت دیتی ہے۔ جب کہ روحانی خوراک صحت مندانہ غور و فکر کی صلاحیت کو نشوونما دیتی ہے۔

ایک دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: آدمی صرف غذا پر زندہ نہیں رہ سکتا (متی ۴: ۴)۔ حضرت عیسیٰ کے مذکورہ قول کا مطلب ہے کہ انسان کے لیے صرف اشیا خورد و نوش کافی نہیں ہیں۔ کیونکہ تمام غذائیں ہماری جسمانی تندرستی کا اہتمام کرتی ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ انسان کو روحانی خوراک کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ روحانی خوراک کے بغیر کوئی بھی انسان اپنے کردار و اخلاق کو صالح نہیں بنا سکتا۔

اس دنیا میں ہر چیز کے لیے دو پہلو ہوتے ہیں ایک مادی دوسرا روحانی۔ آپ کے اندر

اتنی سمجھ بوجھ ضرور ہونا چاہیے کہ آپ اپنے چاروں اطراف موجود بے شمار مادی اشیا سے روحانی تسکین حاصل کر سکیں۔ آپ کو اس کے لیے اپنی حس مشاہدہ کو تیز کرنا ہوگا۔ بعد ازاں آپ کے اندر روحانی خوراک ذخیرہ کرنے کی استعداد پیدا ہوگی۔ یقیناً ایک طرف اشیا خورد و نوش آپ کی جسمانی صحت قائم رکھتیں ہیں۔ تو دوسری طرف مادی اشیا (Material Things) کاربانی پہلو آپ کی شخصیت کو روحانی خطوط پر استوار کرتا ہے۔ جس طرح غذائیں آپ کی جسمانی صحت کے لیے مفید ہیں۔ اسی طرح روحانی خوراک صحت مند اندازہ غور و فکر کی صلاحیت کو نشوونما دینے میں مفید ہے۔

مثال کے طور پر پانی پر غور کریں جو کہ دو گیسوں ہائیدروجن اور آکسیجن کا مجموعہ ہے۔ اگرچہ پانی دو مختلف مادی عناصر سے بنا ہے۔ لیکن جب یہ انسانی جسم میں داخل ہوتا ہے تو آسانی سے جذب ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ جسم کو حیات بخش توانائی فراہم کرتا ہے تاکہ وہ اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھ سکے۔ جب آپ پانی اور اپنے جسم کے درمیان اس تعلق کو دریافت کر لیتے ہیں۔ تو درحقیقت آپ اپنے فکر و خیال کے لیے روحانی خوراک کا اہتمام کرتے ہیں۔ اور جب آپ خدا کی عظمت و دانائی کے احساس کے ساتھ پانی غور کرتے ہیں۔ تو آپ یہ دریافت کرتے ہیں کہ اللہ نے پانی کو مختلف عناصر سے اس طرح تخلیق کیا۔ کہ وہ مکمل طور پر آپ کے جسم سے ہم آہنگ ہے۔ اس قسم کی دریافتیں آپ کو بے انتہا تسلی اور اطمینان کا سامان کرتی ہیں جو آپ اپنے ارد گرد بکھیری اشیا اور گزرتے واقعات پر سوچ بچار سے اخذ کرتے ہیں

مادی اشیا سے روحانیت کشید (Extract) کرنے کی مہارت آپ کو روحانی خوراک دے گی جو آپ کو بطور روحانی شخص ترقی دے گا۔ اگر آپ کے روحانی شخص بننے کی دلی خواہش ہے۔ تو آپ کو مادی چیزوں سے روحانی خوراک حاصل کرنے کا ہنر ضرور سیکھنا چاہیے

☆☆

قوتِ حافظہ کے معجزات

جب آپ کسی خیال کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ تو فوراً آپ کا دماغ بطور ایک سوچنے

والی پیچیدہ ترین مشین کے حرکت میں آجاتا ہے۔ اور مطلوبہ خیال کو لاشعور میں ذخیرہ شدہ حقائق و واقعات سے شعور میں لاتا ہے۔ پھر مناسب الفاظ کا چناؤ کرتا ہے، اُن الفاظ کو گرامر کے قواعد کے مطابق ترتیب دیتا ہے۔ پھر آپ کی زبان کو بولنے کے لیے یا آپ کی انگلیوں کو لکھنے کے لیے متحرک کرتا ہے۔۔ اس طریقہ سے دماغ میں اُن گنت باہمی سرگرمیاں ناقابل یقین رفتار سے وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ اور ان سرگرمیوں میں تقریباً تمام انسانی حسیات (Senses) حصہ لیتی ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ آپ کا ذہن بے شمار فکر و خیال کی آماجگاہ ہے۔ لیکن اگر ان میں سے صرف ایک خیال آپ کو انگلش میں بیان کرنا پڑے۔ تو آپ کا دماغ سب سے پہلے انگلش کے اڑھائی لاکھ ذخیرہ الفاظ میں سے مناسب الفاظ کا انتخاب کرے گا۔ پھر انتہائی برق رفتاری سے الفاظ کو ترتیب دے گا۔ بعد ازاں آپ کے اندر با معنی جملہ بولنے یا لکھنے کی استعداد پیدا ہوگی۔ یہ طریقہ ناقابل تصور حد تک پُر پیچ ہے۔ اس عمل کے دوران آپ کے دماغ میں بے شمار معلوم اور نامعلوم افعال (Action) سبک رفتاری سے واقع ہوتے ہیں۔ ان پیچیدہ افعال کی وجہ سے با معنی گفتگو یا تحریر وجود میں آتی ہے۔

یہ سب کچھ کیسے ظہور میں آتا ہے؟ حالیہ تحقیق بتاتی ہے۔ ہمارے دماغ کے خارج از قیاس (Incredible) پیچیدہ نظام کا انحصار ہمارے حافظہ پر ہے۔ ہمارا دماغ قدرت کا حیرت انگیز کرشمہ ہے۔ نیل برنارڈ اے جنٹ (Adjunct) ایسوسی ایٹ پروفیسر آف میڈیسن جارج واشنگٹن یونیورسٹی اسکول آف میڈیسن واشنگٹن ڈی سی بیان کرتے ہیں۔ کہ ایک یادداشت ایک سو ارب عصبی خلیوں کے دو یا دو سے زیادہ باہمی روابط سے تشکیل پاتی ہے۔ یہ عصبہ (Neuron) کہلاتی ہے۔ پھر ان عصبہ کو ٹھوس شکل میں محفوظ کر لیا جاتا ہے تاکہ آپ بوقت ضرورت استعمال کر سکیں۔ مزید بر بیان بیٹچر (Brienne Bettcher) سائیکا لوجی ماہر یونیورسٹی آف کیلی فورنیا سان فرانسکو یادداشت اور بڑھا پا مرکز (Nine Ways to improve Your Memory, Fox News December 18, 2013) بتاتے ہیں کہ آپ کی ذہنی عمر کے ساتھ ساتھ حافظہ کو قوی رکھنے کے لیے آپ کا ذہن

مسلسل نئے عصبی خلیوں کی تشکیل اور نئے روابط کی تعمیر میں مصروف رہتا ہے اس عجوبہ روزگار عمل کو نیروپلا سٹیسی کہا جاتا ہے۔

لوگ ماضی کے بڑا معجزات کا ذکر کرتے ہیں۔ جیسے عصاءِ موسیٰ، حضرت سلمان کی انگوٹھی اور اس طرح اور دیگر معجزات۔ لیکن اس سے بھی بڑا معجزہ جو اللہ نے ہر کسی کو دے رکھا ہے۔ یہ معجزہ دماغ ہے۔ اگر آپ اس ذاتی معجزہ کو پہچان لیں۔ تو آپ اپنے اندر ایک ایسے زبردست تشکر کے جذبات پائیں گے کہ تمام شکایات اور احتجاج مضحکہ خیز اور سطحی لگیں گے۔ پھر آپ اللہ کے لیے دائمی تشکر کے جذبات کے ساتھ زندہ رہیں گے۔



صرف ایک آواز پر

خالق نے انسان کو اس طرح تخلیق کیا ہے کہ خالق و مخلوق کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے

ایک دفعہ میں دونو جوان، بہن اور بھائی، کے پاس تعزیت کے لیے گیا۔ جن کے والد اُن لوگوں کو دہلی کے ایک فلیٹ میں تنہا چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ یہ دونوں بہت افسردہ تھے۔ مہمانوں میں سے ایک رشتہ دار نے کچھ تسلی کے الفاظ کہے۔ اس نے کہا، ”فکر نہ کریں میں آپ سے ایک آواز کے فاصلہ پر ہوں“۔ اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ کہ اللہ تعالیٰ بھی ہر مرد اور عورت سے صرف ایک آواز کے فاصلہ پر ہے

خالق نے انسان کو اس طریقے سے تخلیق کیا ہے کہ خالق و مخلوق کے درمیان فاصلہ نہیں ہے: دونوں ایک دوسرے کے انتہائی قریب ہیں۔ انسان کے لیے ممکن ہے کہ وہ کسی بھی لمحہ، جہاں کہیں بھی ہو، اللہ سے رابطہ کر لے۔ یہ تصور ہر انسان کو مشکل صورت حال میں غیر متزلزل اعتماد (Unshakable trust) اور حوصلہ دیتا ہے۔

مثال کے طور پر جب آپ گھر سے رخصت ہوں اور آپ کی جیب میں موبائل ہو۔ تو آپ کو پورا یقین ہوگا۔ کہ آپ گھر سے دور نہیں ہیں۔ دنیا میں آپ جہاں کہیں بھی ہوں گے فوراً

اپنے ارکانِ خاندان سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ انسان اور اللہ کے رابطے میں بھی یہ بات درست ہے۔

میں اللہ پر پختہ ایمان رکھنا والا انسان ہوں۔ میں کئی مثالیں بیان کر سکتا ہوں جب میں نے اپنے آپ کو بے بسی اور لاچارگی کی حالت میں پایا۔ پھر میں نے اللہ سے دعا کی اُس سے مدد مانگی۔ اور ہمیشہ محسوس کیا کہ اللہ میرے ساتھ ہے۔ اور یقین کیجئے اُس نے نہ صرف میرا مسئلہ حل کر دیا بلکہ صورت حال کو میرے حق میں کر دیا۔

اس عقیدے نے مجھے عزمِ صمیم (Determination) اور پختہ یقین دیا۔ میرے تجربے کے مطابق ہر شخص کو اس پختہ یقین کی ضرورت ہے۔ ہماری روزمرہ کی زندگی میں ہم اکثر ایسی صورت حال کا سامنا کرتے ہیں۔ جہاں ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہم اپنے محدود وسائل میں رہتے ہوئے ان مسائل کو حل نہیں کر سکتے۔ لہذا ہمیں مسائل حل کرنے کے لیے فوق الطبعی طاقت (Supernatural Source) کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ عقیدہ ہمارے فکر و نظر (Mind) کو تقویت دیتا ہے اور عزمِ کویا تازہ بخشتا ہے۔ اور ہماری جہد و جہد کو لامتناہی امید سے وابستہ کر کے ہماری زندگی میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ ہمیں اس قابل بناتا ہے کہ ہم اپنی خوابیدہ صلاحیتوں (Hidden energy) کو بیدار کریں۔

زندگی مسائل کا گھر ہے۔ اکثر ہم اپنے آپ کو ایسی جگہ پاتے جس کی راہوں سے ہم مکمل طور پر ناواقف ہوتے ہیں۔ ان مشکل حالات کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے ہمیں ایک ایسے راہنما کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ مستقبل کے لائحہ عمل کو واضح کر سکے۔ اس صورت حال میں اللہ پر یقین روشنی کے مینار کی طرح راہنمائی کرتا ہے۔ پر پتچ مسائل کی لہروں میں ہم ایک ایسے بحری کپتان کی مانند ہوتے ہیں۔ جو اپنے آپ کو تہائی کی حالت میں پاتا ہے۔ پھر وہ ساحل پر روشنی کا مینارہ دیکھتا ہے۔ یہ روشنی اس کو امید نو دیتی ہے۔ اور وہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ روشنی کا تعاقب کرے گا۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ کامیابی سے اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

واقعی زندگی گہرے اور وسیع سمندر میں سفر کی مانند ہے۔ ہمیں اس بات پر یقین رکھنے کی اشد ضرورت ہے کہ کوئی ساحل پر موجود ہے جو اُس وقت ہماری مدد کر سکتا ہے جب ہم انتہائی

بے بسی کی حالت میں ہوں۔ اللہ کا یہ ہی کردار ہر مرد زن کی زندگی میں ہے۔ ہر شخص کی کامیابی پچاس فیصد جدوجہد اور پچاس فیصد امید پر ہوتی ہے۔ یہ یقین کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے ایک بڑی امید کا ذریعہ ہے۔ انسان اور خدا کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے وہ ہم سے صرف ایک آواز کی دوری پر ہیں۔

میری عمر اکیانوے سال ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ میرے اس سفر حیات میں مشکلات اور رکاوٹیں میری ہم رکاب رہیں ہیں۔ تاہم واحد چیز جس نے مجھے شکست اور مایوسی سے بچایا وہ میرا اللہ پر یقین کامل ہے۔۔



روحانیت بمقابلہ مادیت

یہ صرف روحانیت ہے جو آپ کو مسرت و اطمینان کا احساس دے سکتی ہے۔ مادی دنیا میں اطمینان شاذ و نادر ہی حاصل ہوتا ہے۔ لیکن روحانی دنیا میں اطمینان یقینی قابل حصول ہے۔ پریشانی عدم اطمینان کو ظاہر کرتی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ دماغ میں یہ عدم اطمینان کی کیفیت کیسے اپنی جگہ بناتی ہے؟ اصل میں تمام انسان ہزاروں خواہشیں لے کر اس دنیا میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی بشری کمزوری کی وجہ سے اتنی استطاعت نہیں رکھتے کہ اپنی تمام آرزوؤں کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ یہی وہ بشری کمزوری ہے جو لوگوں کو ذہنی خلفشار (Mental agitation) کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور کرتی ہے۔

کیا ہم اس بشری کمزوری کو انسانی پریشانی کا ذمہ دار ٹھہرا سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ مسائل کی جڑ تو لوگوں کی اپنی ذات سے لاعلمی ہے اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آگہی (Awareness) پر اطمینان زندگی کی کلید (Key) اور لاعلمی (Unawareness) ہر طرح کی بے چینی اور اضطراب کی ذمہ دار ہوتی ہے۔

اس مسئلہ کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے ہمیں خالق کی منصوبہ سازی سے روشناس ہونا پڑے گا۔ اللہ کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، اس زمین پر دنیاوی راحت حاصل کرنے کے وسائل

انتہائی محدود ہیں۔ جب کہ روحانی اطمینان یا عقل و بصیرت کو فروغ دینے کے وسائل اتنے وسیع و کشادہ ہیں کہ صرف لامتناہی ایک ایسا لفظ ہے جو اس کا احاطہ کر سکتا ہے۔

اگر آپ کا مقصد حیات دنیاوی سکون حاصل کرنا ہے۔ تو آپ کو بہت جلد یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ دنیا میں اس کے مواقع بہت کم ہیں۔ دنیاوی راحت کیا ہے بس خوراک، لباس، شہرت، ازدواجی زندگی اور تفریحات، جب کہ ان تمام چیزیں کا حصول اکثر ایک حد پر جا کر بوریت پر منتج ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ لازم نہیں ہے کہ اگر آپ چھٹیوں پر جائیں تو آپ واقعی ان سے لطف اندوز ہوں۔ ممکن ہے ایک شخص تعطیلات پر بڑی خوشی خوشی جائے، لیکن جب وہ واپس آئے تو بھجا بھجا ہو۔ کیونکہ کسی چیز سے محفوظ ہونے کا تعلق آپ کے جسم سے ہے۔ جب کہ آپ کا روحانی وجود اس قسم کی تمام پابندیوں سے مبرا ہے۔

انسان جسمانی اور روحانی لحاظ سے دوہری شخصیت کا حامل ہے۔ ایک طرف انسانی جسم کئی پہلو سے بندوشوں سے دوچار ہوتا ہے۔ مثلاً تندرستی۔ لمبائی چوڑائی، پٹھوں کا مضبوط اور بدن کا پھر تپنا ہونا۔ ان بندوشوں کی وجہ ایک شخص اکثر اپنی صحت کے حوالے سے عدم اطمینان کا شکار ہوتا ہے۔ دوسری طرف اس کا روحانی اور فکری وجود ہر قسم کی مجبوری سے آزاد ہے۔ روحانی تفکر و تدبیر جس سلطنت میں سفر کرتا ہے وہ وسیع اور ابدی ہے، جیسے کہ کائنات میں خلا کی حد نہیں ہے۔ اسی طرح انسانی فکر کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ دماغ کا تعلق سوچنے سے ہے اور سوچنے کی راہ میں کوئی دیوار حائل نہیں ہے۔ تفکر و تدبیر ہر طرح کی پرپیچ راہوں پر بغیر رکے اپنا سفر جاری رکھ سکتا ہے۔

آئیں ایک کاروباری آدمی کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس کی تگ و دو دنیاوی زندگی کے چھوٹے سے دائرے تک محدود ہوتی ہے۔ تگ دائرے میں گردش کرتے رہنے سے وہ اکثر بوریت کا شکار ہو جاتا ہے۔ عظیم امریکن بزنس مین بل گیٹس نے ایک دفعہ بالکل صحیح کہا تھا۔ جب آپ دس لاکھ ڈالر سے زیادہ کمالیتے ہیں۔ تو مزید کمانے کی اہمیت ایک کچے گوشت کے ٹکڑے سے بھی کم ہو جاتی ہے۔

سائنسی تحقیق عقل و دانش کے تگ دائرے میں سفر کرنے کی مانند ہے۔ اس لیے

سائنس دان کبھی کبھار کاروباری لوگوں کی طرح اکتاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں نیوٹن نے اپنی زندگی کے آخری دور میں کہا تھا کہ میری مثال ساحل سمندر پر کھیلنے ہوئے ایسے لڑکے کی ہے جو ادھر ادھر گھومتے ہوئے عام کنکروں کے مقابلے میں ملائم اور خوبصورت کنکریوں کی تلاش کر رہا ہے۔ جب کہ ابھی نہ دریافت شدہ سچائی کا بحر بے کنار میرے سامنے پھیلا ہوا ہے۔ اس طرح کا احساس عظیم سائنس دان البرٹ آئن اسٹائن کا بھی تھا وہ کہا کرتا تھا جتنا میں سیکھتا ہوں اتنا ہی یہ احساس بڑھتا ہے۔ کہ میں ابھی کچھ نہیں جانتا۔ سائنسی تحقیق کے مقابلے میں روحانی تحقیق کہیں زیادہ اہم ہے۔ اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ گیلیلو کے مطابق سائنسی تحقیق کا حلقہ اثر صرف فطرت کے ظاہری پہلو سے ہے جب کہ روحانیت کے دائرہ کار میں معیار اور کیفیت کا پہلو آتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ قدرت کا پوشیدہ راز عیاں چیزوں کے مقابلے نا قابل پیمائش اور زیادہ وسیع ہے

جو روحانی تحقیق کو بطور دانشورانہ سرگرمی کے اختیار کرتا ہے۔ وہ روحانی سائنسدان ہے۔۔ سائنس دان شاید کسی مقام پر اپنی تحقیق کو روک دے۔ لیکن روحانی سائنس دان کے لیے آسمان کی وسعت بھی ناکافی ہے۔ یہ صرف روحانی کامیابی ہے جو کہ آپ کو اطمینان و مسرت کا احساس دے سکتی ہے۔ مادی دنیا میں اطمینان شاذ و نادر ہی حاصل ہوتا ہے۔ لیکن روحانی دنیا میں اطمینان یقینی قابل حصول ہے۔۔



خدا کی تلاش

معرفت خداوندی کی پہچان یہ ہے کہ جب آپ ایک دفعہ اس تک رسائی حاصل کر لیں تو آپ مکمل طور پر پرسکون ہو جائیں گے۔

1946 میں ایک آسٹریلیئن نیرو لوجسٹ اور ماہر نفسیات وکٹر عیمیل فرینکل

ل (1905-1997) نے ایک کتاب ”انسان کی تحقیق برائے سچ“ (Man's Search

(for Meaning) کے نام سے لکھی تھی۔ کئی سال بعد اسی موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ پرنٹنگ پریس کے تین سو سال سے زائد عرصہ کے دوران، مختلف زبانوں میں اس موضوع پر لاکھوں کتابیں شائع ہوئیں۔ اگر ان کتابوں کو مشترکہ موضوع دیا جائے۔ تو بلا شک و شبہ ان کا عنوان ”سچائی کی تلاش میں“: (In Search of Meaning) ہوگا۔

انسان قدرتی طور پر حقائق کا متلاشی ہے۔ چونکہ ہر آدمی سوال کرنے والے دماغ کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے ہر ایک اپنے سوالوں کا جواب تلاش کرنے کی سعی کرتا ہے یہ ہی وہ جاننے کی لگن ہے جو کہ اس موضوع پر بے شمار کتابوں کو معرض وجود میں لانے کا باعث بنی۔ تمام کتابیں چاہے اُن کا تعلق افسانہ نگاری سے ہے یا حقیقت نگاری سے، بلواسطہ یا بلاواسطہ سب کا نفس مضمون ”سچائی کی تلاش“ ہے۔

جب ایک شخص اپنی پختہ عمر کو پہنچ جاتا ہے۔ تو اس کو سب سے پہلے اپنی روزی کمانے کی فکر ہوتی ہے۔ وہ مختلف قسم کے کام کرتا ہے اور متنوع (Various) قسم کی معاشی سرگرمیوں میں مشغول رہتا ہے۔ جب وہ کسی مہم جوئی میں مشغول ہوتا ہے۔ تو اس کا دھیان بٹا رہتا ہے تاہم اس کو دھیرے دھیرے احساس ہوتا ہے۔ کہ اُس کی کاوشوں کا ما حاصل وہ نہیں ہے جس کا وہ متلاشی ہے۔ یقیناً اس کی محنت اُس کے دسترخوان کو وسعت دیتی ہے۔ لیکن دسترخوان کی وسعت سب کچھ نہیں ہوتی ہے۔ جیسے کہ حضرت عیسیٰؑ نے ایک دفع فرمایا تھا۔ کہ انسان محض روٹی پر زندہ نہیں رہ سکتا (متی ۴:۴)۔ بلاشبہ ہر انسان کی پہلی ضرورت روزی کمانا ہے۔ تاہم غذا انسان کی صرف جسمانی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ اس سے فہم ادراک کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ آج ہر انسان مایوسی اور دل شکستگی کا جو تجربہ کر رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ روٹی ہر سوال کا جواب نہیں ہے۔

بگ بینگ نظریہ کے مطابق یہ کائنات تیرہ ارب سال پہلے وجود میں آئی تھی۔ ہر کوئی اس نظریہ کی بنا پر سوچتا ہے۔ کہ اربوں سال پہلے میرا وجود اس کائنات میں معدوم تھا۔ پھر میں پیدا ہوا اور قدرت نے مجھے اس دنیا کی انسانی آبادی کا حصہ بنا دیا۔ تقریباً ہر شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر اس بات کا خواہاں ہے کہ وہ جانے کہ وہ کیوں اور کیسے وجود میں آیا۔ اس دنیا میں چند لوگ

ایسے بھی ہیں جنہوں نے صرف اپنی موجودگی پر انحصار نہیں کہا ہے بلکہ وہ اس دنیا میں اپنی موجودگی کا مقصد جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔

جب ایک شخص اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے وہ فوراً اپنے آپ کو ایسی دنیا میں پاتا ہے جہاں زندگی کو رواں دواں رکھنے والے ساری چیزیں موجود ہیں جن کی تخلیق میں اُس کا ذرہ برابر بھی حصہ نہیں ہے۔ اس کو یہ واضح ہو جاتا ہے۔ قدرت کے اندر پہلے ہی سے تمام فنی علوم و فنون پوشیدہ ہیں۔ انسان نے ان پوشیدہ علم و فنون کو بعد میں دریافت کیا۔ پھر ایک مہذب معاشرہ تشکیل دینے کے لیے ان فنی علوم کو مزید ترقی دی گئی اور ان کو بہتر بنایا گیا۔

پھر انسان اپنے آپ سے سوال پوچھتا ہے۔ اس براہ راست منصوبہ سازی کی پشت پر کون ہے؟ میرے اور اُس بہترین صنّاع (Superb Artist) کے درمیان کیا تعلق ہے۔ مزید وہ موت کے بارے میں پوچھتا ہے۔ انسان کیوں مرتا ہے۔ اور مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ اگر آپ ان سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے تو آپ ایک صنّاع تک پہنچ پائیں گے جس کو مذہبی اصطلاح میں خدا کہتے ہیں۔ اگر ہم اس اصطلاح کو قبول کر لیں۔ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہاں ہر کوئی خدا کی تلاش میں ہے۔ یہ خدا ہی ہے جو ہر شے سے پردہ کشائی کرتا ہے۔ اور خدا کی دریافت کے بعد ہر چیز اپنی جگہ پر قائم ہو جاتی ہے۔

ایک دفعہ میں نے ایک نجوم میں ایک بچے کو دیکھا جو پریشانی میں ادھر ادھر دوڑ رہا تھا کیونکہ وہ اپنی والدہ سے بچھڑ گیا تھا۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا اور مسلسل پوچھ رہا تھا کہ اس کی والدہ کہاں ہے۔ کچھ دیر بعد جب اس نے اپنی والدہ کو پالیا۔ اور اس کی ماں نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ تو وہ فوراً پرسکون اور خاموش ہو گیا۔

یہ واقعہ انسانی فطرت کی وضاحت کرتا ہے۔ ہر بندہ دانستہ یا نادانستہ خدا کی تلاش میں ہے۔ اور جب وہ اس کو پالیتا ہے تو وہ پرسکون ہو جاتا ہے۔ اپنی زندگی میں انسان مختلف اشیاء کی طرف دوڑتا ہے۔ لیکن جب چیزیں اس کی رسائی میں آ جاتیں ہیں۔ تب اُس کو معلوم ہوتا کہ اس کو وہ چیز نہیں ملی جس کی اُسے تلاش تھی۔ پوری انسانی تاریخ میں یہ تقریباً ہر ایک کے بارے میں سچ ثابت ہوا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ گہری سوچ بچار کے بعد اپنی کوشش کو از سر نو جاری

(Refocuse) کیا جائے۔

ہر انسان کی زندگی کے دو حصے ہیں۔ ایک تفریح (Comedy) دوسرا المیہ (Tragedy)۔ اگر متلاشی (Seeker) ایسے راستہ کا انتخاب کرتا ہے، جو اللہ کی طرف نہیں جاتا، تو اُس کی زندگی کا پہلا حصہ تفریح اور دوسرا المیہ بن جاتا ہے۔ کیونکہ خدا کی ہستی ایسی ہستی نہیں ہے جس کو خارجی طور پر بتانا پڑتا ہو۔ یہ تو خود دریافتی (Self Discovery) کا عمل ہے۔ انسان خدا کو صرف داخلی طور دریافت کر سکتا ہے اور داخلی طور پر دریافت شدہ خدا ہی انسان کو ایمان دے سکتا ہے۔ اگر آپ اپنی زندگی کو با مقصد بنانا چاہتے ہیں۔ تو اس مسئلہ کو ترجیح بنیادوں پر حل کرنا ہوگا۔ اور خدا کی دریافت میں صرف اور صرف آپ کا اپنا مطالعہ اور مشاہدہ آپ کی مدد کر سکتا ہے۔ خدا کو پانے کی کسوٹی (Criterion) یہ ہے۔ جب آپ اس کو پالیں گے تو آپ مکمل طور پر مطمئن ہو جائیں گے اس بچے کی طرح جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک دفعہ فرمایا ”تلاش کر، تو پالے گا“ (متی ۷: ۷) یہ صرف مذہبی قول ہی نہیں ہے بلکہ یہ فطرت کا قانون بھی ہے۔ خدا کی کامیاب تلاش کے لیے اخلاص شرط ہے۔ جو شخص اخلاص سے کے اللہ کو تلاش کرے گا۔ وہ یقیناً اپنی منزل مقصود کو پالے گا۔



ناپختہ (Underdeveloped) کردار کے ساتھ جینا

ایک مشہور اداکار کا انٹرویو آل انڈیا ریڈیو سے بارہ نومبر ۲۰۱۴ کو نشر ہوا۔ انٹرویو کرنے والے نے اداکار سے پوچھا: ”آپ فلم کے سیٹ پر اپنی حقیقی زندگی کے بالکل برعکس کردار ادا کرتے ہیں۔ آپ ایسے کردار کرنے میں کیسے کامیاب ہو جاتے ہیں جو کہ مکمل طور پر آپ کی اصل شخصیت سے متضاد ہیں۔“ اداکار نے جواب دیا: ”جس وقت ہم اداکاری کرتے ہیں اُس وقت ہم اپنے آپ سے مکمل طور پر جدا ہو جاتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو اس کردار میں ڈھال لیتے ہیں جو ہم نے ادا کرنا ہوتا ہے۔“

ہمارا زمانہ مکمل طور پر پیشہ ورانہ دور (Professionalism) ہے۔ جب ایک شخص اپنے منتخب کردہ پیشہ میں داخل ہوتا ہے۔ اس کو اپنا کردار (Role) کسی ہدایات کار (Director) کی ہدایت کے مطابق ادا کرنا پڑتا ہے اس لیے کچھ دیر کے لیے وہ اپنے آپ کو اپنے سے جدا کر لیتا ہے۔ بعض اوقات وہ ایک ہی کردار کو کئی دفعہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ لیکن یہاں ایک مسئلہ ہے کہ یہ صورت حال ساری زندگی کے لیے نہیں ہوتی۔ ایک وقت آتا ہے جب اُس شخص کی پیشہ وارانہ زندگی اختتام کو پہنچتی ہے۔ زندگی کے اس نئے موڑ پر وہ ایک انوکھی صورت حال کا سامنا کرتا ہے۔ ریٹائرڈ منٹ سے پہلے وہ اپنے کردار کو مثبت شخصیت کا کردار سمجھا کرتا تھا اب ریٹائرڈ منٹ کے بعد، اس کو اپنے اصل کردار (Real Personality) کے اندر پلٹنا پڑتا ہے۔ جو کہ ساری عمر نا پختہ (Underdeveloped) حالت میں رہا ہے۔ اب اس کو ایسی شخصیت کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ جو کہ مثالی نہیں ہے اور اُس کو مثالی شخصیت بننے کے لیے بہت کچھ ترک کرنا پڑتا ہے۔

کسی بھی شخص کار ریٹائر منٹ سے پہلے کا وقت بہت قیمتی وقت ہوتا ہے۔ یہ عمر پختگی کی عمر ہوتی ہے۔ لیکن زندگی کے ان دو ادوار، ریٹائر منٹ سے قبل اور بعد میں، جو اختلاف واقع ہوتا ہے اُس کی وجہ سے وہ مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ریٹائر منٹ سے پہلے وہ بہترین کارکردگی (Super performer) کا دعوے دار ہوتا ہے۔ اور ریٹائر منٹ کے بعد وہ تقریباً بیکار (Non-performer) ہو جاتا ہے۔ یہ اختلاف صاف صاف بتاتا ہے۔ کہ نام نہاد کامیاب افراد اپنی زندگی کے آخری حصے میں کیوں مایوسی میں زندہ رہتے اور کیوں مایوسی میں مر جاتے ہیں۔

اس مسئلے کو حل کرنے کے دو طریقے ہیں۔ پہلے ایسے پیشہ میں داخل ہوں کہ وہ تمام عرصہ حیات پر مشتمل ہو۔ اس طرح ایک پیشہ ور شخص تسلی حاصل کر سکتا ہے۔ پیشہ وارانہ زندگی میں داخل ہوں جس میں کا اپنے کام سے مطمئن ہوتا دوسرا راستہ دوسرا طریقہ یہ ہے ریٹائرڈ منٹ کے فوراً بعد انسان اپنی نئی زندگی کا آغاز کرے اور اپنا وقت مطالعہ اور صحت مندانہ سرگرمیوں کے لیے وقف کر دے اور اس طرح وہ اپنی تمام پوشیدہ صلاحیتوں کو مثبت طور پر بروکار لائے۔ اور



جذبہ تلاش کی اہمیت

جو شخص تلاش کا جذبہ نہیں رکھتا وہ روحانی طور پر نابینا ہے۔

دریافت کی ابتدا تلاش کے عمل سے ہوتی ہے۔ اگر آپ ایک متلاشی (Seeker) ہیں تو قدرت کے اہل قانون کے مطابق آپ ایک نہ ایک دن ضرور اپنی منزل مقصود کو پالیں گے۔ یہ ناممکن ہے کہ جو شخص سچائی کا متلاشی ہو اور وہ ناکام ہو جائے۔ یقینی طور پر یہ اللہ کا قانون ہے۔ جس کی حضرت عیسیٰ نے ان الفاظ میں وضاحت کی ہے۔ آپ نے فرمایا: ”ماگلو اور تم پاؤ گے۔ تلاش کرو، تو ملے گا۔ دستک دو، تو دروازہ کھلے گا۔ (متی ۷: ۷)۔“ دوسری طرف یہ بھی ناممکن ہے کہ کوئی شخص بغیر سچائی کا متلاشی بنے کسی قسم کی کوئی دریافت کرے۔

تلاش کرنا کیا ہے؟ تلاش کرنے کا مطلب ہے کہ اپنی فکر و نظر، اپنی قوت مشاہدہ، اپنی سماعتوں کو متحرک (Activate) کرنا ہے۔ جب کوئی شخص اپنی ان خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرتا ہے۔ حقیقت میں وہ اپنے سوچ بچار کی صلاحیت کو بہتر کرتا ہے۔

اگر ایک نابینا شخص پیاسا ہو۔ تو وہ سامنا پڑے پانی کے گلاس سے پانی نہیں پی سکتا کیونکہ وہ اُس کو دیکھ نہیں سکتا ہے۔ اور یہی چیز پوشیدہ حقائق (Unseen realities) کے بارے میں بھی سچ ہے۔ جو شخص جاننے کی لگن نہیں رکھتا۔ وہ روحانی طور پر نابینا ہے۔ اگرچہ روحانی اشیاء اس کے ارد گرد موجود ہوں لیکن وہ اُن کو دیکھنے کی اہلیت نہیں رکھتا ہے۔ لہذا روحانیت کو پانے سے پہلے روحانیت کی تلاش (Spiritual seeking) کا مرحلہ آتا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے تو اپنے آپ کو روحانیت کا متلاشی بنانا پڑے گا۔ پھر آپ روحانی اشیاء کو کہ ہر وقت

آپ کے ارد گرد موجود ہیں اُن سے روحانیت دریافت کرنے کے اہل ہوں گے۔
تلاش کا جذبہ اخلاص کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیے۔ اخلاص کیا ہے؟ اخلاص
مکرو فریب، دروغ گوئی اور منافقت سے پاک رویے کا نام ہے۔ ایک متلاشی شخص کے لیے
اخلاص پیشگی شرط (Precondition) ہے۔ اگر آپ کی یہ خواہش ہے کہ آپ روحانیت کو
پانے والے بنیں۔ تو اپنے جذبہ اخلاص کو بہتر سے بہتر کریں۔ اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے
آپ کو روحانی شخصیت کے روپ میں ڈھال لے تو سب سے پہلے اس کو مخلص شخصیت کے روپ
میں ڈھلنا ہوگا۔ کیونکہ روحانیت اخلاص کی قیمت پر حاصل کی جاتی ہے۔ اس دنیا میں بغیر قیمت
ادا کیے کچھ بھی حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

ایک انسان پیاز کی طرح کئی پرت رکھتا ہے۔ اور پیاز کے مرکزی حصہ تک تب ہی پہنچا
جاسکتا ہے۔ جب اس کے پرت اُتار دیئے جائیں۔ اسی طرح انسانی شخصیت تک بھی تب ہی
پہنچا جاسکتا ہے اگر ہم اس پر وہ مختلف پرت جو معاشرے میں رہتے ہوئے اس کے ارد گرد لپٹے
ہوئے ہیں اُن کو اُتار دیں۔ اگر آپ روحانیت کو حاصل کرنے میں سنجیدہ ہیں تو آپ کے پاس
کوئی اختیار نہیں ماسوائے کہ آپ اپنی شخصیت کی از سر نو دریافت کریں۔ اور ان مختلف پرتوں کو
اپنے آپ سے علیحدہ کر دیں ایک دفعہ جب آپ یہ کام کر لیں گے تو آپ اخلاص کو پالیں گے۔
اور جہاں اخلاص ہے وہاں روحانیت ہے۔ اخلاص اور روحانیت شانہ باشانہ چلتے ہیں۔ اخلاص
ایک بیج کی مانند ہے اور روحانیت اس کا پھل ہے۔

روحانیت ایک ایسی خوبی جس کی خواہش تمام انسانوں میں موجود ہے۔ یہ زندگی کو
بامعنی بناتی ہے۔ یہ آپ کو بامقصد زندگی گزارنے کی ترغیب دیتی ہے۔ یہ آپ کو اس قابل کرتی
ہے کہ آپ غیر معمولی حالات میں بھی ایک متوازن ذہن کے ساتھ زندگی بسر کریں یہ آپ کے
وقت اور توانائی کو غیر سنجیدہ کاموں پر ضائع ہونے سے بچاتی ہے۔ یہ یقینی طور پر آپ کو معاشرے کا
صحت مند سوچ رکھنے والے رکن بناتی ہے۔ روحانیت اتنی قیمتی ہے۔ کہ ایک شخص کو اس کی کوئی بھی
قیمت ادا کرنی پڑے وہ اس کے لیے تیار رہے۔ چاہے وہ کتنی بھی زیادہ ہو۔ یہ مقصد اتنا اعلیٰ ہے
کہ اس کو ہر صورت حاصل کیا جائے۔ یہ صرف مخلصانہ کاوشوں کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

کوئی شخص بھی خود بہ خود بغیر محنت کے روحانیت حاصل نہیں کر سکتا۔
 ہر شخص دو دفعہ پیدا ہوتا ہے۔ پہلا جنم اُس کا جسمانی ہوتا ہے۔ جس کا ذریعہ اس کے
 والدین ہوتے ہیں جبکہ دوسرا جنم اس کا اپنی محنت کا نتیجہ ہوتا ہے۔



عقلی پیمانے پر کائنات کی وضاحت

چونکہ یہاں انسان کو مکمل آزادی حاصل ہے لہذا بہت سے مسائل اور چیلنجز کا ہونا بھی لازم ہے
 ان چیلنجز کے حل ہی پر ہمارے ارتقاء و عروج کا انحصار ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اعتقاد (Belief) اور عدم اعتقاد (Disbelief) کے حوالے سے
 تمام بحث و مباحثہ اس سوال پر آ کر ختم ہو جاتے ہیں کہ کیا یہ اعتقادات عقلی پیمانہ پر پورا اُترتے
 ہے؟ جو لوگ خدا کے وجود کے انکار ہی ہیں وہ سوال اٹھاتے ہیں۔ کہ اگر خدا ہے تو ہم دنیا میں
 تضادات کیوں دیکھتے ہیں؟ لیکن جب ہم کائنات کا مشاہدہ کرتے ہیں، تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے
 ہیں۔ کہ اول سے آخر تک تمام کائنات میں اعلیٰ قسم کی منصوبہ بندی موجود ہے۔ جب کہ انسانی دنیا
 میں صورت حال مختلف ہے۔ یہاں ہم مصائب و آلام اور ہر قسم کی برائی دیکھتے ہیں۔
 متشککین (Sceptics) کے مطابق انسانی دنیا اور کائنات میں یہ تضاد اس بات پر گواہ ہے کہ
 یہ دنیا ایک بے ترتیبی و بے قاعدگی کا مجموعہ ہے۔ اُن کے مطابق جزوی طور پر ایسا ضرور لگتا ہے کہ
 یہاں کوئی منصوبہ ساز ہے۔ لیکن جب مکمل صورت حال پر غور کرتے ہیں تو منصوبہ بندی موجود
 نہیں ہوتی ہے۔ یہ اس دلیل کا انکار کرتے ہیں۔ کہ اگر نقشہ موجود ہے تو نقشہ ساز بھی تو ہوگا۔

ان دو دنیاؤں کے اختلافات کی وضاحت ان کا باہم موازنہ کر کے کی جاسکتی ہے۔
 کیونکہ ہمارے سامنے دو طرح کے واضح فرق نمایاں ہوتے ہیں جب ہم انسانی دنیا اور کائنات کا
 باہم مقابلہ کرتے ہیں۔ پہلا فرق یہ ہے کہ انسانی دنیا میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہے۔ انسان کو
 مکمل آزادی ہے چاہے تو اہنسا (عدم تشدد) کی راہ پر چلے یا عالمی جنگ (World War) کا
 حصہ بنے۔ وہ جوہری توانائی (Nuclear energy) کو تعمیری مقاصد کے لیے استعمال

کرے یا پھر وہ اسی توانائی سے جوہری ہتھیار (Nuclear Weapons) بنائے۔ اس طرح کی آزادی اپنے رجحان کے مطابق بدامنی اور تنازعات کو ہوا دیتی ہے اور تمام نظام کو برباد کرنے کی طاقت بھی رکھتی ہے۔ کائنات کی صورت حال کلی طور پر مختلف ہے۔ کائنات کی ناقابل قیاس وسعت اور ان گنت اجزاء کے باوجود ہم اس کو انتہائی منظم حالت میں پاتے ہیں۔ کائنات کے ادنیٰ سے جز سے لیکر پیچیدہ ترین حصے تک، قانون فطرت کے مطابق اس کے تمام افعال (Functions) سخت نظم و ضبط کے زیر اثر ہیں۔ جس کی وجہ اُس کا تمام لائحہ عمل قابل پیش گوئی ہے۔ اس قابل پیش گوئی کردار کی وجہ سے ہمیں اس بات پر دسترس ہوئی کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو صحیح خطوط پر ترقی دے سکیں۔ تاہم کائنات کے مقابل میں انسان کو خود مختاری دی گئی ہے اُس پر سخت نظم و ضبط نافذ نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے سماجی سائنس اور فزیکل سائنس میں باہم مطابقت نہیں ہے۔ مثال کے طور پر نظام شمسی کی ایک تعریف (Definition) ہے جبکہ سیاسیات کی درجنوں تعریفیں ہیں۔

ہماری دنیا اور باقی کائنات میں جو فرق ہے وہ ہمارے اس یقین کا باعث ہے کہ خالق نے جو منصوبہ بندی کی ہے وہ ہر چیز کے لیے علیحدہ علیحدہ ہے۔ ایک طرف کائنات کا نظام ایک خود کار نظم و ضبط سے وابستہ ہے جب کہ انسان کو خود مختاری (Freedom) عطا کی ہے۔ اس نمایاں فرق میں گہری حکمت پوشیدہ ہے۔ اگر ہم فزیکل دنیا کو دیکھیں تو ہم محسوس کریں گے کہ عقل و دانش کی ترقی کے مواقع وہاں ناپید (absent) ہیں دوسرے الفاظ میں یہ صدیوں سے یکساں حالت میں ہیں۔ جبکہ انسانی دنیا میں مسلسل چیلنج کا سامنا ہے۔ اور یہ مقابلے کا ماحول تعمیر و ترقی کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بغیر مشکلات کا تجربہ کیے کسی قسم کی نئی سوچ یا عقلی ترقی ممکن نہیں ہو سکتی۔ جب ہم مادی دنیا کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہر چیز کو ایک سلیقہ سے پاتے ہیں اس کے برعکس انسانی دنیا تضادات کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ تضادات منفی نہیں ہیں۔ بلکہ یہ مثبت حقائق ہیں۔ انسانی دنیا میں اس بے قاعدگی کی مثبت تشریح کرنا یہ ہے کہ ہم چیلنجز کا تعمیری انداز میں جواب دیں۔

ان اختلافات کی وجہ سے ہمیں ان دو دنیاؤں کے اندازے کے لیے دو مختلف

معیارات کا تعین کرنا پڑتا ہے۔ کائنات پر غور ایک خود کار نظم اور انسانی دنیا پر انسانی خود مختاری کو پیش نظر رکھ کر کریں۔ کائنات کے اس جبری فطرت کا شکر یہ ادا کرنا چاہیے۔ جس نے انسان کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ ٹیکنالوجی کو معرض وجود میں لایا۔ اگر مادی دنیا قبل از وقت پیش گوئی کی متحمل نہ ہوتی تو ہم مادی دنیا کے وسائل صنعتی ترقی (Industrial Development) کے لیے استعمال کرنے سے معذور ہوتے۔ چونکہ انسان کو مکمل خود مختاری حاصل ہے۔ تاہم اس کا ایک قابل افسوس پہلو یہ ہے کہ یہ مکمل خود مختاری بعض خرابیوں کا باعث بھی بنتی ہے۔ اس لیے یہ ناگزیر صورت پیدا ہوتی ہے کہ کچھ مسائل و مشکلات سر اٹھائیں۔ تاہم ان مسائل کو دور کر کے ہم ترقی کرتے ہیں۔

مشکلات مادی دنیا کا حصہ نہیں ہیں۔ یہ تو انسانی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ ناگزیر برائی ہماری تمام ترقی کی قیمت ہے جیسے ہم فخر سے مدنیت (Civilization) کہتے ہیں۔



فطرت سے سیکھنا

جب ہم یہ دریافت کرتے ہیں کہ قدرت کا محبت بھرا مزاج ہے۔ تو ہمارے لیے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں بچتا کہ ہم بھی محبت بھری ثقافت (Friendly culture) کو فروغ دیں۔

انگریزی زبان کے شاعر والٹر ڈی لامیر (1873-1956) نے ایک دفعہ دیکھا کہ ایک خاتون کھانا کھا رہی تھی دلیہ، کلچ، سیب اور اس طرح کی دیگر ایشیا میز پر تھیں۔ والٹر ڈی لامیر کے ذہن میں عجیب خیال آیا کہ باہر مذکورہ اشیاء خوراک کا حصہ ہیں۔ لیکن جب یہ خاتون کھا لیتی ہیں۔ یہ ایشیا آسانی سے تبدیل ہو کر ایک جیتی جاگتی خاتون بن جاتی ہیں۔ بعد ازاں انھوں نے اس خیال کی بنیاد پر ایک نظم ”مس ٹی ڈی لامیر“ لکھی۔ انھوں نے مندرجہ ذیل اشعار کہے

It is very odd thing,
As odd as can be,

That whatever Miss T eats

Turns into Miss T

ترجمہ یہ بڑی عجیب و غریب چیز ہے جو کچھ بھی مس ٹی کھاتیں ہے وہ مس ٹی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

یہ مس ٹی کے نظام انہضام (Stomach) کی کرشمہ سازی (Miracle) ہے۔ لیکن کسی کا ذہن اس سے بھی لاکھوں گنا زیادہ حیرت انگیز چیز کے بارے سوچ سکتا ہے۔ جیسا کہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ یہ تمام خوراک تو خارجی دنیا میں تیار ہوتی ہے۔ لیکن معجزاتی طور پر یہ ہمارے جسم کے داخلی نظام سے ہم آہنگ (Compatible) ہے دونوں ایک دوسرے کے معاون (Complementary) ہیں۔ دو مختلف اشیاء کے درمیان یہ انتہا درجے کی معاونت اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں کا خالق ایک ہے۔ اور یہ بہت سوچی سمجھی تخلیق ہے۔

قدرت کے یہ واقعات ہمیں اس بات پر قائل کرتے ہیں کہ صرف واحد طاقت تمام کارخانہ قدرت کو کنٹرول کرتی ہے یہ دریافت ہمیں اس بات کا عقیدہ (belief) دیتی ہے۔ کہ نظام قدرت کے مقاصد باہم مربوط (Unity of purpose) ہیں۔ مزید یہ ہمیں اللہ کی وحدانیت پر اور مساوات انسانی پر یقین دیتی ہے۔ نیز قدرت کی یہ منصوبہ بندی ہم کو درست تصور حیات (Ideology) دیتی ہے۔ ایسا تصور حیات جو آفاقی (Universal) امن اور بھائی چارے پر مبنی ہے۔ یہ ہم اور تم کی لیکر کو مٹا دیتی ہے۔ یہ دریافت نہ صرف فکری ہم آہنگی کو فروغ دیتی ہے۔ بلکہ ہمیں ہر طرح کی پریشانی سے محفوظ رکھتی ہے۔

یہ تصور حیات اس فکر کو ذہن نشین کرتا ہے کہ قدرت ہماری معاند (Hostile) نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے لیے مہربان ہے۔ ایسے حالات میں ہمارے لیے اس مہربان کلچر کو اپنے معاشرے میں فروغ دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔

پھر مس ٹی کے تجربہ کا دوسرے پہلو یہ ہے کہ ہم کوشش کرتے ہیں کہ اپنے ارد گرد موجود اشیاء کو اپنے فائدے کے لیے تبدیل کریں۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ فکری طور پر ان تمام چیزوں کو جذب کریں جن کو ہمارے جسم نے پہلے ہی جذب کر لیا ہے۔ ہر کوئی روحانیت کے بارے میں

بات کرتا ہے لیکن روحانیت کیا ہے۔ روحانیت کوئی پراسرار چیز نہیں ہے۔ روحانیت مراقبہ (Madtion) سے نہیں بلکہ غور و فکر (Contemplation) سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ روحانیت ایک عقلی مظہر (Intellectual Phenomenon) ہے۔ میرے تجربے کے مطابق روحانیت کی بنیاد دل کے بجائے ذہن ہے۔

ہمارا نظام انہضام (Digestive System) غذا سے جسمانی توانائی حاصل کر سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح ہمارا ذہن غذا سے روحانی توانائی حاصل کر سکتا ہے۔ خارجی طور پر یہ اشیا کھانے پینے کی چیزیں ہیں لیکن داخلی طور پر یہ اشیا روحانی ہیں۔۔۔ مثلاً اگر آپ یہ سوچتے ہیں کہ خدا مسلسل یہ قدرتی نعمتیں انسان کو بغیر کسی قیمت کے دے رہا ہے تو اس میں انسان کے لیے ایک خاموش پیغام ہے۔ کہ ہمیں اپنے معاشرے میں دینے والا بن کر رہنا ہے بغیر یہ توقع باندھے کہ لینے والا ہمیں بدلے میں کچھ دے گا۔ اس قسم کی سوچ بے غرض کلچر، یک طرفہ اخلاقیات اور بے ضرر شخص بن کر معاشرے میں رہنے کے رجحان کو فروغ دیتی ہے۔

ہمیں اخلاقیات کے لیے ماڈل کوڈ کی ضرورت ہے۔ قدرت بطور ماڈل موجود ہے۔ قدرت اللہ کا کارخانہ ہے۔ یہ وہ چیزیں پیدا کرتی ہے جو ہمارے لیے انتہائی طور پر مناسب ہیں۔ حیرت انگیز بات ہے کہ یہ قدرت کی انڈسٹری ہم سے رابطہ کیے بغیر ہمارے لیے کام کرتی ہے۔ اور نیچر کا کردار قابل پیش گوئی ہوتا ہے۔ لہذا ہم سے بھی یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہم معاشرے کے قابل پیش گوئی رکن بن کر رہیں۔ نیچر قابل پیش گوئی انداز میں کام کرتی ہے۔ اور ہم کو یہ سبق دیتی ہے۔ کہ معاشرے کے قابل پیش گوئی شخص بن کر زندگی گزاریں۔ اس طرح ہم انسان کی اعلیٰ ترین خوبیوں کو ایک فقرے میں سمو سکتے ہیں: قابل پیش گوئی کردار۔



طوفان میں بڑے پرندہ کی حکمت عملی

جب شدید طوفان آتا ہے۔ چھوٹے پروں والے پرندے اس میں گھر جاتے ہیں۔

لیکن مضبوط پروں والے بڑے پرندے بلندی کی طرف پرواز کر کے اپنے آپ کو طوفان کی زد سے بچاتے ہیں۔ اس واقعہ کی بنیاد پر ایک انگریزی کہاوت ہے دی بگ برڈ آف دی اسٹارم (طوفان کا بڑا پرندہ)۔ یہ کہاوت اُن دانائے افراد کے لیے بولی جاتی ہے جو کہ اپنے آپ کو مشکلات کے طوفان سے کامیابی سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں یہی وہ لوگ ہیں جو خارجی حالات سے متاثر ہوئے بغیر اپنے معمول کے مطابق زندگی گزار سکتے ہیں۔

طوفان کا بڑا پرندہ کون ہے یقیناً بڑا عقل مند (Big bird Thinker) وہ ہے جو اپنی ذہنی صلاحیت کے بل بوتے پر آزادی سے (Independently) زندگی گزار سکتا ہو۔ بڑا دانشور وہ ہے جو کسی کے اشتعال دلانے سے بھڑک نہ جائے۔

جو مٹی حالات میں بھی مثبت رد عمل کا اظہار کرے اور اپنے خیالات کو اس طرح کنٹرول کرے کہ وہ تمام مرد و عورت کو چاہے وہ اُس کے دوست ہوں یا دشمن انسانیت کی نظر سے دیکھے۔ وہ اُس وقت بھی پرامن رہے جب دوسرے تشدد پر اتر آئیں۔ یہ بگ برڈ تھنکر قسم کے انسان پختہ سوچ کے مالک ہوتے ہیں کوئی چیز بھی اُن کے مقصد سے غافل نہیں کر سکتی۔ وہ ناموافق حالات میں بھی جذباتی رد عمل کے بجائے ہر چیز کا جواب سوچ سمجھ کر صبر و تحمل سے دیتے ہیں۔

ہندی زبان میں ایک کہاوت ہے کہ ”کتے بھونکتے رہتے ہیں اور ہاتھی چلتا رہتا ہے“ اس کہاوت میں یہ بہترین تشریح ہے ان لوگوں کے لیے جو بڑے پرندے کی حکمت عملی اپنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ زندگی طوفانوں، بھونکتے کتوں اور ناگوار صورت حال سے بھری ہوئی ہے۔ ان رکاوٹوں کا وقوع پذیر ہونا قانون قدرت کے مطابق ہے اور قدرت کا قانون کوئی شخص بھی منسوخ نہیں کر سکتا۔ نتیجتاً آپ کے پاس دو راستے بچتے ہیں۔ اول یا تو اپنی توانائی اور قوت کو رد عمل کی پالیسی کے مطابق مسلسل ضائع کرتے رہیں۔ یا ناپسندیدہ صورت حال سے صرف نظر (Ignore) کریں۔ اور کوشش کریں کہ ہاتھی کی مذکورہ کہاوت کے مطابق زندگی بسر کریں۔ اس دنیا میں ہاتھی کے طرز عمل کے مطابق زندگی گزارنے کا طریقہ ہی کامیاب ہے۔

بڑے پرندے کی سوچ (Big bird thinking) کا دوسرا نام روحانی سوچ ہے۔ روحانیت کوئی پراسرار چیز نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو ایک معلوم ڈسپلن ہے اور ہم اس کو مثبت سوچ کی

شکل میں بیان کر سکتے ہیں۔ تمام روحانی آدمی مثبت سوچنے والے ہیں۔ اور تمام مثبت سوچنے والے فطری لحاظ سے روحانی آدمی ہیں۔ روحانیت اور مثبت طرز فکر تقریباً ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔

ہندو دیومالائی کہانیوں (Mythology) میں ایک دلچسپ کہانی ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص نے غصہ سے آگ بگولا ہو کر رام کے سینے پر لات ماری۔ لیکن رام کا رد عمل بے مثال تھا انہوں نے کہا کہ میرے آہنی سینے سے تمہاری ٹانگ کو چوٹ تو نہیں لگی ہے؟۔ اس طرح کے مثبت رد عمل کو روحانیت کہا جاتا ہے۔ دوست و دشمن سے قطع نظر روحانی رویہ ہر انسان کے ساتھ محبت بھرے تعلق کا نام ہے۔ روحانی رویہ پھولوں کے رویوں کی مانند ہوتا ہے جو کانٹوں کے بیچ اپنی خوشبو کے ساتھ رہتا ہے۔ ایک اردو شاعر نے اس کو بڑے اچھے طریقہ سے بیان کیا ہے۔

گلش پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز

کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں

روحانیت کسی انسان کی شخصیت کو بہتر کرنے، بے چینی سے بچانے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ شفقت آمیز رویہ رکھنے میں بہت مفید ہے۔ روحانیت ہر قسم کی کامیابی میں معاون ہے۔ مثبت سوچ آپ کو بڑے پرندے کی سوچ دیتی ہے۔ اور بڑے پرندے کی سوچ انسانی کردار کو روحانی رنگ میں رنگ دیتی ہے۔ اگرچہ یہ ایک اندورنی خوبی ہے تاہم یہ اتنی طاقت رکھتی ہے کہ آپ کے تمام خارجی معاملات کو درست کر دے۔

ماں باپ آج کل کن مسائل کا سامنا کر رہے ہیں

والدین کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ان کے بچوں کو دوہری تعلیم کی ضرورت ہے پیشہ وارانہ تعلیم اور روحانی تعلیم ایک دفعہ امریکہ کے شہر کیلیفورنیا میں مقیم ایک بھارتی سے میری تعلیم کے موضوع پر بات چیت ہوئی۔ میں نے کہا یہ دور تعلیم کا دور ہے اور اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہماری نسل اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ میرے مخاطب نے جواباً کہا کہ تعلیم کے شعبے میں ان کا تجربہ بہت مایوس کن ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم سے متعارف کروائیں لیکن ان کی اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ مزید انہوں نے کہا اس وقت تعلیم حاصل کرنے سے بھی زیادہ

ری کنڈیشننگ آف مائنڈ کی ضرورت ہے۔

میں کہا یہ والدین کی خامی ہے۔ کیونکہ والدین کے پاس صرف دو راستے ہوتے ہیں۔ اولاً جو کچھ اُن کی اولاد کے ذہن میں چل رہا ہے اُس کو قبول کر لیں۔ یا پھر اپنی اولاد کو سمجھنے کی کوشش کریں اور جو وہ چاہتے ہیں وہ اپنے بچوں کے سامنے بالکل واضح کر دیں۔ آج ہم ہر ملک میں یہ مسئلہ دیکھتے ہیں کہ والدین بچوں کے ذہن کو سمجھنے میں ناکام ہیں لہذا وہ عموماً اپنے بچوں کی شکایت کرتے ہیں۔ جب کہ والدین کے لیے اپنے بچوں کی سوچ تبدیل کرنا ممکن ہے۔ تاہم اس کے لیے سب سے پہلے والدین کو اپنے تعلیم یافتہ بچوں کے ذہن کو سمجھنا پڑے گا۔

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں والدین کی اکثریت روایتی ذہن (Traditional Mind) کی مالک ہے ساتھ ساتھ وہ اپنے بچوں کو جدید تعلیمی اداروں میں تعلیم دلوانے کی بھی خواہش مند ہے۔ یہ صورت حال ایک ایسی فکر کا تقاضا کرتی ہے جو کہ جدید رجحان اور قدیم روایات کا ایک خوبصورت امتزاج ہو۔ اور والدین بجائے اس کے کہ وہ اپنی روایتی سوچ کو ترک کریں انہیں چاہیے کہ وہ اپنی سوچ کو از سر نو اس طرح واضح کریں کہ نئی نسل اُس کو آسانی سے سمجھ جائے۔ لیکن والدین کا روایتی اور بچوں کا جدید ذہن ہونا ایک ایسا مسئلہ ہے جو بچوں کو درست تعلیم حاصل کرنے میں رکاوٹ ہے۔ پھر اس رکاوٹ کو دور کرنا بھی ایک علیحدہ مسئلہ ہے۔ یہ بات طے ہے کہ بچوں کو تعلیمی سفر میں جو جو مشکلیں درپیش ہیں۔ اُس کے ذمہ دار والدین ہیں۔ یہ ری کنڈیشننگ آف مائنڈ کا سوال نہیں ہے۔ اگر والدین اپنے بچوں میں لرننگ (Learning) کے حوالے سے تبدیلی چاہتے ہیں تو انہیں اپنے بچوں کا اچھا مشیر (Counsellor) بننا پڑے گا۔ آج بچوں کی طرف سے جو پریشانی ہے اُس کی وجہ والدین کے ناقص مشورے ہیں۔

دوسرا مسئلہ بچوں کو بے جالا ڈ پیار کرنا ہے۔ والدین بچوں کے لیے بہت محبت رکھتے ہیں اور یہ اکثر بے جالا ڈ پیار کا باعث بنتا ہے۔ محبت اچھی چیز ہے لیکن بے جالا ڈ پیار برا ہوتا ہے۔ لاڈ پیار بچوں کے اندر نزاکت اور آرام طلبی پیدا کرتا ہے۔ اور اس تلخ حقیقتوں کی دنیا میں آرام طلبی کا رویہ بہت خطرناک ہے۔ لاڈ لے لے بچے نصیحتوں پر کان نہیں دھرتے۔ اپنی خواہشوں کے علاوہ

انہیں اور کسی چیز میں دلچسپی نہیں ہوتی۔ اُن کی ڈکشنری میں تلخ حقائق کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی ہے۔ اس وجہ سے لاڈلے بچے چیلنجز کا سامنا نہیں کر سکتے جو اُن کو عملی زندگی میں پیش آتے ہیں۔ ایک دفعہ میں دو گر بچو بیٹ انڈین لڑکوں سے ملا۔ انہوں نے بتایا، کہ وہ اپنے آپ کو مشکلات میں گھیرا محسوس کرتے ہیں۔ جب وہ گھر میں تھے، تو وہ اپنے والدین کی حفاظت میں تھے۔ وہ جس چیز کی خواہش کرتے اُن کے والدین اُسی وقت اُس کو پورا کر دیتے۔ لیکن اب جیسے ہی انہوں نے گھر سے باہر عملی دنیا میں قدم رکھا تا کہ وہ اپنا مقام بنائیں۔ تو انہیں ایسا لگا جیسے کوئی بھی اُن کو پسند نہیں کرتا، کوئی بھی اُن سے محبت نہیں کرتا۔ گھر کی دنیا میں اُن کا خاندان بغیر کسی قیمت کے اُن کو ہر چیز دینے کے لیے تیار تھا جب کہ بیرونی دنیا میں ہر چیز کی قیمت سخت محنت، افہام و تفہم حقیقت کا اعتراف، اپنی قابلیت کو ثابت کرنا اور مصالحانہ رویہ اختیار کرنے کی صورت میں ادا کرنی پڑتی ہے انہیں معلوم ہو گیا کہ گھر میں ان کو ایسے چیلنجز کا مقابلہ کرنے کی تربیت نہیں ملی تھی۔

یہ لاڈ کا منفی پہلو ہے۔ والدین کا بے جالا ڈپیرا ایسی جنس کی مانند ہے جس کی بازار میں کوئی طلب نہیں ہے۔ والدین کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اُن کے بچوں کو دوہری تعلیم کی ضرورت ہے یعنی پیشہ وارانہ تعلیم اور روحانی تعلیم۔ اول الذکر تعلیم تعلیمی اداروں سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ موخر الذکر تعلیم گھر میں حاصل کی جاتی ہے۔ جہاں والدین ٹیچر ہوتے ہیں۔ والدین کو یہ شعور ہونا چاہیے کہ ”یہ کرو یہ نہ کرو“ کہہ دینے سے مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ انہیں بہت حساس اور سنجیدہ رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ جیسے عقلی روحانیت کہا جائے



خوبصورت کیسے بنیں

جب آپ ایک مخلص شخص ہوں گے۔ تو آپ روحانی طرز عمل اختیار کریں گے اور کبھی بھی اپنے ضمیر اور اخلاقی اقدار کے خلاف چلنا گوارا نہیں کریں گے۔

”پلین ٹرٹھ“ نامی ایک مشہور امریکن رسالے کے بانی ہربرٹ ڈبلیو آرمسٹرونگ

(1892-1986) نے اپنے آخری مضامین میں سے ایک مضمون میں لکھا، کہ اُنھوں نے اپنی پیشہ وارانہ زندگی میں مختلف مکاتب فکر کے لاکھوں لوگوں سے ملاقات کی۔ اگر اُن سے یہ پوچھا جائے کہ کون سی انسانی خوبی ریڈیم اور پلاٹینم سے بھی زیادہ قیمتی ہے، تو وہ وثوق سے کہیں گے کہ وہ خوبی اخلاص (Sincerity) ہے۔ اخلاص انسان کی سب سے زیادہ پسندیدہ صفت ہے۔ لیکن انگلیوں پر گنے چنے افراد ہی اس کی قدر و قیمت جانتے ہیں۔

اس دنیا میں انسان کے دو مختلف قسم کے رویے ہیں۔ اولاً مخلصانہ اور دوم منافقانہ۔ دوسروں کے ساتھ مخلصانہ سلوک با اصول زندگی کا عکاس ہے۔ اور دوسروں کے ساتھ منافقانہ رویہ بے اصول زندگی کو ظاہر کرتا ہے۔ منافقانہ یا بے اصول راہ پر چلنا بہت آسان ہے۔ کیونکہ یہ طرز زندگی زیادہ غور و فکر کا تقاضا نہیں کرتا ہے۔ اس میں آدمی ہوا کے رخ پر چلتا ہے۔ اُس کے رویہ کا انحصار حالات و واقعات پر ہوتا ہے۔ وہ بغیر ذہن کو استعمال کیے وقتی صورت حال کی ہدایت کے مطابق چل سکتا ہے اور وہ بڑی آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ کیا چیز اُس کے مفاد میں اور کیا نقصان میں ہے۔ اُس کو وقتی صورت حال کے مطالبے کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے کسی با اصول راہ نما کی ضرورت نہیں ہوتی ہے یہ طرز زندگی تو ایسے بہتے پانی کی طرح ہے جس کے راستے کا تعین زمین کی سطح کرتی ہے۔ لہذا منافق آدمی ہمیشہ صورت حال کے مطابقت ماننے کے لیے تیار رہتا ہے۔

منافقت (Insincerity) کے برعکس اخلاص ایک مشکل راستہ ہے۔ جب آپ ایک راست باز شخص (Sincere Person) ہوں گے۔ تو آپ روحانی طرز عمل اختیار کریں گے اور کبھی بھی اپنے ضمیر اور اخلاقی اقدار کے خلاف چلنا گوارا نہیں کریں گے۔ اس اختلاف نے ان دو راستوں میں ایک کو مشکل اور دوسرے کو آسان بنا دیا ہے۔ اخلاص (Sincerity) آپ کو ہمیشہ صورت حال پر غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ تاکہ آپ بہترین رد عمل کا اظہار کریں اگرچہ آپ کا رد عمل آپ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

معاشرتی لحاظ سے ایک با اصول زندگی بہت اہم ہے۔ یہ آپ کو دوسروں کے لیے ایسا باعتبار شخص بنا دے گی۔ کہ وہ آپ سے معاملات طے کرنے سے پہلے ہی آپ کے حسن سلوک کا

اندازہ کر لیں گے۔ دوسری طرف منافقانہ (Insincer) طرز عمل آپ کو ناقابل اعتبار شخص بناتا ہے۔ کیونکہ یہ اندازہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ مستقبل میں آپ کون سی راہ اختیار کریں گے۔ با اصول کردار آپ کو سچا انسان بناتا ہے۔ جب کہ بے اصول زندگی آپ کو بے اعتبار بناتی ہے جو کہ ایک غیر انسانی رویہ ہے۔

ممکن ہے غلط طرز عمل (Unprincipled behaviour) آپ کو کچھ فائدہ دے، لیکن یہ سب عارضی قسم کے فائدے ہوں گے۔ مستقل فائدہ صرف با اصول زندگی کی بنیاد پر حاصل کیے جاسکتے ہیں اخلاص کا ایک بہت ہی اہم پہلو یہ ہے کہ مخلص لوگ اس قابل ہوتے ہیں کہ اللہ کی رحمتوں سے مستفید ہوں۔ اخلاص روحانیت کو ترقی دیتا ہے۔ جب کہ منافقت شخصیت کو برباد کر دیتی ہے۔ غیر مخلص آدمی روحانی تجربات میں ناکام ہو جاتا ہے۔ روحانی شخصیت کا دوسرا نام مخلص انسان ہے۔ مزید روحانیت انسان کو اپنی خواہشات پر قابو پانا اور اپنی خامیوں کو دور کرنا سیکھاتی ہے۔

بے اصول زندگی نفسیاتی خودکشی کی مانند ہے۔ جو کوئی بھی منافقانہ روش اختیار کرتا ہے وہ سب سے پہلے اپنے ضمیر کا خون کرتا ہے۔ اپنے ضمیر کا گلا گھونٹے بغیر کوئی شخص کبھی بھی منافق نہیں بن سکتا۔ ہر منتخب کردہ کام کے دوران ضمیر ہی اخلاقی پہرے دار ہوتا ہے۔ یہ قدرت کا بہترین تحفہ ہے۔ جو کوئی اپنے ضمیر کے خلاف چلتا ہے وہ اپنی تباہی کا خود ذمہ دار ہے۔ اپنے ضمیر کو زندہ رکھنے کے لیے ہر انسان اس کی آواز پر توجہ دینی چاہیے۔ کسی کی داخلی آواز ہی اس کے ضمیر کی آواز ہوتی ہے۔

اپنے ضمیر کے خلاف چلنا آسان نہیں ہے۔ یہ مایوسی پیدا کرتا ہے۔ اگر آپ ٹینشن فری زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو ضمیر کی آواز پر لبیک کہیں۔ اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس کی ہدایات پر چلیں۔ اخلاص صرف ایک خوبی نہیں ہے۔ بلکہ یہ تمام انسانی خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ جہاں اخلاص ہوگا وہاں ہر طرح کی اخلاقی خوبصورتی ہوگی۔ اور جہاں منافقت ہوگی وہاں شخصیت کی ہر قسم کی خوبیاں مسخ ہو جائیں گی۔۔



عفو و درگزر کی اہمیت

اگر عفو و درگزر تکلیف دہ معاملات کا نقطہ اختتام

ہے تو انتقام اذیت ناک معاملات کا تسلسل ہے

معاف کرنے کا مطلب ہے کہ ناپسندیدہ صورت حال کا ختم کرنا، اور انتقام کا معنی ہے

کہ ناگوار صورت حال کو طول دینا۔

ہم ہر روز کوئی نہ کوئی ناقابل گریز برے تجربے کا سامنا کرتے ہیں۔ ایسے میں انسان

کے پاس دو انتخاب ہیں۔ یا تو وہ ان برے تجربات سے صرف نظر (Ignore) کرے یا ان کی

روک تھام کے لیے جوابی تدابیر کرے۔ اول الذکر انتخاب عفو و درگزر، جب کہ موخر الذکر انتقام کا

ہے۔ کون سا انتخاب بہتر ہے؟ ہمیں چاہیے کہ اس بات کا فیصلہ نتائج دیکھ کر کریں۔

معاف کرنا یقینی طور پر بہتر انتخاب ہے کیونکہ اس کی بنیاد ایک ثابت شدہ فارمولے پر

ہے یہ آپ کو برے نتائج سے محفوظ رکھتا ہے۔ اور نہ صرف آپ کو غیر ضروری معاملات میں الجھنے

سے بچاتا ہے۔ بلکہ آپ کے قیمتی وقت کا بھی تحفظ کرتا ہے۔ مزید نئے مسائل پیدا ہونے

سے بھی روکتا ہے۔ اس کے برعکس، انتقام مسائل کو اور پیچیدہ کرتا ہے۔ کیونکہ انتقام کا مطلب ہے

بد سے بدتر اور بدتر سے بدترین کی طرف جانا۔ جہاں عفو و درگزر قیمتی وقت کو بچاتا ہے وہاں انتقام

اسے ضائع کرتا ہے۔

اس قسم کی صورت حال میں لوگ عام طور پر دوسروں کو قصور وار ٹہرانے کی طرف مائل

ہوتے ہیں۔ یہ غیر دانشمندانہ طریقہ ہے۔ بہتر لائحہ عمل یہ ہے کہ آدمی معاملات میں اپنے کردار کا

جائزہ لے۔ دوسرے الفاظ میں اگر آپ کے ساتھ کوئی ناگوار صورت پیش آتی ہے تو دوسروں کو

قصور وار نہ ٹھہرائیں۔ بلکہ اپنی کمیوں کو تا ہیوں کے بارے میں سوچیں اور وہ طریقہ اپنائیں جو آپ

کے لیے بہتر ہو۔ اکثر ہمارے سامنے دو قسم کے مواقع ہوتے ہیں۔ دوسروں کے خلاف سوچنا، یا

اپنے کردار پر تنقیدی نظر رکھنا۔ دوسروں کے مخالف سوچنا آپ کو حیوانات کی سطح پر لے آتا ہے جبکہ

اپنے بارے میں تنقیدی نظر آپ کو اعلیٰ انسانی اخلاق کی طرف لے جاتی ہے۔

اگر عفو درگزر تکلیف دہ معاملات کا نقطہ اختتام ہے تو انتقام اذیت ناک معاملات کا تسلسل ہے کسی کو معاف کر دینے کا مطلب ہے۔ کہ ناپسندیدہ حالات کا ختم کرنا۔ جب کہ انتقام سے مراد ہے کہ ناگوار واقعات کا لامتناہی (Endlessly) تسلسل قائم رکھنا۔ معاف کرنے کا عمل آپ کی مثبت سوچ کو دوام دیتا ہے۔ جب کہ انتقام منفی رجحان کی پرورش کرتا ہے۔ اور منفی رجحان ہر قسم کی برائی کا مرکز ہو سکتا ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ معاف کرنا ہمیشہ کام نہیں آتا۔ اس لیے بہتر یہ ہے جیسے کوئی کرے ویسا ہی اس کو جواب دو۔ لیکن جیسے کو تینسا والی پالیسی مسائل کا حل نہیں ہے۔ یہ پریشانی کو ختم نہیں کرتی۔ بلکہ اس طرح تو انتقام در انتقام شروع ہو جاتا ہے۔ البتہ عفو درگزر مشکلات کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا ہے۔ جب کہ ادلے کا بدلہ مسائل کو سنگینی اور طوالت دیتا ہے۔ تاہم کچھ لوگ یہ دلائل دیں گے کہ معاف کر دینے کی پالیسی دوسروں کو مزید غلط کام کرنے کی طرف حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ لیکن یہ بہت کمزور مفروضہ ہے۔ اور قدرت کے قانون سے نسبت نہیں رکھتا۔

نفسیاتی مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر انسان پیدائشی طور پر انا (Ego) اور ضمیر (Conscience) کا مالک ہوتا ہے۔ اگر آپ ادلے کا بدلہ والی پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ تو یہ پالیسی فریق مخالف کی انا کو ہوا دے گی اور اگر آپ عفو درگزر کی پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ تو یہ پالیسی فریق مخالف کے ضمیر کو متوجہ کرے گی۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ضمیر تنازعات کو دور کرنے کے لیے مثبت کردار ادا کرتا ہے۔

معاف کرنا اور انتقام لینا دو مختلف کلچر ہیں۔ معاف کرنے کا کلچر ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینے میں مدد کرتا ہے۔ جہاں مثبت اقدار پھلتی پھولتی ہیں، باہمی تعاون کا جذبہ غالب آتا ہے اور مختلف انسانی طبقات اجتماعیت اختیار کرتے ہوئے اپنے آپ کو ایک پر امن معاشرے میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ کینہ پروری کے نتائج بالکل الٹ ہوتے ہیں۔ انتقامی کلچر بے اعتباری کا ماحول پیدا کرتا ہے۔ جس میں ہر کوئی دوسرے کو اپنا حریف سمجھتا ہے اور اس طرح صحت مند معاشرے قائم کرنے کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔

جلد یا بدیر ہر کوئی انسانی فطرت کے تحت مجبور ہوتا ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی غلطی کرے۔

اس لیے یہ مشہور کہاوت ذہن میں بڑنی چاہیے کہ غلطی کرنا انسان کا خاصا ہے۔ جب کہ انتقام لینے سے مراد یہ ہے کہ صرف ایک غلطی پر اکتفا نہ کرنا بلکہ غلطی در غلطی کرتے چلے جانا۔ دوسری طرف معاف کرنے سے مراد ہے برائی کو نیکی سے بدل دینا۔ اس لیے یہ تسلیم کر لینا بہتر ہے۔ کہ اگر غلطی کرنا انسان کا خاصا ہے تو معاف کرنا اس سے بھی بڑا انسانی وصف ہے۔ یقینی طور پر یہ ہی وہ تصور ہے جو ایک مشہور کہاوت میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ غلطی کرنا انسان کا خاصا ہے اور معاف کرنا خدا کا خاصا ہے۔



معاشرے میں رہنا

اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ اس مقام پر نہیں ہیں کہ جہاں آپ معاشرے میں خیر تقسیم کرنے کا باعث بنیں تو کم از کم آپ دوسروں کے لیے ایک بے ضرر شخص (No problem person) تو بن سکتے ہیں۔

معاشرے میں باعزت زندگی گزارنے کے لیے ایک ضروری شرط یہ ہے کہ آپ اس طرح بنیں کہ دوسروں کو آپ سے فائدہ ہو، آپ دوسروں کو آسانیاں فراہم کرنے والے ہوں یا کم از کم دوسرے افراد معاشرے کے لیے آپ ایک بے ضرر انسان ہوں۔ ان دو طریقوں کے علاوہ آپ کے پاس معاشرے میں باعزت زندگی گزارنے کا کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔ وہ لوگ جو خیال کرتے ہیں کہ ایک تیسرا طریقہ بھی ہے وہ نہ صرف معاشرے کے لیے بلکہ اپنے لیے مسائل کھڑے کرتے ہیں۔

سماج کی بنیاد ہمیشہ دینے اور لینے (Give and take) کے اصول پر ہوتی ہے۔ اگر آپ سماج میں خیر و بھلائی (Positivity) بانٹ رہے ہیں تو سماج آپ کو عزت دے گا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ اس مقام پر نہیں ہیں کہ جہاں آپ معاشرے میں خیر تقسیم کرنے کا باعث بنیں تو کم از کم آپ دوسروں کے لیے ایک بے ضرر شخص تو بن سکتے ہیں۔

اگر آپ دیگر افراد معاشرہ کو آسانیاں دے رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ

معاشرے کی ترقی میں مدد کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر آپ صرف بے ضرر انسان بن جاتے ہیں۔ تو بھی آپ معاشرے میں رکاوٹیں نہ کھڑی کر کے آپ اپنا سماجی کردار ادا کر رہے ہیں۔ پہلی حالت میں آپ براہ راست معاشرے کی ترقی میں مدد کرتے ہیں۔ جبکہ دوسری حالت میں آپ بلاواستہ یہ کام کر رہے ہوتے ہیں۔

لیکن وہ لوگ جو معاشرے کو کچھ نہ دینے والے اور مضرت رساں (Problem creator) بھی ہوں وہ صرف معاشرے پر بوجھ ہوتے ہیں۔ رسمی قانون کے مطابق یہ لوگ مجرم نہیں ہیں۔ لیکن انسانی مراسم اخلاق (Etiquette of Human Life) کے حوالے سے ان کا طرز عمل ضرور منفی ہے۔



اپنے آپ کو روک رکھنے کا کلچر

روزے کا بڑا فائدہ یہ ہے یہ مرد و عورت کو اپنی خواہشات کی پیروی کرنے سے روکتا ہے اور دانشمندی کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔
یہ ہی صوم کی روح ہے۔

فاسٹنگ (Fasting) مختلف شکلوں میں تقریباً ہر مذہب کا حصہ ہے۔ اسلام میں اس کو روزہ کہتے ہیں۔ عربی میں اس کا مترادف صوم ہے۔ صوم کا لغوی معنی پرہیز ہے جو کے کچھ کرنے سے رکنا ہے۔ ہجری کیلنڈر کا نواں مہینہ رمضان خاص طور پر روزے کے لیے ہے ماہ رمضان میں ہر مسلمان پر روزہ فرض ہے۔ ماسوائے اُن مسلمانوں کے جن کو کسی شرعی عذر کی وجہ سے رخصت ملی ہو۔ ہر انسان میں دو خوبیاں قابل غور ہیں۔ ایک خواہش دوسری عقل (Reason)۔ ہر معاملے میں انسان کو فیصلہ کرنا پڑتا ہے آیا کہ وہ اپنی خواہش کی پیروی کرے یا اپنی عقل کی۔ روزے کا بڑا فائدہ یہ ہے یہ مرد و عورت کو اپنی خواہشات کی پیروی کرنے سے روکتا ہے اور دانشمندی کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ یہ ہی صوم کی روح ہے۔

پیغمبر اسلام نے فرمایا جو روزہ رکھے اس کو گالی گلوچ والی زبان استعمال نہیں کرنی

چاہیے اگر کوئی گالی دے تو روزے دار صرف یہ کہے کہ میں روزے سے ہوں۔ روایتی طور پر روزہ کھانے پینے کو ترک کرنے کا نام ہیں۔ لیکن اصل روزے کی روح یہ ہے کہ منفی سوچ اور بری زبان سے بچا جائے۔ خود پر کنٹرول نہ صرف منفی کاموں سے دور رکھتا ہے بلکہ اس کی انسانی اخلاقیات میں بڑی اہمیت ہے۔ کیونکہ ایک آدمی کو اپنی زندگی میں پچاس فیصد سے زائد مواقع پر ایکشن لینے سے باز رہنا چاہیے اور پچاس فیصد سے کم مواقع پر ایکشن لینا چاہیے۔ یہ انفرادی اور اجتماعی طور پر کامیابی حاصل کرنے کا فارمولا ہے۔

خود پر کنٹرول سماجی اخلاقیات کا لازمی جز ہے۔ اگر آپ تنہا کسی جزیرے پر رہتے ہوں۔ تو اپنے آپ کو کنٹرول کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دوسروں کی عدم موجودگی آپ کو اجازت دیتی ہے کہ آپ جو چاہیں کریں۔ تاہم جب آپ اجتماعی زندگی گزار رہے ہوں۔ تو آپ کو دوسروں کی آزادی کا خیال رکھنا پڑے گا۔ یہ ہی وہ طریقہ ہے جو ہر شخص اُس وقت اختیار کرتا ہے جب وہ اپنی کارسٹک پر چلا رہا ہو۔ وہ اپنی گاڑی کو دائیں طرف یا بائیں طرف (ٹریفک کے قوانین کے مطابق) رکھتا ہے تاکہ دوسری گاڑیوں کو راستہ ملے اور وہ اپنا سفر بغیر کسی حادثہ کے جاری رکھ سکے۔ یہ طریقہ کسی بھی انسان کی تمام زندگی کے لیے قابل عمل ہے۔ اور یہ قدرتی طور پر اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ دوسروں کو اپنی زندگی گزارنے کا موقع دیتا ہے۔

خود پر کنٹرول ایک باہمی تعاون کی قسم ہے۔ جب ایک شخص ضبط نفس (Self control) پر دسترس حاصل کر لیتا ہے۔ تو اس عمل کے بہت دور رس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس طریق سے وہ معاشرے میں خود کو کنٹرول کرنے کے رجحان کو فروغ دیتا ہے۔

اور دوسروں کو اپنے حسن سلوک سے اپنے نقش قدم پر چلنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس طرح سیلف کنٹرول کا عمل ایک بہتر معاشرہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ جب کہ لوگوں کا خود پر کنٹرول نہ ہونا بد امنی کی راہ دیکھتا ہے۔ اس طرح ضبط نفس فرد واحد کی شخصیت میں تعمیری سوچ کا ذریعہ ہے۔ یہ طریق زندگی دوسروں کو غیر ضروری مسائل سے بچاتا ہے۔

غور و فکر ضبط نفس (Self control) پر عبور حاصل کرنے کی طرف پہلے قدم ہے۔ جب ایک شخص ضبط نفس کے راہ اختیار کرتا ہے تو اُس کو سب سے پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ اُسے کس

راستے پر چلنا ہے۔ وہ گہری سوچ بچار کے بعد ہی اپنے لائحہ عمل کو تشکیل دے سکتا ہے۔ اس طریقے سے بسر ہوئی زندگی تخلیقی صلاحیت سے لبریز ہوگی۔ مزید ضبط نفس عقل دوانش کو بھی فروغ دینے اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ اور ایک انسان کو دانشور بناتا ہے۔

اسلام میں روزہ ایک عبادت ہے۔ اور عبادت صرف اللہ کے لیے ہوتی ہے۔ تاہم روزہ ایک ایسی منفرد عبادت ہے جو ایک ہی وقت میں خالق اور مخلوق دونوں کے لیے ہوتی ہے۔ اگر روزے کو اُس کی صحیح روح کے ساتھ رکھا جائے تو یہ سراپا اخلاص ہے۔ اور یہ روزے دار کو صالح اور ذمہ دار شخص بنا دیتا ہے۔۔



اجنبیوں سے دوستی

دوسروں کے لیے اپنے دل میں سچا پیارا پیدا کیجیے وہ بھی بدلے میں آپ کو سچی الفت دیں گے۔ عام طور پر لوگ اپنے ارکانِ خاندان اور کچھ دوستوں تک محدود ہوتے ہیں۔ وہ اجنبیوں کے ساتھ گھلنا ملنا پسند نہیں کرتے۔ وہ اجنبیوں کو غیر فرض کرتے ہیں۔ اجنبیوں کو غیر سمجھنا ایک مفروضہ (Supposition) ہے اور اکثر مفروضے تو بے بنیاد ہوتے ہیں۔ تجربات گواہی دیتے ہیں کہ اجنبیوں سے دوستانہ مراسم قائم کرنا سو فیصد ممکن ہے۔

سوامی رام تیرتھ (1873-1906) نے اُنیسویں صدی کے آخری عشرے میں امریکہ جانے کا پروگرام بنایا۔ جب کہ اُن کے پاس اپنے سفری اخراجات برداشت کرنے کے لیے معقول رقم تھی نہ ہی اُن کا کوئی بھارتی دوست تھا جو اُن کو امریکہ کی سرزمین پر خوش آمدید کہتا۔ ایک طویل بحری سفر کے بعد، وہ دوسرے مسافروں کے ہمراہ امریکی بندرگاہ پر اترے، بہت سے امریکی اپنے رشتے داروں اور دوستوں کو لینے کے لیے بندرگاہ پر آئے تھے لیکن سوامی رام تیرتھ ایک کونے میں تنہا چہل قدمی کر رہا تھا کیونکہ اُنھیں کو کوئی لینے نہیں آیا تھا۔ ایک امریکی یہ دیکھ کر اُن کے قریب آیا۔ اور پوچھا: ”کیا امریکہ میں آپ کا کوئی دوست ہے؟“ سوامی تیرتھ نے کہا: ”جی ہاں، میرا ایک دوست ہے اور وہ میرے سامنے کھڑا ہے“ یہ کہتے ہوئے وہ امریکی سے بغلگیر

ہو گئے۔ امریکی بہت متاثر ہوا، چونکہ یہ رویہ اُس کے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔ اور پھر امریکی نے بے ساختہ کہا: ”جی ہاں، میں آپ کا دوست ہوں“ پھر وہ سوامی جی کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گیا۔ اور سوامی رام تیر تھ اُس وقت تک امریکی کے مہمان رہے جب تک ان کا قیام امریکہ میں رہا۔ یہ مثال ایک اہم سبق دیتی ہے۔ کہ کوئی بھی شخص آپ کے لیے اجنبی نہیں ہے۔ ہر کوئی آپ کا ممکنہ دوست (Potential Friend) ہے۔ صرف دوستانہ طریقہ سے ملیں اور دوسروں کو اپنے بھائی اور بہنوں کی طرح قبول کریں۔ اگر آپ مخلصانہ طور پر یہ دوستانہ رویہ اختیار کریں گے۔ تو آپ ہر جگہ اپنے دوست پائیں گے اور کوئی بھی آپ کے لیے اجنبی نہیں ہوگا۔

حقیقت یہ ہے تمام انسانیت مشترکہ طور پر حضرت آدم اور اماں حوا کی اولاد ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ساری دنیا ایک خاندان ہے۔ ہر شخص دوسرے کے ساتھ اس طرح کا تعلق رکھتا ہے جیسے کہ خاندان میں ایک فرد دوسرے فرد کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ یہ صرف ذہنی فاصلہ ہے جو آپ کو اجنبی بناتا ہے۔ اگر آپ فاصلوں کو مٹادیں۔ تو قدرتی رشتہ چھا جائے گا۔ اور تمام مرد و عورت آپ کے لیے حقیقی بھائی بہن کی طرح ہوں گے۔ دوستی کرنے کا نسخہ بہت ہی سادہ ہے۔ اگر آپ دوسرے کے سچے دوست ہیں۔ تو آپ آسانی سے پیشن گوئی کر سکتے ہیں کہ وہ بھی آپ کے دوست ہیں۔ دوسروں کے لیے اپنے دل میں سچا پیار پیدا کیجیے وہ بھی بدلے میں آپ کو سچا پیار دیں گے۔

کسی فلسفی نے بالکل درست کہا ہے کہ انسان ہر وقت اپنے احساسات کی شعاعیں خارج کرتا رہتا ہے۔ اگر آپ ہمدرد انسان ہیں تو دوسروں کے لیے ہمدردی کے احساسات آپ ہی سے پھوٹیں گے۔ دوسرے آپ کے ہمدردانہ احساسات کو جذب کرنے پر مجبور ہوں گے۔ اگر آپ دوسرے کے لیے محبت کے جذبات رکھتے ہوں پھر آپ سے محبت کے پھول کھلیں گی اور لوگ لامحالہ اُن کی خوشبو کا خیر مقدم کریں گے۔ یہ قانون فطرت ہے۔ اور فطرت کا قانون ہر صورت حال میں بغیر کوئی غلطی کیے کام کرتا ہے۔ آپ مثبت رد عمل پائیں گے جب آپ مثبت رویہ کا انعکاس (Radiat) کریں گے۔ اور منفی رد عمل پائیں گے جب آپ منفی احساسات کا انعکاس کریں گے۔

اس معاملے میں صرف ایک شرط ہے کہ آپ بے غرض انسان بن کر رہیں۔ مثبت رویہ بے غرض جذبہ کے ساتھ مل کر ہمیشہ اچھے نتائج لاتا ہے۔ کیونکہ یہ بے غرضی ہے جو آپ کے رویے کو اخلاص بخشتی ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ خود غرض انسان ہیں۔ پھر آپ کا اخلاق ایک سیلز مین والا ہوگا جو مثبت اثرات نہیں رکھتا۔

کامیابی کا فارمولا بہت ہی سادہ ہے۔ اپنی فطرت کی پیروی کریں آپ کامیاب انسان ہوں گے۔ کسی فلسفی نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ ہر شخص ایک فرشتہ کی مانند پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اپنے ماحول سے منفی اثرات قبول کر کے وہ انسانیت سے کم تر ہو جاتا ہے۔ اپنی فطرت کی طرف واپس آئیں تاکہ آپ لوگوں کو قابل قبول ہوں۔

☆☆

دوسروں کو اشتعال نہ دلائیں تاکہ آپ دوسروں سے محفوظ رہیں

تشدد سے تشدد اور امن سے امن جنم لیتا ہے۔ یہ زندگی کا سادہ اور بہترین فارمولا ہے۔ سفید شیر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک خطرناک بڑے قد کا قنور اور گوشت خور درندہ ہے۔ لیکن اسی طرح کا ایک وجے نامی شیر دہلی کے چڑیا گھر میں ہے جو کہ اپنے شریفانہ رویے کی وجہ سے مشہور ہے۔ اور چڑیا گھر کی انتظامیہ کے مطابق اس کو کبھی بھی غصہ کی حالت میں نہیں دیکھا گیا ہے۔ تاہم تیس ستمبر 2014 کو لڑکوں کی ٹولی اس شیر کے پنجرے کے پاس آئی اور شور مچاتے ہوئے اُس پر پتھر پھینکنے لگی۔ حتیٰ کہ اُن میں سے ایک لڑکا لوہے کی باڑ (Iron Railing) عبور کر کے شیر کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ پھر بھی شیر تقریباً پندرہ منٹ تک بے حس و حرکت خاموش پڑا اُس لڑکے کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے اچانک لڑکے پر چھلانگ لگائی اور اس کو مار دیا اور پھر اُس کے مردہ جسم کو دور احاطے کے کونے میں پھینک دیا۔ یقینی طور بات ہے کہ

تماشا بیوں کے شیر پر مسلسل پتھر پھینکنے کے عمل نے اُس کو اتنا غصہ دلایا کہ اُس لڑکے پر حملہ کر دیا۔ یہ کہانی صرف شیر کی نہیں بلکہ انسانی زندگی کی بھی کہانی ہے۔ شیر یا کوئی اور جانور پیدائشی طور پر جارحیت پسند (Aggressive) نہیں ہیں، اپنی جبلت (By nature) کے لحاظ سے ہر جانور امن پسند ہے۔ جانور صرف اُس وقت حملہ آور ہوتے ہیں جب اُن کو اشتعال دلایا جاتا ہے یا وہ خطرہ محسوس کریں۔ حتیٰ کہ جب کسی حیوان کو تنگ کیا جاتا ہے تو اُن کا حملہ اُن کے غصہ کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے دفاع میں ہوتا ہے۔ لہذا جب تک اُن کو کسی خطرے کا اندیشہ نہیں ہوتا تب تک وہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے بے اعتنائی برتنا ہے۔ یہ بات انسان کے بارے میں بھی سچ ہے۔ انسان ایک معاشرتی جانور ہونے کے ناطے وہ تمام خواص رکھتا ہے جو جانوروں میں قدرتی طور پر موجود ہوتے ہیں۔ انسان بھی محض حملہ کرنے کے شوق میں کسی پر حملہ نہیں کرتا۔ بلکہ جب ایک آدمی کسی دوسرے آدمی پر حملہ آور ہوتا ہے تو دوسرے اُس کے جواب میں اپنا دفاع کرتا ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ اگر کسی شخص کو مشتعل نہ کیا جائے تو وہ پُر امن رہتا ہے۔ اس لیے اگر آپ اپنے آپ کو دوسروں کے تشدد سے محفوظ رکھنے میں سنجیدہ ہیں۔ تو اس اصول کو اپنائیں:

”کسی کو کبھی بھی مشتعل نہیں کرنا“۔

دوسرے الفاظ میں دوسروں کی عزت نفس کو مجروح کرنے سے باز رہیں۔ جو بھی اس اصول کے ساتھ خلوص دل سے عمل پیرا ہوگا وہ کبھی بھی دوسروں کے تشدد کی شکایت نہیں کرے گا کیونکہ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ تشدد سے تشدد اور امن سے امن جنم لیتا ہے۔ یہ زندگی کا سادہ اور بہترین کلیہ ہے۔



خود پسندی کی نہیں، بلکہ جگ پسندی

کی قیمت دینی پڑتی ہے

دوسرے لوگ جو آپ کے بارے میں جانتے ہیں اُس کو شہرت کہتے ہیں۔ آپ کی

اپنے بارے میں جو رائے ہے اُسے خود پسندی کہتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک امریکی مصنف لوئیس میک ماسٹر بوجالڈ (پیدائش 1949) اس نتیجے پر پہنچا کہ دوسرے لوگ جو آپ کے بارے میں جانتے ہیں اُس کو شہرت کہتے ہیں۔ اور آپ کا اپنی نظر میں جو مقام ہے اس کو خود پسندی کہتے ہیں۔ شہرت دوسرے لوگوں کی آپ کے بارے میں رائے ہے۔ یہ رائے (Opinion) کیسے بنتی ہے؟ یہ رائے آپ کی گفتگو کی بنیاد پر نہیں بلکہ آپ کے کاموں کی بنیاد پر بنتی ہے۔ شہرت آپ کی خارجی شخصیت کو پیش کرتی ہے۔ اپنی عزت کا احساس آپ کی خود اپنے بارے میں سوچ ہے۔ یہ دیکھے بغیر کہ دوسرے میرے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں اپنے بارے میں یہ خیال کرنا کہ میں یوں اور یوں ہوں یہ رویہ خود پسندی ہے۔

آپ کی شہرت ایک چیک کی مانند ہے جو کہ بینک سے کیش ہو سکتا ہے۔ بازار آپ کو آپ کی شہرت کے ذریعہ ہی جانتا ہے۔ نہ کہ آپ کی اپنے بارے میں جو رائے ہے اس کے ذریعہ سے۔ آپ اپنی خود خیالی کا چیک کیش نہیں کروا سکتے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ معاشرے میں آپ کی عزت ہو تو آپ کو اپنے اچھے کردار کے ذریعہ خود اپنی شہرت تخلیق کرنا ہوگی۔ آپ کی اپنی رائے یا خود پسندی دنیا میں کوئی مقام نہیں دے گی۔

کچھ لوگ اپنی اکڑ میں رہتے ہیں۔ اور ہمیشہ اپنی خوبیوں کے گن گاتے رہتے ہیں۔ لیکن خود ستائش (Self praising) صرف خود کو مطمئن کر سکتی ہے لوگ شیخیاں بگھارنے والے پر توجہ نہیں دیتے اگر آپ کسی خوبی کے ہونے کا دعویٰ کریں جب کہ وہ آپ کے پاس نہ ہو۔ تو آپ کا یہ عمل غیر حقیقی اور بے فائدہ ہوگا۔ نتیجتاً آپ دوسروں سے عزت حاصل کرنے میں ناکام ہوں گے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ہم میں سے ہر کوئی کسی خاص خوبی کے ساتھ اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر آپ اُس خوبی کو دریافت کر لیں۔ اور اُس پر توجہ دیتے ہوئے اُس کو استعمال میں لائیں۔ تو یہ آپ کے اور دوسروں کے اندر خدا کی شکرگزاری کا جذبہ پیدا کرے گی۔

☆☆

بھائیو اور بہنو!

روحانیت کا وہی شخص حاصل ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو بطور روحانی شخصیت کے پیش (Project) کرے، اور جو شخص یہ کر سکتا ہے وہی روحانی نتائج پیدا کرے گا۔

عظیم انڈین روحانی شخصیت سوامی ویوکیئندا کے گورو رام کریشن پارامہانس نے ایک دفعہ سوامی جی سے اس توقع کا اظہار کیا کہ: ”مجھے اُمید ہے کہ ایک دن تم امریکہ جا کر انڈین روحانیت کو متعارف کرواؤ گے،“ گرو کی اس خواہش نے سوامی ویوکیئندا کو تحریک دی۔ گرو کی آرزو اُن کے دل میں گھر کر گئی۔ 1893 میں اُن کو معلوم ہوا کہ مذاہب سے متعلق بین الاقوامی کانفرنس امریکہ کے شہر شکاگو میں منعقد ہو رہی ہے۔ انھوں نے اپنے گرو کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کا عزم کیا۔ پھر وہ اپنے ایک دوست کی مدد سے بذریعہ بحری جہاز امریکہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ اور ایک طویل سفر کے بعد شکاگو کی بندرگاہ پہنچ گئے۔ انھوں نے یہاں ایک امریکی کی مدد سے کانفرنس میں شرکت کے لیے دعوت نامہ جاری کروایا۔

کانفرنس کے دوران انھوں نے دیکھا کہ ہر مقرر حاضرین کو روایتی طریقہ سے یعنی خواتین و حضرات کہہ کر مخاطب کر رہا ہے۔ لیکن جب انھیں دعوت خطاب دی گئی تو وہ اسٹیج پر آئے اور حاضرین کو خواتین و حضرات کہنے کے بجائے میرے امریکی بہن بھائیو! کہہ کر مخاطب کیا اور پھر اپنا لیکچر دیا۔ اس طرح مخاطب کرنے کا طریقہ امریکیوں کے لیے انڈین روحانیت کا پہلا تعارف تھا۔ حاضرین کی طرف خواتین و حضرات کے بجائے میری بہنو اور میرے بھائیو! کہنے کے انداز کو بہت خراج تحسین پیش کیا گیا۔ اس اندازِ خطابت نے لوگوں کے دلوں کو چھولیا۔ اور سوامی جی نے ایک لمحے میں حاضرین کے دل جیت لیے۔

ہر کوئی اسی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ تمام انسان ایک ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لیے کسی بھی امریکی اور انڈین میں کوئی فرق نہیں ہو سکتا ہے۔ اور یہ قدرتی بات ہے کہ تمام انسان باہمی طور پر حقیقی بھائی بہن ہیں لہذا ہر مرد و عورت بھائی بہن کی محبت میں پروئے ہوئے ہیں۔ جب آپ کسی کو بھائی یا بہن کہہ کر مخاطب کرتے ہیں تو آپ زبردست نفسیاتی اثر ڈالتے ہیں۔ قدرت کے لحاظ سے یا خدا کے تخلیقی منصوبے کے مطابق ”ہم اور وہ“ یعنی بیگانہ پن کا

تصور غیر حقیقی ہے۔ اس لیے جب آپ کسی کو خواتین و حضرات کہہ کر مخاطب کرتے ہیں تو آپ اُن کے دل میں گھر کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب آپ لوگوں کو بہن اور بھائی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں تو آپ بیگانگی کی دیوار جو کہ آپ کے اور اُن کے درمیان کھڑی ہے اس کو ڈھا دیتے ہیں۔ یک دم فاصلے سمٹ جاتے ہیں۔ ہر کوئی آپ کے اپنے افراد خاندان کی طرح ہو جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک معجزہ ہے۔ لیکن یہ معجزہ اس وقت رونما ہوتا ہے جب آپ لوگوں کو زبانی طور بھائی بہن نہ کہیں بلکہ یہ بات آپ کے دل کی گہرائی سے آئے۔ زبانی جمع خرچ (lip service) کا رویہ منافقت کا رویہ ہے۔ جب کہ خلوص دل سے کہہ گئے الفاظ سننے والے کے دل میں اُتر جاتے ہیں۔ کیونکہ سچی روحانیت ہمیشہ دل سے آتی ہے۔ اس میں کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا ماسوائے مخاطب کو عزت و احترام سے بلانے کے۔ ایک بڑی مشہور کہاوت ہے کہ سخاوت گھر سے شروع ہوتی ہے۔ یہ بات روحانیت پر بھی ٹھیک بیٹھتی ہے۔ روحانیت کا وہی شخص حاصل ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو بطور روحانی شخص کے پیش (Project) کرے جو یہ کر سکتا ہے وہی روحانی نتائج پیدا کرے گا۔

اگر چہ روحانیت ایک داخلی چیز ہے تاہم یہ یقینی طور پر خارجی اظہار رکھتی ہے۔ یہ روحانی آدمی کو غیر روحانی آدمی سے قطعاً مختلف شخصیت بنا دیتی ہے۔ غیر روحانی آدمی کا قول اس کے فعل سے مطابقت نہیں کرے گا۔ جب کہ ایک سچا روحانی شخص کا لہجہ، اُس کی گفتگو، اس کا دوسروں کے ساتھ سلوک اس کے اخلاص کی تصدیق کرے گا۔

پھول قدرتی اور مصنوعی دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔ مصنوعی پھول بھی دیکھنے میں بالکل قدرتی لگتے ہیں۔ لیکن یہ خوشبو سے عاری ہوتے ہیں قدرتی پھول نہ صرف مصنوعی پھولوں کی طرح خوبصورت ہوتے ہیں بلکہ یہ اپنی خوشبو سے آپ کی سانسوں کو معطر بھی کرتے ہیں۔ یہ روحانیت کے لیے بھی سچ ہے۔ جھوٹی روحانیت مصنوعی پھولوں کی طرح ہے جب کہ سچی روحانیت قدرتی پھولوں کی طرح ہے۔ اول الذکر آپ کے اندر مطلوبہ تبدیلی نہیں لاتی، جب کہ موخر الذکر روحانیت نہ صرف آپ کی پوری شخصیت میں انقلاب لاسکتی ہے۔ بلکہ معاشرے میں

ایک بڑی انقلابی تبدیلی کا پیشہ خیمہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔



محبت ایک بہترین فارمولا ہے

قرآنی تعلیمات ”ہم اور وہ“ کے تصور کو زائل کرتی ہیں۔ قدرتی طور پر ہر کوئی آپ کا دوست ہے فرق یہ ہے کہ کچھ آپ کے حقیقی دوست ہوتے ہیں اور کچھ ممکنہ دوست ہوتے ہیں۔
سیمیٹک فیملی میں تین مذاہب یہودیت، عیسائیت اور اسلام ہیں۔ تاریخی لحاظ سے یہودیت پہلے، عیسائیت دوسرے اور اسلام تیسرے نمبر پر ہے۔ تاہم ایک تعلیم یعنی ”محبت“ تینوں مذاہب میں مشترک ہے۔

امریکی دورے کے دوران ایک چرچ کی انتظامیہ نے مجھے اسلام اور امن کے موضوع پر لیکچر دینے کی دعوت دی۔ لیکچر کے اختتام پر ایک امریکی اسکالر نے سوال پوچھا۔ کہ عیسائیت میں جیسے یہ اخلاقی تعلیم ہے کہ اپنے دشمن سے پیار کرو۔ کیا آپ ایسی تعلیم کا قرآن سے حوالہ دے سکتے ہیں؟

میں نے یہ کہتے ہوئے اثبات میں جواب دیا کہ حقیقت میں یہ تعلیم تینوں سیمیٹک مذاہب میں موجود ہے۔ مثال کے طور پر یہودیوں کی مقدس کتاب عہد نامہ قدیم میں لکھا ہے: ”نفرت نا اتفاقی پیدا کرتی ہے۔ لیکن محبت تمام ناخوشگوار باتوں کو نظر انداز کرتی ہے۔“

(Proverbs 12:10)

بائبل میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے ایک دفعہ فرمایا: ”تمہیں یہ بتایا گیا کہ تم اپنے ہمسائے سے محبت اور دشمن سے نفرت کرو، لیکن میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت کرو اور جو لوگ تم کو اذیت دیں ان کے لیے دعا کرو۔“ (متی 44-43:5)۔ پھر میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا اب مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ کو بتاؤں کہ اسلام اس بارے میں کیا کہتا ہے۔ قرآن پاک ارشاد فرماتا ہے: ”نیکی اور برائی برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو

جو اُس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا، (سورہ حم السجدہ آیت نمبر ۳۴)

قرآنی تعلیمات ”ہم اور وہ“ کے تصور کو زائل کرتی ہیں۔ قدرتی طور پر ہر کوئی آپ کا دوست ہے فرق یہ ہے کہ کچھ آپ کے حقیقی دوست ہوتے ہیں اور کچھ مکمل دوست ہوتے ہیں لہذا امکان کو حقیقت میں بدلنے کی کوشش کریں۔ دنیا میں بھائی چارے کو فروغ دینے کے لیے یہ بہترین لائحہ عمل تینوں مذاہب میں مشترک ہے۔

محبت سب سے اعلیٰ انسانی وصف ہے جہاں محبت ہے وہاں ہر چیز میں ہم آہنگی ہے اور جہاں نفرت ہے وہاں ہر طرح کا اندیشہ ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اختلاف فطرت کا لازمی حصہ ہے۔ اس لیے کسی نے یہ بالکل سچ کہا ہے: ”فطرت یکسانیت سے نفرت کرتی ہے۔“ اور قدرتی بات ہے جہاں یکسانیت نہیں ہوگی وہاں فرد اور معاشرے میں اختلاف نمودار ہوگا۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس اختلاف کو کیوں نکر دوڑ کیا جائے۔ اس کا جواب صرف اور صرف محبت ہے۔ اگر ایک مرد و عورت کے درمیان محبت ہے تو وہ دونوں باہمی ہم آہنگی سے ایک خاندان بن کر رہیں گے۔ محبت ہی اُن کے تمام مسائل کو دوستانہ طور پر حل کرنے کی ضمانت دیتی ہے۔ شاک آبزور کی مثال اس حقیقت کو درست طور پر واضح کرتی ہے۔ شاک آبزور ایک مشینی آلہ ہے جو کہ جھٹکوں کو برداشت کر کے اُن کی شدت کو کم کر دیتا ہے۔ جب ایک کار غیر ہموار راستے پر چلتی ہے۔ تو وہ تسلسل کے سے جھٹکے کھا رہی ہوتی ہے۔ اور ان جھٹکوں کی شدت گاڑی کے پہیوں پر ہوتی ہے۔ اگر شاک آبزور ان جھٹکوں کو نہ روکیں تو ان کی شدت کار میں سفر کرنے والوں کو متاثر کرے گی لیکن شاک آبزور ان جھٹکوں کو گاڑی کے پہیوں تک محدود کر دیتے ہیں۔ اسی طرح محبت بھی کسی کے دل میں شاک آبزور کی مانند ہے۔ اگر آپ دوسروں کے لیے محبت رکھتے ہیں تو آپ کو اپنے دل میں ایسے نفسیاتی شاک آبزور نصب کرنے پڑیں گے۔ جو دوسروں کی طرف سے پہنچنے والی تکلیف و پریشانی کے جھٹکوں کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہوں۔ ان نفسیاتی شاک آبزور کی وجہ سے آپ ہر طرح کی صورت حال میں پر سکون اور سلیم الطبع رہیں گے۔

”سب سے محبت کرو“ کے فارمولے میں یہ حکمت پوشیدہ ہے۔ کہ یہاں ہر شخص آپ کا محسن ہے۔ جب آپ اس حکمت سے بے خبر ہوتے ہیں، تب آپ سب کے لیے احترام و محبت کا کلچر اپنانے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ غور کریں ہم ایک متمدن معاشرے میں رہتے ہیں جہاں جو کچھ بھی ہمیں آسانیاں میسر ہیں وہ سب افراد معاشرے کی مرہون منت ہیں۔ متمدن معاشرے سے مراد ایک اخلاقی اور مادی طور پر ترقی یافتہ معاشرہ ہے جو کہ انسانیت کی مسلسل محنت کا ثمر ہے۔

مثال کے طور پر جب انسان نے زمین پر اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ تو انسانی معاشرت بالکل ابتدائی درجے پر تھی۔ پھر ہزاروں سال کی مشترکہ کوشش کی نتیجے میں ایک متمدن معاشرہ وجود میں آیا۔ جیسے انسان شروع میں صرف پیدل چل کر اپنا سفر طے کرتا تھا۔ پھر اس نے گھوڑے کو سدا ہایا اور اس پر سواری شروع کر دی۔ ایک طویل تجربے کے بعد وہ پہیہ ایجاد کرنے میں کامیاب ہو گیا جس کی وجہ سے کار میں سفر کرنا ممکن ہوا۔ بعد ازاں بھاپ کی طاقت دریافت ہو گئی جس کی وجہ سے بھاپ سے چلنے والے بحری جہاز اور ریل رواں دواں ہو گئی۔ پھر انسان نے جہاز بنا لیا جس نے ہوائی سفر کو ممکن کر دیا۔ اور اس طرح مزید ذرائع ابلاغ کی سہولتیں میسر آئیں۔ یہ سب کچھ ایک انسان کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ تمام انسانیت کی مشترکہ جدہ جہد کا پھل ہے۔

اس تاریخ کے پس منظر کی دریافت ”سب سے محبت کرو“ کے رجحان کو فروغ دیتی ہے۔ جب کہ اس تاریخی پس منظر سے لاعلمی نفرت کو جنم دیتی ہے۔

اس دنیا میں سب زیادہ حقیقت پسندانہ فارمولہ ”سب سے محبت کرو“ ہے سب سے غیر حقیقت پسندانہ بات ”سب سے نفرت کرو ہے“ اس لیے تینوں سیمپلک مذاہب ہمیں سب انسانوں سے محبت کرنے کا درس دیتے ہیں۔ بھلے کوئی ہمارا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔



بغیر سرحدوں کے دنیا

دنیا بغیر سرحدوں کے ممکن نہیں ہے لیکن دنیا بغیر نفسیاتی سرحدوں کے ہر خواہش مند

شخص کے لیے قابل حصول ہے۔

بغیر سرحدوں کے دنیا ایک ایسی جگہ ہے جس میں لوگ جہاں چاہیں رہیں، جہاں دل کرے کام کریں، جہاں من کرے شریک ہوں۔ کیونکہ دنیا سب کے لیے ہوگی۔ تمام عقل مند لوگ بغیر سرحدوں کی دنیا میں رہنے کا خوبصورت خواب آنکھوں میں بسائے بیٹھے ہیں۔ لیکن یہ خواب ایک خواب ہی ہے کیونکہ ان دانشوروں میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اس خواب کو حقیقت کا رنگ دے سکے۔ اپنے حوالے سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس خواب کو حقیقت کا روپ دیا ہے۔ کیونکہ میں عملی طور ہمیشہ بغیر سرحدوں کی دنیا میں رہتا ہوں میرے تجربے کے مطابق بغیر سرحدوں کی دنیا کا تصور ایک قابل حصول ہدف ہے۔

مختصراً عرض ہے کہ دنیا بغیر فزیکل بارڈر کے ممکن نہیں ہے لیکن دنیا بغیر سیکالوجیکل بارڈر کے ہر متمنی شخص کے لیے قابل حصول ہے۔ اس کے لیے کسی قسم کی خارجی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص اپنے فیصلہ کی بنیاد پر اس ریاست میں داخل ہو سکتا ہے۔

میں اپنے ذاتی تجربے کی روشنی میں اس کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔ پچھلے دنوں میں اپنے دو ہفتے کے دورے پر امریکہ نیویارک انرپورٹ پراٹرا، تو مجھے سے سیکورٹی چیکنگ کے دوران کہا گیا کہ میں اپنے جوتے اتاروں۔ میں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے جوتے اتارنا شروع کر دیئے۔ ابھی میں ایک ہی جوتا اتار پایا تھا کہ سیکورٹی آفیسر نے مسکراتے ہوئے کہا: ”کانی ہے، دوسرا جوتا اتارنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

مجھے ذرائع ابلاغ سے معلوم ہے کہ بھارت کی کسی نامور شخصیت کو اپنے دورے امریکہ کے دوران جب اسی طرح کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ تو انھیں سیکورٹی چیکنگ کی کارروائی ناگوار گزری، جس کی انھوں نے اخبارات کے ذریعہ شکایت کی۔ صورت حال یکساں تھی لیکن میں نے تعاون کیا اور انھوں نے شکایت کی۔ میرے اور ان کے رویے میں یہ فرق کیوں آیا۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ میں نے اپنے جوتے اتارنے کے عمل کو ڈسپلن کا حصہ جانا۔ جب کہ انھوں نے جوتے اتارنے کے عمل کو اپنی توہین سمجھا۔ یہ مثال ثابت کرتی ہے کہ بغیر سرحدوں کی دنیا کا ہدف خارجی دنیا کے بجائے انسان کی اپنی سوچ میں حاصل کیا جاسکتا ہے۔

اگر آپ نے اپنے اندر ایک آفاقی سوچ پیدا کر لی ہے تو آپ تمام مرد و عورت کو اپنے بھائیوں بہنوں کی طرح سمجھیں گے اور ساری دنیا کو اپنی دنیا جانیں گے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ نے پہلے ہی بغیر سرحدوں کی دنیا میں رہنے کے ہدف کو حاصل کر لیا ہے۔ پھر آپ ہر اُس واقعہ پر متوازن رہیں گے، جس پر عام طور دوسرے لوگ بگڑ جاتے ہیں، آپ ہر خوشگوار یا نا خوشگوار صورت حال کو اپنے خاندان کے مسائل کی طرح قبول کریں گے۔ بغیر سرحدوں کی دنیا صرف آپ سے عالم گیر فیملی کلچر کا مطالبہ کرتی ہے۔

ایک دفعہ میں اسپین کے شہر میڈرڈ کے ائیر پورٹ پر اُترا، مجھے یاد ہے کہ ایک عرب سیاح اسپین کی زبردست ترقی دیکھ کر اُن دنوں کو یاد کرنے لگا جب اسپین پر مسلمان حکمرانی کرتے تھے۔ اُس نے حسرت سے کہا ”کیا ہمارا ماضی کبھی لوٹ کر آئے گا“۔ لیکن جب میں نے جدید میڈرڈ کو دیکھا تو میرے احساسات مختلف تھے۔ میں نے اپنے سفر نامے میں اسپینش لوگوں کی ترقی کا اعتراف کیا۔ اور یہ دیکھا کہ جہاں مسلمانوں نے اپنے دور اقتدار میں اسپین کو روایتی ترقی دی، وہاں اسپینش لوگ نے جدید سائنسی معیار کے مطابق اسپین میں ترقی کو فروغ دیا۔

”ہر چیز ہر ایک کے لیے“ یہ قول عصر حاضر میں بطور ایک اصول کے قبول کر لیا گیا ہے۔ معمول کے حالات میں جب کوئی شخص کسی ملک کا ویزا اور پاسپورٹ حاصل کر لیتا ہے۔ تو پھر اُس ملک کے دروازے اُس کے لیے کھل جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ اُس ملک کو اپنا ملک سمجھے گا۔ اور خوشی خوشی اُس ملک کی قانونی کارروائی کو قبول کر لے گا۔

جدید دنیا میں قومیت کو وطن کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے۔ جس سے حب الوطنی کا تصور پیدا ہوا۔ لیکن اگر ہم اس ویژن کو وسیع کر دیں، اور انسان عالمی حب الوطنی کے جذبے کے تحت زندہ رہے۔ تو وہ تمام دنیا کو اپنا وطن سمجھے گا۔

ایسا لگتا ہے فزیکلی بغیر سرحدوں کے دنیا نا قابل حصول ہے، لیکن نفسیاتی سطح پر یا دوسرے الفاظ میں نان فزیکل سطح پر یہ یقینی طور پر قابل حصول ہے۔



کرپشن کو کیسے ختم کریں

روحانیت کا ایک پہلو یہ ہے کہ یہ جذبات کو کنٹرول کرتی ہے اور ذہنی سکون کا باعث بنتی ہے۔ کرپشن کے خاتمے کے لیے صالح افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ بات بغیر کسی تردد کے کہی جاسکتی ہے کہ روحانیت ہی صالح اشخاص پیدا کرتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ تشدد کا آغاز انسان کی سوچ سے ہوتا ہے۔ غور کریں یہ بات کرپشن کے لیے بھی درست ہے کرپشن کا آغاز بھی سوچ ہی سے ہوتا ہے۔ اگر ہم لوگوں کا سوچنے کا انداز بدل دیں، تو ہم بڑے اعتماد سے کہیں گے کہ ہم نے کم از کم پچاس فیصد کرپشن ختم کر دی ہے۔ دل و دماغ کی بہترین تبدیلی روحانیت ہے۔ یہ روحانیت ہی ہے جو ہمارے باطن کو روشن کرتی ہے۔ جب ایک جہاز پرواز کرتا ہے۔ تو یہ ہر چیز نیچے چھوڑ کر بلندی کے اُس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں سے وہ بغیر کسی رکاوٹ کے اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں ہو سکے۔ اسی طرح روحانیت بھی شخص کو ایک ایسے بلند مقام پر لے جاتی ہے جہاں وہ شخص ہر قسم کے منفی اثرات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

روحانیت کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی روحانیت، دوسری اطلاقی روحانیت۔

بنیادی طور پر روحانیت دنیاوی معاملات میں غیر مادہ پرستانہ سوچ کا نام ہے۔

سوچنے کے بھی دو طریقے ہیں۔ ایک کی بنیاد مادہ پرستانہ مفاد پر ہے اور دوسرے کی اساس غیر مادہ پرستانہ فکر پر ہے۔ روحانیت پسند انسان غیر مادہ پرستانہ اقدار (Non material value) کو اہمیت دیتا ہے۔ اور یہی طرز عمل کرپشن کو ختم کرتا ہے۔ کیونکہ کرپشن مفاد پرست سوچ سے وابستہ ہے۔ اطلاقی یا عملی روحانیت فرد کو اس قابل کرتی ہے کہ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی کو روحانی اقدار کے مطابق استوار کرے۔ اور وہ لوگ جو اپنے آپ کو روحانیت کے مطابق استوار کر لیتے ہیں۔ حقیقت میں وہ ہر طرح کی برائی سے دور رہنے کی صلاحیت حاصل کر لیتے ہیں۔ اطلاقی روحانیت افراد کو فرض شناس بناتی ہے۔ جب کہ مادیت پرستی انسان کو حقوق پرست بناتی ہے اور حقوق پرست انسان صرف یہ دیکھ سکتا ہے کہ اُس کے اپنے مفاد میں کیا ہے۔ جب کہ ایک فرد جو اپنے فرائض کا شعور رکھتا ہے۔ وہ دوسرے کے مفادات کا تحفظ کرتا ہے، اور

اس طرح کرتے ہوئے وہ کبھی بھی بے ایمانی اور بدعنوانی کی طرف مائل نہیں ہوتا۔

اب سب سے اہم سوال یہ ہے کہ لوگوں کو کیسے روحانیت ذہن نشین کروائی جائے؟ اس کے لیے یہ جان لیں کہ بنیادی طور پر روحانیت روایتی اور غیر روایتی تعلیم کا حصہ ہے۔ اور تعلیم سے مراد ہے کہ دماغ کی تربیت اس طرح کی جائے کہ اعلیٰ انسانی اقدار اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں۔ اس لیے ہمیں روحانیت کو معاشرے میں فروغ دینے کے لیے اخلاقی اقدار پر مبنی تعلیم کی ضرورت ہے خاص طور پر یہ تعلیم بچے کو اسکول کی سطح پر دی جائے۔ کیونکہ اگر ہم چاہتے ہیں، کہ روحانی معاشرہ تشکیل دیں، تو ہمیں روحانیت پر مبنی تعلیمی نظام اختیار کرنا چاہیے۔

روحانیت کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ ایک طرف یہ انسان کو نتائج کے لحاظ سے اپنے اعمال کا جائزہ لینا سیکھاتی ہے۔ دوسری طرف احساس ذمہ داری بھی دیتی ہے۔ روحانیت یافتہ شخص چیزوں کو اقدار کے حوالے سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ اس قابل ہوتا ہے کہ وہ چیزوں میں صحیح اور غلط کا فرق کر سکے۔ ایک کہاوت ہے: ”عقل مند آدمی وہ ہوتا ہے جو چیزوں کی اضافی اہمیت کو جانتا ہے۔“ روحانیت سے روشناس شخص عقل مند ہوتا ہے۔ کیونکہ اُس کا قول فعل قابل اعتبار ہوتا ہے۔ مختصر اتمام خوبیاں روحانی تربیت کا حاصل ہیں اس لیے مصلحین کا یہ فرض ہے کہ وہ لوگوں کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو وسعت دیتے ہوئے اُن کی اس طرح تربیت کریں کہ وہ فرض شناس بنیں کیونکہ فرض شناس آدمی کبھی بھی اپنے آپ کو منفی سرگرمیوں مثلاً کرپشن وغیرہ میں شامل نہیں کر سکتا۔ روحانیت کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ جذبات کو کنٹرول کرتی ہے اور ذہن کو سکون دیتی ہے۔ کیونکہ روحانی تعلیم سیکھنے کی بلند ترین شکل ہے۔ اس لیے روحانی تربیت یافتہ لوگ اپنے استدلال کی صلاحیت استعمال کرتے ہوئے اپنے جذبات کو کنٹرول کرنے کے ماہر ہوتے ہیں۔

ایک مادیت پرست انسان روحانی اہداف کے بجائے مادی مفادات میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اس لیے کرپشن مادہ پرست معاشرہ کا مسئلہ ہے۔ جب کہ روحانیت روحانی اشخاص کے لیے نعمت ہے۔ صرف روحانی تربیت یافتہ افراد ہی بدعنوانی سے پاک معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں۔ کیونکہ روحانیت اور کرپشن ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ اگر معاشرے کو کرپشن سے پاک ہونا ہے،

تو اُسے ارکان معاشرہ کو روحانی بنانا ہوگا۔ یہ کرپشن ختم کرنے کا واحد حل ہے۔ یہ درست آغاز ہے اور صرف درست آغاز ہی مطلوبہ منزل تک پہنچنا ممکن بناتا ہے۔



علاج بہدف کے لیے جامع لائحہ عمل

اصلاح کا آغاز ایسا ہو کہ وہ فرد واحد میں تبدیل لائے۔ آدمی کو اس طرح دعوت دی جائے کہ اُس کی فکر و خیال میں انقلاب برپا ہو جائے۔

انسانی جسم میں تقریباً پچیس ہزار جینز (Genes) ہیں۔ ان میں سے بہت سے جینز کینسر کی نشوونما اور اُس کی بقا میں معاون ہوتے ہیں۔ باقی جینز کو چھوڑ کر ان مذکورہ جینز کو ہدف بنا کر کینسر کا علاج کیا جاتا ہے۔ اس علاج میں جو ادویات استعمال ہوتی ہیں وہ خاص طور پر اُن خلیوں (Cells) کو ہدف بناتی ہیں جو کہ صرف کینسر کے پھیلنے کا ذریعہ بنتے ہیں اس طریقہ علاج میں ہدف بنائے ہوئے سیلز کا علاج کیا جاتا ہے۔ میڈیکل سائنس میں اس کو علاج بہدف (Targeted Therapy) کہا جاتا ہے۔

یہ ٹیکنیک انتہائی کامیاب ہے جب اسے انسانی معاشرے میں اصلاح کے لیے استعمال کیا جائے۔ اعضا جسمانی میں دماغ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے کیونکہ انسانی رویے، سلوک، برتاؤ اسی سے جنم لیتے ہیں۔ انسانی معاملات میں کوئی بھی بڑی تبدیلی اُس وقت آسکتی ہے جب گہرائی میں جا کر انسان کے سوچنے کے طریقہ میں اصلاح و ترمیم کی جائے۔ بائبل میں لکھا ہے کہ ”جیسا وہ سوچتا ہے ویسا ہی وہ ہوتا ہے۔“ (Proverbs 23-7)۔ کئی پہلوؤں سے انسانی زندگی میں علاج بہدف (Targeted Therapy) کا طریقہ مفید ہے۔ یہ انسانی جسم اور کردار دونوں کی صحت کے لیے مفید ہے۔

معاشرتی اصلاحات کی ضرورت پر بہت کچھ کہا گیا ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ مصلحین نے معاشرے کی اصلاح کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ مگر مصلحین کی کاوشیں ثمر بار نہ ہوئیں۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نقطہ آغاز ہی ٹھیک نہیں تھا۔ نقطہ آغاز ایسا ہونا چاہیے جو فرد واحد میں

تبدیلی لائے۔ اور آدمی کے دماغ یعنی غور و فکر کو ٹارگٹ بنا کر اس کے سوچنے سمجھنے میں انقلابی تبدیلی لائی جائے۔ یہ واحد اور درست طریقہ ہے جو معاشرے میں اصلاحات کو جاری رکھنے کے لیے کارآمد ہے۔ دوسرے طریقے بے اثر ثابت ہو چکے ہیں۔



سیاست اور روحانیت زندگی کے دو دائرے

اگر روحانیت ایک داخلی سائنس ہے تو سیاست ایک خارجی ڈسپلن ہے اور ہمیں دونوں کی ضرورت ہے مشہور و معروف انگریز شاعر رڈیارد کیپلینگ نے ایک دفعہ کہا:

East is East and West is West

And Never the Twin shall meet

ترجمہ: مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب ہے۔ اور یہ دونوں جڑوں کبھی نہیں ملیں گے۔ جہاں تک مشرق و مغرب کی برابری کا تعلق ہے مذکورہ قول درست ثابت نہیں ہوا ہے۔ لیکن روحانیت اور سیاست کے لحاظ سے یہ قول بالکل سچ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ روحانیت اور سیاست دو مکمل بااختیار ڈسپلن ہیں۔ دونوں پوری توجہ کے طلب گار ہیں۔ ان میں جو دوسرے کے دائرے میں دخل دے گا اُسے اپنی حیثیت ختم کرنے کی صورت میں بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی روحانی آدمی اگر سیاست کے میدان میں قدم رکھے گا تو اُسے اپنی دعوت سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ اور اس طرح ایک سیاسی آدمی اگر مذہب کے دائرے میں قدم رکھے گا تو اُسے اپنے سیاسی مفادات سے پیچھے ہٹنا ہوگا

لیکن یہ حقیقت ہے بہتر معاشرہ تشکیل دینے کے لیے دونوں کی ضرورت ہے۔ اگر روحانیت ایک داخلی سائنس ہے تو سیاست ایک خارجی ڈسپلن ہے اب سوال یہ ہے کہ کیسے ان دو اداروں کو اکٹھا کریں۔ اس کا جواب ایک فقرے میں ہے کہ اپنی اپنی شناخت برقرار رکھتے ہوئے، ہر ادارے کو دوسرے کی تکمیل کرنی چاہیے۔ اگر ہم گہرائی سے روحانیت اور سیاست کے موضوعات کا مطالعہ کریں۔ تو ہمیں پتا چلے گا کہ روحانیت خارجی طور پر طاقت رکھنے کا نہیں، بلکہ

داخلی طور خوبصورتی رکھنے کا نام ہے۔ جب کہ سیاست ایک ظاہری طاقت رکھتی ہے۔ اور جزوی طور داخلی خوبصورتی کی حامل ہوتی ہے۔ لیکن دو متضاد دائروں کے باوجود، ان دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا بہترین حل یہ ہے کہ شراکتی فارمولا اختیار کیا جائے۔ روحانی آدمی کو سیاست دانوں کے مشیر کی حیثیت سے کام کرنا چاہیے۔ اور سیاست دانوں کو روحانی آدمی کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ اس طرح باہمی تعاون کی حکمت عملی دونوں کے لیے فائدہ مند ہوگی۔ روحانی آدمی اپنے دائرے میں رہنے والا آدمی ہوتا ہے۔ سیاست دان اُسے دائرے سے نکال کر اُس کی مدد کر سکتا ہے۔ تاکہ یہ انسانی زندگی کے مزید تجربات سے باخبر ہو۔ اس طرح یہ ہی معاملہ سیاست دانوں کے لیے فائدہ مند ہے۔ قدرتی طور پر سیاست دان بعض اوقات حد سے زیادہ پر عزم و حریص ہو جاتے ہیں۔ اور یہ رویہ اُن کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس موڑ پر ایک روحانی آدمی قابل عمل مشورہ دے سکتا ہے۔ جس کی بنا پر سیاست دان اپنی حد سے تجاوز کردہ خواہشات کو لگام دے سکتے ہیں۔ اور زیادہ حقیقت پسند بن سکتے ہیں ہماری قدیم روایات میں، مذہبی راہنما بادشاہ کے مشیر تھے۔ اور بادشاہ اُن کے حامی تھے۔

ہمارے موجودہ معاشرے میں، ہمارے پاس مذہبی اور سیاسی افراد کثیر تعداد میں ہیں۔ لیکن ہم ان دو قسم کے افراد سے فائدہ اٹھانے میں ناکام ہیں۔ کیونکہ ہم باہمی اشتراک و تعاون کے طریقہ سے روشناس نہیں ہیں۔

ہمیں ضرورت ہے کہ ہم روایتی اور غیر روایتی دونوں قسم کے نظام تعلیم کو فروغ دیں۔ روایتی تعلیم، تعلیم یافتہ سیاست دان پیدا کر سکتی ہے۔ جو کہ ہمارے معاشرے کے لیے بہت اچھا ہے۔ دوسری طرف ارکان معاشرہ کو روحانی بنانے کے لیے غیر روایتی تعلیم سے فائدہ اٹھا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے ہمیں غیر روایتی تعلیم کو فروغ دینا ہوگا۔ اس غیر روایتی تعلیم کے اساتذہ روحانی گرو اور روحانی مرشدین ہوں۔ یہ گرو یا مرشد اپنے عمل، خطبات اور لٹریچر کے ذریعہ سے نئی نسل کو تعلیم دیں۔

میرے تجربے کے مطابق، روایتی اور غیر روایتی نظام تعلیم دونوں اپنا اپنا خود مختار ڈسپلن رکھتے ہیں۔ ان دونوں کے ادغام کی کوئی بھی کوشش مثبت نتائج نہیں دے سکتی۔ تاہم ہر ادارہ کسی

کے دائرہ عمل میں مداخلت کیے بغیر دوسرے کا مددگار بننے کی کوشش کر سکتا ہے۔ جزوی احساس کے ساتھ میں یہ کہہ سکتا ہوں ہمیں روحانیت سے لبریز سیاست دانوں کی، اور سیاسی شعور رکھنے والے روحانی افراد کی ضرورت ہے۔ کیونکہ دونوں اہم ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ ایک دوسرے کے دائرے میں مداخلت کرنے سے باز رہیں۔

روحانی آدمی کے پاس دوسروں کے دکھ بانٹنے اور انھیں آسانیاں پہنچانے کے لیے کافی کچھ ہوتا ہے۔ سیاست دانوں کے بارے میں بھی یہ ہی کچھ کہا جاسکتا ہے۔ کہ دوسروں کو آسانیاں فراہم کرنے کے لیے ان کے پاس بہت کچھ ہے۔ لیکن ہم میں چند ایک ہیں جو اس راستے پر چلتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگ عام طور پر دوسروں کے بارے میں شکایتی مزاج اپناتے ہیں۔ وہ شراکت اور مداخلت میں فرق نہیں جانتے اگر لوگوں میں سے کوئی دوسروں کے ساتھ تعاون و شراکت کرنا چاہتا ہے۔ تو اُسے دوسروں کی شکایت کرنے اور دوسروں کے کاموں میں مداخلت کرنے سے باز رہنا ہوگا۔ اس راستے کو اپنائے بغیر کوئی بھی معاشرے کا مفید رکن ثابت نہیں ہو سکتا۔



حصہ دوم

مظاہرے فطرت سے سیکھنا

خاموش شجر کی دل نشین گفتگو

نہ احتجاج، نہ شکایت، نہ کوئی مطالبہ، نہ گلیوں میں نعرے بازی، نہ اسٹیج پر دھواں دھار تقریریں۔

صرف اپنی قدرتی صلاحیتوں پر اعتماد اور خاموشی سے کام

دلی میں میرے گھر کے سامنے، ایک شجر سایہ دار ہے اور میری عادت ہے کہ میں اُس کی

چھاؤں میں بیٹھتا ہوں۔ میں نے اُس کا نام روحانی درخت رکھا ہے۔ اگرچہ یہ خاموش رہتا ہے

لیکن پھر بھی میرا معلم (Teacher) ہے۔ گذشتہ موسم سرما میں دگر درختوں کی طرح اس کے بھی

سارے پتے جھڑ گئے تھے۔ دیکھنے میں یہ بالکل خشک لکڑی جیسا ہو گیا تھا۔

میں کچھ متذبذب تھا آیا کہ یہ کبھی دوبارہ برگ و بار لائے گا یا نہیں۔ لیکن موسم بہار میں

تمام منظر ہی بدل گیا۔ میرا روحانی درخت ایک بار پھر ہرا بھرا ہو گیا۔ اس کا دوبارہ جنم ایک سبق

لیے ہوا تھا۔ حقیقت میں میرا روحانی درخت بولنے والے درخت میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اور اُس

نے مجھے بڑا اہم پیغام دیا۔ کہ ”او انسان! کسی بھی صورت حال میں نا اُمید نہ ہو۔ ہر خشک موسم کے

بعد اچھی فصل حاصل ہوتی ہے۔ نا اُمیدی کے دور کے بعد، نئی اُمید آتی ہے۔ ہر نا کامی کے پیچھے

ایک بڑی کامیابی پوشیدہ ہوتی ہے۔ اور ہر اندھیری رات کے بعد روشن صبح طلوع ہوتی ہے۔“

نہ احتجاج، نہ شکایت، نہ کوئی مطالبہ، نہ گلیوں میں نعرے بازی، نہ اسٹیج پر دھواں دھار

تقریریں۔ صرف اپنی قدرتی صلاحیتوں پر اعتماد اور خاموشی سے کام۔

میرے درخت نے اپنی جگہ کو نہیں چھوڑا، اُس نے کسی کے خلاف احتجاج نہیں کیا، اُس

نے کوئی مطالبہ نہیں کیا کہ دوسرے درختوں کو نئے ہرے بھرے پتے مل گئے۔ مجھے کچھ نہیں ملے

بلکہ اُس نے اپنی ہی جگہ رہتے ہوئے محنت شروع کر دی۔ یہ محنت کیا تھی۔ زمین سے خوراک اور سورج سے روشنی حاصل کرنا یہ اُس کی محنت تھی۔ اس اسکیم کی وجہ سے تمام قدرت اُس کی مدد کے لیے آگئی۔ اور کچھ ماہ کے بعد اُس نے اپنی گمشدہ ہریالی پالی۔ یہی وہ سبق ہے جو میں نے اپنے روحانی درخت سے حاصل کیا۔

نہ احتجاج، نہ شکایت، نہ کوئی مطالبہ، نہ گلیوں میں نعرے بازی، نہ اسٹیج پر دھواں دھار تقریریں۔ صرف اپنی قدرتی صلاحیتوں پر اعتماد اور خاموشی سے کام۔ اس لیے کبھی بھی ناگوار حالات سے مایوس نہ ہوں۔ بلکہ اپنے منصوبوں کو از سر نو تشکیل دینے کی کوشش کریں۔ اور پھر بہت جلد آپ یہ دریافت کر کے خوشی سے پھولے نہیں سمائیں گے کہ آپ نے اپنی زندگی کو دوبارہ حاصل کر لیا۔

درخت کیا ہے۔ درخت قدرت کی طرف سے ایک مثال ہے۔ قدرت بذریعہ درخت اپنی حکمت عملی کے بارے میں بتاتی ہے کہ ہر جاڑے کے بعد موسم بہار آتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اپنے آپ کی دریافت کی جائے اور اپنی قابلیتوں کو بیدار کیا جائے۔ اپنے ارد گرد مواقع تلاش کریں اور خاموشی سے اُن کو استعمال کریں۔

میرا روحانی درخت نہ شور شرابہ، نہ مسائل اور نہ کوئی ناپسندیدہ صورت کو پیدا کرتا ہے۔ یہی ہرے بھرے درختوں کے ہرے بھرے رہنے کا راز ہے۔ اسی طرح یہ انسانی زندگی کا بھی راز ہے۔ آپ درخت کا طریقہ اختیار کریں، آپ معاشرے کے اچھے رکن بن جائیں گے۔ جیسا کہ درخت باغ کا ایک اچھا رکن ہوتا ہے۔

مزید میرے روحانی درخت نے کبھی مجھے سے کوئی چیز نہیں مانگی۔ اُس نے کبھی کوئی بل میرے آفس نہیں بھیجا ہے۔ حالانکہ وہ مجھے خوشنما منظر، گہرا سایہ، دل پسند ہریالی، خالص آکسیجن اور خوبصورت پھول وغیرہ دیتا ہے۔ مزید اُس کی شاخیں پرندوں کے لیے چھتری کا کام دیتی ہیں۔ جس کی وجہ سے میں اُن پرندوں کے نعموں سے محظوظ ہوتا ہوں۔ میرے روحانی درخت کا یہ ہی طریقہ ہے۔ وہ مجھے خاموشی سے پیغام دیتا ہے کہ انسان! اگر تو میرا طریقہ اختیار کرے گا تو کائنات کے باغ میں ایک خوبصورت درخت کی طرح اپنی جگہ بنا لے گا۔

روحانی درخت نے مجھے روحانیت کا بہترین تعارف کروایا۔ کہ اگر تم ہموار زمین کی طرح زندگی گزارو گے تو پیچیدہ دنیا کو اپنے لیے ہموار پاؤ گے۔ تمہارا مقدر تمہارے ہاتھ ہے۔ دوسروں کو اجازت نہ دو کہ وہ تمہارے مقدر کا فیصلہ کریں۔ اپنے مواقع کو استعمال کرو، خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرو، اس طریقہ سے بہت جلد آپ دوسروں کی شکایت کرنا چھوڑ دیں گے۔ میرے خیال میں ہر درخت ایک مجسم روحانیت ہے۔ بلکہ یوں کہیں کہ یہ روحانیت کی خاموش ڈکشنری ہے۔ اس لیے درخت کو بطور اپنا ٹیچر قبول کیجیے۔ درخت ایک بہت اچھا استاد ہے جو ہر طالب علم کو ہر وقت دستیاب ہے۔ تاہم درخت سے سبق سیکھنے کے لیے صرف ایک شرط ہے۔ کہ انسان کو خاموش زبان سننے کا ملکہ ہونا چاہیے۔



اللہ کی دریافت

انسان جو دریافت کر سکتا ہے اُس میں سب سے بڑی دریافت خدا کی دریافت ہے سورج زمین سے بارہ ہزار گنا بڑا، اور نو کروڑ تیس لاکھ، چار ہزار میل دور ہے۔ اس طویل ترین فاصلہ کے باوجود، سورج کی کافی روشنی اور حرارت ہم تک پہنچتی ہے۔ کائنات کے معیار کے مطابق سورج دوسروں ستاروں کے مقابلے میں چھوٹا ستارہ ہے؛ صرف نزدیک ہونے کی وجہ سے یہ ہم کو بڑا نظر آتا ہے۔ کائنات میں بہت سے ستارے سورج کے مقابلے میں زیادہ بڑے اور زیادہ روشن ہیں۔ اور یہ کائنات میں زیادہ حرارت اور روشنی کے ساتھ بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ اربوں سالوں سے چمک رہے ہیں۔ لیکن اُن کی تھرمل انرجی میں کسی قسم کی کمی ظاہر نہیں ہوئی ہے۔ یہ ستارے اتنی کثیر مقدار میں کیسے انرجی پیدا کرتے ہیں۔ آسٹروفیزسٹ ہنز بیٹھ نے اس سوال کی کھوج میں کئی سال صرف کیے۔ آخر کار اُس نے دریافت کر لیا کہ کاربن سائیکل میں اس سوال کا جواب ہے۔ 1967 میں اُنھیں اس شعبہ میں تحقیق کی وجہ سے نوبل انعام دیا گیا۔ ہنز بیٹھ کے لیے وہ دن انتہائی لطف و مسرت کے تھے جب وہ اپنی عظیم سائنسی دریافت کے لیے تحقیق کر رہا تھے۔ اُس کی بیوی کہتی ہے کہ یہ دریافت اُس وقت ہوئی جب وہ

اپنے شوہر کے ساتھ نیو میکسیکو کے ایک صحرا میں تھی۔ یہ رات کا وقت تھا اور ستارے اپنی چمک صحرا میں منعکس کر رہے تھے۔ اُس نے حیرت کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھا، اور اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلا ”اے میرے خدا یا! یہ ستارے کیسے چمک رہے ہیں“ اس کے شوہر نے کہا: ”کیا تم جانتی ہے کہ تم اُس شخص کے ساتھ کھڑی ہو جو یہ جانتا ہے کہ یہ ستارے کیسے چمک رہے ہیں۔“

ہنز بیچھ کی دریافت سوال کا جزوی حصہ ہے۔ وہ معاملے کی جڑ تک نہیں پہنچا تھا۔ اُس کی کاربن سائیکل کی دریافت نے ایک اور سوال کو جنم دے دیا تھا۔ کہ یہ کاربن سائیکل ستاروں میں کیسے متحرک ہوا؟ خدا پر پختہ یقین رکھنے والا شخص اس

سوال کا جواب اللہ کی شکل میں دریافت کرتا ہے۔ اللہ ہی اس کائنات کو بنانے والا اور قائم رکھنے والا ہے۔ اللہ ہی ہے جس نے اپنی جادوئی طاقت ستاروں کو دی۔ انسانی عقل یہ دیکھ حیران رہ جاتی ہے کہ ایک ہی وقت میں اور مکمل ہم آہنگی کے ساتھ بے شمار تیز رفتار ستارے اور سیارے اپنے اپنے مدار میں بغیر ٹکراؤ کے محوسفر ہیں۔ کیا یہ حقیقت اس طرف اشارہ نہیں کرتی ہے کہ اس سارے نظام کی پشت پر ایک ناظم بھی ہے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ کاربن سائیکل کی چھوٹی سی دریافت نے سائنس دان کو بے ساختہ اپنے احساسات کا اظہار کرنے پر مجبور کر دیا تھا حالانکہ یہ اُس وقت ہونا چاہیے تھا جب وہ خدا کو دریافت کر لیتا۔ انسان جو دریافت کر سکتا ہے اُس میں سب سے بڑی دریافت خدا کی دریافت ہے جو حقیقت میں خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ اپنی دریافت پر اطمینان و مسرت محسوس کرتے ہیں۔ اور اُن کے یہ جذبات اتنے بے قابو ہوتے ہیں کہ وہ اس کا اظہار دوسروں سے نہیں کر سکتے۔ اگر آپ کوئی مسرت و اطمینان کی علامت نہیں پاتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ابھی خدا کی دریافت ہونا باقی ہے۔

قدرت اس موضوع پر خاموش نہیں ہے وہ اپنے خالق یعنی خدا کے بارے میں بتاتی ہے۔



خدا کا ثبوت

یہ ایک کھلی حقیقت ہے جہاں ابتدا ہوگئی وہاں ابتدا کرنے والا بھی ہوگا۔ کسی واقعہ کا آغاز خود اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی آغاز کرنے والا بھی ہے

امریکن نوبل انعام یافتہ ماہر عالم طبیعیات چارلس ٹاؤنز (1915-2015) اپنے ایک مضمون بعنوان ”ایک عالم طبیعیات کا سائنس اور خدا پر یقین“ انڈین ٹائمز میں مورخہ 31 جولائی 2015 کو شائع ہوا جس میں انھوں نے بطور ایک مبصر کے کائنات اور مذہب پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ یہ کائنات غیر معمولی طور پر ایک اعلیٰ ذہانت کا شاہکار ہے۔ اس پر زندگی ممکن بنانے کے لیے خصوصی فزیکل قوانین ہیں۔ اس لیے میں یہ کہوں گا کہ یہ کائنات بہت ہی خاص ہے۔ اسے بڑی کمال منصوبہ بندی سے بنایا گیا ہے۔ کوئی اس حقیقت کو کیسے رد کر سکتا ہے۔؟ لہذا بنا کسی شک کے یہ خالق کی روحانی دنیا ہے؛ بہت سے لوگ اس سائنس کی سمجھ نہیں رکھتے۔ جیسے مذہب ایمان کا تقاضا کرتا ہے۔ اس طرح سائنس بھی بہت سے مفروضوں کا تقاضہ کرتی ہے۔ اس وجہ سے ہم بہت سے مفروضے تشکیل دیتے ہیں۔ ہم یقین کرتے ہیں کہ فزکس کے قوانین قابل اعتماد ہیں۔ یہ ایمان کی ایک قسم ہے۔ میں اس پر پورا یقین رکھتا ہوں کہ کائنات میں روحانیت موجود ہے۔ خدا کے وجود کو واضح کرنا مشکل ہے۔ لیکن میں اُس کی موجودگی کو ہر جگہ محسوس کرتا ہوں۔ لوگ سوال کرتے ہیں کہ اگر کائنات کو خدا نے تخلیق کیا ہے تو خدا کو کس نے تخلیق کیا ہے۔ اس لیے شروعات کے حوالے سے ہمیشہ ابہام رہا ہے۔“

بہت سے لوگ اس بات کو تسلیم کریں گے کہ ہماری کائنات کو بڑی اعلیٰ ذہانت کے ساتھ ڈیزائن کیا گیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے اس کائنات کی شروعات ہوں۔ کیونکہ ایک بامعنی کائنات کا وجود ناقابل رد حقیقت ہے۔ کچھ لوگ اس کی شروعات پر شک کرتے ہیں۔ اس کی ابتدا کیسے ہوئی اور کون اس کا آغاز کرنے والا ہے۔ تاہم جب ان سوالوں کو باریک بینی سے دیکھا جائے تو یہ سوال غیر منطقی لگتے ہیں۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے جہاں کسی کام کا آغاز ہوگا، وہاں آغاز کرنے والا بھی لازمی ہوگا۔ کسی واقعہ کا ظہور خود اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ واقعہ کو ظہور میں لانے والا بھی کوئی ہے۔ اگر ہم ابتدا پر یقین رکھنے کے لیے مجبور ہیں پھر ہمیں اسی طرح کی مجبوری یہ بھی

ہے کہ کسی ابتدا کرنے والے پر یقین کریں۔

ہماری تمام معلومات اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ایک دنیا ہم سے باہر موجود ہے۔ جب ہم دنیا کی موجودگی کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ پھر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ ہم یہ بھی مانیں کہ اس دنیا کی ابتدا بھی ہے۔ چونکہ کوئی بھی آغاز، آغاز کرنے والے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ہم مجبور ہیں آغاز کرنے والے کی موجودگی پر یقین کریں۔۔



کہکشاں اپنے عظیم خالق کے بارے میں بتاتی ہے

سچ میں خالق بہت عظیم ہے۔ کیونکہ اُس نے اتنی بڑی کائنات تخلیق کی ہے کہ ہماری کہکشاں تو اس کا معمولی سا حصہ ہے

نئی تحقیق کے مطابق ہماری کہکشاں گذشتہ اندازے سے پچاس گنا زیادہ بڑی ہے۔ امریکہ کے ایک ادارے ریپبلک پالیٹیکنک انسٹیٹیوٹ میں ایک بین الاقوامی ٹیم نے ایک تحقیق میں ایسے نمایاں ستاروں کے دائرے کی موجودگی کو ثابت کیا ہے جو معلوم کہکشاں سے بھی پرے ہے۔ اُن کی دریافت بتاتی ہے کہ گذشتہ حقائق جو ایک دائرے کی شکل میں پائے گئے تھے اصل میں وہ کہکشاؤں کے بڑے دائرے کا حصہ ہیں۔ جب کہ معلوم کہکشاں کی چوڑائی ایک لاکھ نوری سال سے بڑھ کر ڈیڑھ لاکھ نوری سال پہنچ گئی ہے۔ (ٹائمز آف انڈیا ۱۳ مارچ، ۲۰۱۵)

ہماری کہکشاں فلکیات کا ایک بے مثال عجوبہ ہے۔ جس کا ہمارا نظام شمسی ایک چھوٹا سا حصہ ہے اگر ایک شخص دور خلا میں جاسکے اور ایک ٹیلی اسکوپ کے ذریعہ کہکشاں کا منظر دیکھ سکے۔ تو وہ ایک ناقابل تصور نظارہ دیکھے گا۔ وہ خلا کی وسعت میں شاندار ستاروں کی کہکشاں دیکھے گا۔ ان چکر کھاتی کہکشاؤں میں سے ایک پر ہمارا نظام شمسی واقع ہے۔ زمیں اس نظام شمسی کا حصہ ہے جو دوسرے سیاروں کے ساتھ مسلسل سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ دیکھنے والا بے ساختہ کہے گا۔

سچ میں خالق بہت عظیم ہے۔ کیونکہ اُس نے اتنی بڑی کائنات تخلیق کی ہے کہ ہماری

کہکشاں تو اس کا معمولی سا حصہ ہے



زندگی کا سفر ایک بہتا دریا ہے

اگر انسان کی زندگی ایسے بہتے پانی کی طرح ہو جس میں ہر لمحے مسلسل تازہ پانی شامل ہوتا رہے۔ تو پھر یہ پانی ہمیشہ تروتازہ رہے گا کبھی باسی نہیں ہوگا۔

انسانی زندگی کو بہتے دریا کے ساتھ تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ دریا کیا ہے؟ دریا قدرت کا ایک بے مثال مظہر ہے۔ دریا میں تازہ پانی پہلے پانی میں مسلسل ہر لمحے شامل ہو رہا ہوتا ہے۔ ہر روز اس تسلسل سے پانی کا دریا میں شامل ہونا ہی دریا کے پانی کو تازہ رکھنا ممکن بناتا ہے۔ اگر تازہ پانی کا مسلسل شامل ہونا منقطع ہو جائے تو دریا کا پانی اپنی تازگی کھودے گا۔ وہ اپنی صحت بخش خوبی قائم نہیں رکھ سکے گا۔

قدرت نے یہ ہی طریقہ انسان کے حوالے سے بھی وضع کیا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ انسان نسل در نسل پیدا ہو رہے ہیں۔ ایک صدی کے اندر اندر گذشتہ نسل نئی نسل سے تبدیل ہو جاتی ہے۔ جیسے باسی پانی تازہ پانی سے بدل جاتا ہے پرانی انسانی نسل بھی نئی نسل سے بدل جاتی ہے۔

قدرت نے اس نظام میں انسان کے لیے بڑی حکمت رکھی ہے۔ اس نظام کا مقصد یہ ہے کہ نئی نسل پرانی نسل کے تجربات سے سبق سیکھے۔ اس طریقہ سے یہ اپنا سفر بہتر انداز میں جاری رکھ سکتی ہے یہ پہلی نسل کے تجربات نئی نسل کے لیے قیمتی تحائف ہیں۔ ان تجربات کی بنا پر پہلی نسل کے لیے یہ مجاہد بولا جاتا ہے اولئذ لو لئذ یا نیا نودن پرانا سودن۔

مثال کے طور پر ایک باپ اپنے بیٹے کے بارے میں محسوس کرتا ہے کہ وہ بہت ذہین ہے لیکن مزاج کا تیز ہے۔ جس کی وجہ اُس کی حد سے زیادہ خود اعتمادی ہے۔ اس نقص کی وجہ سے اُس کا بیٹا اپنے سفر حیات میں نقصان اٹھاتا ہے۔ یہ دیکھ کر والد اپنے تجربات کی روشنی میں اُس کو نصیحت کرتا ہے کہ ”میرے بیٹے اعتماد بہت اچھی چیز ہے لیکن حد سے بڑا ہوا اعتماد بھی عیب ہوتا

ہے، یہ نصیحت اُس کے بیٹے کے لیے بہت مفید ہے۔

اس طرح ایک والد دیکھتا ہے کہ اُس کے بیٹے میں صبر کی کمی ہے۔ وہ چیزوں کے متوازن طریقے سے واقع ہونے کا انتظار نہیں کر سکتا۔ تو وہ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے ”میرے بیٹے! زندگی صرف ایک فیصد ایکشن ہے اور ننانوے فیصد اعراض ہے“ یہ نصیحت اُس کے بیٹے کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوتی ہے۔

اس طرح کوئی اور والد یہ دیکھتا ہے کہ اُس کا بیٹا مستقل مزاج نہیں ہے۔ یہ دوسروں کے ساتھ مسلسل کام نہیں کر سکتا۔ لہذا وہ اپنے تجربات کی روشنی میں اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے۔ ”میرے بیٹے! چپٹنگی یہ ہوتی ہے کہ اُن چیزوں کے ساتھ رہنا جن کو تم تبدیل نہیں کر سکتے“ والد کی یہ نصیحت بیٹے کو درست راہنمائی دیتی ہے۔ وہ اپنے ایکس کا ازسرنو جائزہ لیتا ہے۔ اپنی زندگی کی ازسرنو منصوبہ بندی کرتا ہے۔ پھر اپنی زندگی میں زبردست کامیابی حاصل کرتا ہے۔

یہ مثالیں ثابت کرتی ہیں کہ گذشتہ نسل نئی نسل کے لیے کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ پہلی نسل دوسری نسل کو اپنی دانائی منتقل کر دیتی ہے۔ یہ اس طرح کے فارمولے منتقل کرتی ہے جو کہ اُن کے تجربات کی روشنی میں درست ثابت ہوئے ہیں۔ اس طرح پرانی نسل نئی نسل کو اس قابل کرتی ہے کہ وہ اُن غلطیوں کو دہرانے سے باز رہے جو کہ پہلے لوگوں نے کی ہیں۔ اور بڑے نقصان سے بچے۔ پرانی نسل کا سچ نئی نسل کے لیے قدرت کا ایک بہت ہی قیمتی تحفہ ہے۔ ایک ایسا تحفہ جو کہ قدرت کی اجازت کے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

اگر انسان کی زندگی ایسے بہتے پانی کی طرح ہو جس میں ہر لمحے مسلسل تازہ پانی شامل ہوتا رہے۔ تو پانی تروتازہ رہے گا اور کبھی باسی نہ ہوگا۔ اس کے برعکس وہ پانی جو ایک جوہر میں ٹھہرا رہے۔ جہاں تازہ پانی شامل نہ ہو، تو وہ پانی اپنی تازگی کھودے گا۔ اور مضر صحت ہو جائے گا۔ اس معاملے میں قدرت بہتے دریا کے ذریعہ ایک مفید پیغام دیتی ہے اور انسانی تاریخ کے تجربات اس عمل کی تصدیق کرتے ہیں۔



عالی نسب شخصیت

ہمیں اپنی ترقی کے لیے چیزوں اور واقعات سے چاہے وہ منفی و ناخوشگوار ہی کیوں نہ ہوں مدد لینی چاہیے کیونکہ ہم اُن سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں

ایک درخت روحانی زندگی کی مادی تشریح ہے۔ اُس کی زندگی بڑی دلچسپ ہے۔ اُس کی شروعات چھوٹے سے بیج سے ہوتی ہیں۔ پہلے نرم و نازک پودا بنتا ہے پھر اُس کی مسلسل نشوونما ہوتی ہے حتیٰ کہ وہ ایک تنا اور درخت کا روپ دھار لیتا ہے۔ یہ معجزہ کیسے رونما ہوتا ہے؟ دراصل یہ درخت کی داخلی صلاحیت کی وجہ سے ہوتا ہے، جو اُس کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ ہر چیز یعنی زمین، پانی، ہوا، اور سورج کی روشنی سے اپنی خوراک حاصل کرتا ہے۔

بیج بہت چھوٹا آدھے انچ سے بھی کم ہوتا ہے لیکن جب یہ اُگ جاتا ہے تو یہ ایک بہت بڑا درخت بن جاتا ہے۔ بعض اوقات اُس کا قد سو فٹ سے بھی اونچا چلا جاتا ہے۔ انسان بھی ابتدائی طور پر ایک بیج ہی کی مانند اپنے اندر بے شمار صلاحیتیں سموئے ہوئے ہوتا ہے۔ جب وہ بڑا ہو جاتا ہے۔ وہ ایک سپر مین (Superman) کی مانند بن جاتا ہے۔ وہ پیدائشی طور اعلیٰ انسانی خوبیوں کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن یہ سب صفات حقیقت کے روپ میں نہیں بلکہ امکانی خوبیوں کی شکل میں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ یہ انسان کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ ان امکانی خوبیوں کو حقیقت میں بدل دے۔

انسان اور درخت میں ایک فرق ہے۔ قدرت کے قوانین کی پابندی کرتے ہوئے بیج ایک خود کار نظام کے تحت خود بہ خود نشوونما پاتا ہے۔ جبکہ انسان کو اپنی امکانی خوبیوں کو پروان چڑھانے کے لیے کوشش کرنی پڑتی ہے۔ اور یہ کوشش ایک باضابطہ منصوبہ بندی کا تقاضا کرتی ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو دریافت کرے، پھر اس کے مطابق اپنی ترقی کے لیے منصوبہ بندی کرے۔ ہم جس دنیا میں رہتے ہیں وہاں ہر طرح کی صورت حال ہے یہاں اگر مثبت اور خوشگوار پہلو ہیں تو ساتھ ساتھ منفی اور ناخوشگوار راستے بھی ہیں۔ یہ تمام صورت حال ہماری نشوونما کے لیے غذا کا کام دیتی ہے۔ ہمیں اپنی ترقی کے لیے چیزوں اور واقعات سے

چاہے وہ منفی ہوں یا ناخوشگوار مدد لینا چاہیے کیونکہ ہم ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں
 اس دنیا میں انسانی ترقی و کامیابی کا یہ ہی راستہ ہے۔ اس لیے انسان کو بلا تفریق ہر
 واقع سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ جب وہ غصہ میں آپے سے باہر ہو تو اُسے اپنے غصہ کو قابو کرنا
 چاہیے۔ اور اُسے اپنی تربیت اس طرح کرنی چاہیے کہ وہ منفی سمت کو مثبت میں بدل دینے کا ماہر
 ہو۔ جب وہ بحرانی کیفیت میں صبر و برداشت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ تو وہ حقیقت میں اپنی صلاحیتوں
 کو مثبت منصوبہ بندی سے وسعت دے رہا ہوتا ہے۔ اگر وہ پُر تشدد صورت حال کا سامنا کرتا
 ہے۔ اور جوابی رد عمل سے اعراض کرتا ہے۔ اور اپنی شخصیت کو اس طرح منظم کرتا ہے کہ وہ ہر طرح
 کی صورت حال میں اپنے ذہنی سکون کو برقرار رکھ سکتا ہو۔

اُس کا یہ رویہ موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنی توانائیوں کا تحفظ کرتے ہوئے، اپنے آپ
 کو مکمل طور پر تعمیری سرگرمیوں کے لیے وقف کر دے۔ جب کوئی شخص اشتعال انگیز صورت حال کا
 سامنا کرتا ہے۔ اور پھر اپنے آپ کو متوازن رکھتا ہے۔ تو وہ اُس وقت اپنے ضبط نفس (Self
 control) کی تعمیر کر رہا ہوتا ہے، اور ایک ایسی سوچ کو فروغ دے رہا ہوتا ہے جو کہ اُسے
 عارضی بحران کو مؤثر طور پر حل کرنے میں مدد دے گی۔ گویا کہ اُس نے عقل و دانش کو ترقی دینے
 والے راستے پر چلنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

تمام اچھی یا بری صورت حال عقل و دانش کے لیے غذا کی مانند ہیں۔ اگر آپ کوشش
 کرتے ہیں کہ مثبت رویہ کے ساتھ ان صورت حال کا سامنا کریں۔ تو آپ اپنی ذہنی ترقی کے
 لیے اپنی مدد آپ کر رہے ہوں گے، آپ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو خود فروغ دے رہے ہوں گے۔
 آپ اپنی شخصیت کی تعمیر مثبت خطوط پر خود کر رہے ہوں گے۔ جو کوئی بھی اس راستے کو اختیار
 کرے گا وہ جلد یا بدیر، ایک بڑے تناؤ اور درخت کی مانند بڑی قد آور شخصیت بن کر ظاہر ہوگا۔
 ہر شخص اس دنیا میں اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ قدرت نے یہ صلاحیتیں ہر
 ایک کو عطا کی ہیں لیکن یہ بات طے ہے مرد ہو یا عورت ہر کسی کو اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار
 کرنے، اور انہیں اپنے اندر تلاش کرنے کے لیے بہت سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔ ہے۔ مزید یہ
 بات بھی مصدقہ ہے کہ قدرت اپنی رحمتوں کے لحاظ سے کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک روا نہیں

رکھتی ہے۔ اُس کی رحمتیں سب پر یکساں برستی ہیں۔ اس لیے قدرت نے یہ انسان پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو کامیاب کرتا ہے یا ناکام کرتا ہے۔

☆☆

تبدیلی کا قانون

غلطیاں انسانی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں اگر کوئی شخص غلطی نہیں کرتا تو وہ عقلی طور پر جمود کا شکار ہو جاتا ہے

ساری دنیا میں تبدیلی کا قانون کام کرتا ہے۔ دنیا کی ہر چیز میں اس کی مثال ہے۔ مختلف عناصر مل کر پانی میں بدل جاتے ہیں زمین کے اندر موجود غذائی اجزاء، پانی اور سورج کی روشنی سے باہم مل کر گھاس میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور یہ گھاس بذریعہ گائے دودھ میں بدل جاتی ہے۔

انسان کے حوالے سے بھی یہ بات درست ہے۔ کیونکہ تبدیلی کا قانون انسانی افعال (Actions) پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ یہ قانون انسانی افعال پر کیسے منطبق ہوتا ہے۔ اس کا جواب اس مثال میں ہے کہ جب کوئی آدمی برا کام کرتا ہے، تو یہ اُس کے ضمیر پر بوجھ بن جاتا ہے۔ اور یہ بوجھ اُسے اپنے رویہ کے بارے میں از سر نو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ اور یہ از سر نو سوچنا اُسے اپنی غلطی کو تسلیم کرنے کی طرف راغب کرتا ہے۔ اور اپنی غلطی تسلیم کرنے کا عمل اُسے اپنی اصلاح کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس طرح ایک بُرا کام ایک صالح عمل میں بدل جاتا ہے۔

مزید تبدیلی کا یہ عمل خالصتاً خود کار نظام کے تحت وقوع پذیر نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ یہ اپنی پلاننگ کا از سر نو جائزہ لینے سے واقع ہوتا ہے۔ ایسی پلاننگ جو فکر و خیال کے تمام گوشوں کو متحرک کر دے۔ تاکہ وہ قابلیتیں جو ابھی تک خوابیدہ ہیں اُن کو بیدار کیا جائے۔ اور یہ ہی تبدیلی کا عمل تخلیقی سوچ اور ذہنی ترقی کی راہ ہموار کرتا ہے۔ نتیجتاً ایک نئی شخصیت وجود میں آتی ہے۔

جب انسان پیدا ہوتا ہے تو وہ ایک خام دھات کی مانند ہوتا ہے۔ خام دھات جو پوشیدہ طور پر اسٹیل ہی ہوتی ہے۔ لیکن اسے اسٹیل میں تبدیل ہونے کے لیے صنعتی عمل سے گزرنا پڑتا

ہے۔ اور جب یہ صنعتی عمل مکمل ہوتا ہے تو پھر اسٹیل وجود میں آتا ہے۔ جو کہ بعد ازاں، مختلف مراحل سے گزر کر مشینوں کی شکل میں ڈھل جاتا ہے۔ یہ بات انسان کے بارے میں بھی درست ہے۔ انسان بہت زبردست پوشیدہ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے لیکن انھیں حقیقت کا روپ دینے کے لیے اُس کو ایک نفسیاتی عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ نفسیاتی عمل جو کہ تبدیلی کے عمل کو متحرک کرتا ہے دراصل ایسے تجربات ہیں جو انسان کو ذہنی طور پر بیدار کرتے ہیں۔ اور ان میں کچھ ایسے ناگوار تجربات بھی ہو سکتے ہیں جو ایک حساس ذہن کے لیے اذیت کا باعث ہوں۔ لیکن ایک قبیح عمل محض قبیح نہیں ہوتا ہے۔ حقیقت میں یہ عمل خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے ضمیر کی آواز اور ایک نفسیاتی چیلنج بھی ہوتا ہے۔ اخلاقی طور پر باخبر شخص کے لیے اُس کے بُرے اعمال اُس کے لیے ایک قسم کا چیلنج بن جاتے ہیں۔ اور ان چیلنجز کا مقابلہ کرنے سے اُس کی روحانی اور ذہنی ترقی کو فروغ ملتا ہے۔ اس طرح وہ بُرے آدمی سے صالح آدمی بن جاتا ہے۔

غلطیاں انسانی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں اگر کوئی شخص غلطی نہیں کرتا تو وہ عقلی طور پر جمود کا شکار ہو جاتا ہے۔ غلطیاں اپنے نتائج کے لحاظ سے انسان کو تخلیقی ذہن دیتی ہیں۔ ایک طرف یہ تبدیلی کا عمل انسان کی عقل و دانش کے لیے لازم ہے۔ دوسری طرح جو شخص اخلاقی نقائص کا حامل ہے اُس کے نقائص دور کرنے کے لیے بھی غلطیاں ناگزیر ہیں

قدرت کا قانون ہم کو بڑا اہم سبق دیتا ہے۔ کہ جب آپ سے کوئی غلطی ہو جائے تو اُس کو ہرگز منفی تجربے کے طور پر نہ لیں۔ بلکہ اُسے تبدیلی کے قانون کے مطابق لیں۔ کیونکہ فطرت آپ کے فکر و خیال کو تحریک دینا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اگر آپ کا دماغ غیر تخلیقی ہے تو اب اُس کو تخلیقی صلاحیت دے دی جائے۔ انسان کی ساری ترقی میں فطرت کا یہ قانون سب سے زیادہ موثر ہے۔ سمول سمال (1812-1904) نے درست کہا ہے۔ ”ہم کامیابی کی نسبت ناکامی سے زیادہ سبق سیکھتے ہیں“



امن برائے امن

امن کسی شخص کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھال نہیں سکتا ہے۔ بلکہ یہ تو خود انسان کے لیے ہے کہ اپنی منصوبہ بندی اور جدوجہد سے اپنی منزل مقصود کو حاصل کرے۔

دنیا میں امن بہت زیادہ زیر بحث آنے والا موضوع ہے۔ معاشرے کا ہر مکتب فکر اس بات کا دعوے دار ہے کہ وہ معاشرے میں امن قائم کرنا چاہتے ہیں۔ حتیٰ کہ معاشرے میں ایک بھی شخص ایسا نہیں ملے گا جو امن کی اہمیت سے اعراض کرے۔ لیکن حقیقی نظر سے دیکھیں تو دنیا میں بد امنی عام ہے۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ جب سب لوگ امن کی اہمیت کا شعور رکھتے ہیں، تو آج دنیا میں امن حقیقت کا روپ دھارنے کے بجائے صرف بحث و مباحثے کا موضوع کیوں بن گیا ہے؟ اور یہ حیران کن اختلاف اتنا واضح ہے کہ کوئی بھی شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے لوگوں نے امن کو دوسرے نظریات کے ساتھ گڈ کر دیا ہے۔ جن کا براہ راست امن کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً لوگ کہتے ہیں کہ وہ انصاف کے ساتھ امن (Peace with justice)، یا انسانی حقوق کے ساتھ امن، یا برابری کی بنیاد پر امن، یا مسائل سے خالی معاشرے کے ساتھ امن چاہتے ہیں۔ یہ امن کی تمام تعریفیں غیر حقیقی ہیں۔ اس لیے امن عملی طور پر قابل حصول نہیں رہا ہے۔ امن مسائل کو حل کرنے کا ذریعہ ہے مسائل کو ختم کرنے سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ امن مسائل کو دور کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ پھر لوگ ان مواقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے مسائل کو سلجھاتے ہیں۔ امن کسی شخص کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھال نہیں سکتا ہے۔ یہ تو خود انسان کے لیے ہے کہ وہ اپنی پلاننگ اور جدوجہد سے اپنے اہداف حاصل کرے۔

قانون قدرت کے مطابق، امن قائم کرنے کا واحد راستہ یہ ہے۔ کہ بغیر کسی دوسرے معاملات کے ساتھ منسلک کیے ہر قیمت پر امن قائم کیا جائے، اور جب ایک دفعہ امن قائم ہو جائے۔ تو پھر یہ ہر انسان کی اپنی ذمہ داری ہے کہ مواقع تلاش کرے اور حقیقت پسندانہ منصوبہ بندی سے ان کو استعمال کرے۔ بارش بذات خود پھل اور سبزیاں پیدا نہیں کرتی۔ بارش تو قانون قدرت کے مطابق آب پاشی کا ذریعہ ہے۔ یہ کسان کا کام ہے کہ وہ بارش کے پانی سے فائدہ اٹھائے۔ اور زمین میں بیج بوائے۔ پھر مطلوبہ فصل حاصل کرے۔

یہ بات امن کے لیے بھی درست ہے۔ کیونکہ امن بارش کی مانند ہے۔ پر امن ماحول لوگوں کے سامنے مواقع کے دروازے کھول دیتا ہے اب یہ لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی دانشمندانہ منصوبہ بندی سے ان مواقع سے فائدہ اٹھائیں۔ لہذا امن برائے امن کا فارمولا درست ہے۔ امن کے ساتھ کسی دوسری شرط کو منسلک کرنا غیر حقیقت پسندانہ عمل ہے کیونکہ کسی شرط کے ساتھ امن ناقابل حصول ہے



خدا اور سائنس

بلا واسطہ طور پر کائنات کا مطالعہ خالق کے کاموں کا مطالعہ ہے
خدا کا مسئلہ خالق کائنات کا مسئلہ ہے۔ کائنات کا وجود خالق کائنات یا دوسرے الفاظ میں خدا کے وجود کے بارے میں سوچنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ سائنس کے مطالعہ و تحقیق کا موضوع کائنات یا دنیا ہے۔ فزیکل سائنس کی تمام شاخیں دنیا کے فطرت پر نظر تحقیق رکھے ہوئے ہیں۔

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ہم دنیا کے فطرت کو کسی صحافتی مسئلہ کی طرح زیر گفتگو نہیں لاسکتے۔ فطرت کے قوانین کا مطالعہ سائنسی طریقہ کار کے مطابق ہی ہو سکتا ہے۔ خدا کے لحاظ سے بھی یہ بات سچ ہے۔ کیونکہ خدا بھی ایک سائنسی موضوع ہے۔ خالق یا خدا کے مطالعہ کے لیے صرف سائنسی طریقہ کار ہی لاگو کیا جاسکتا ہے۔

اگرچہ خدا کی موجودگی کا موضوع سائنسی تحقیق کا براہ راست موضوع نہیں ہے۔ البتہ بلا واسطہ طور پر یہ مکمل سائنس کا موضوع ہے۔ سائنسی تحقیق و مطالعہ نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ جو کچھ بھی ہماری دنیا میں وقوع پذیر ہو رہا ہے اُس کی پشت پر ایک نہایت اعلیٰ عنصر (Supreme factor) ہے۔ سائنس اس عنصر کو فطرت کا قانون کہتی ہے۔ لیکن یہ صرف نام رکھنے کا مسئلہ ہے۔ اگر اُس کو مذہبی نام دیا جائے، تو اس کا دوسرا نام خدا ہو سکتا ہے۔۔۔ براہ راست نہ سہی بلا واسطہ ہی سہی، تاہم یہ بات مسلم ہے کہ خدا سائنس کی سب سے عظیم دریافت

ہے۔

سائنس کی تحقیق کا موضوع فزیکل کائنات ہے۔ لیکن یہ فزیکل کائنات کیا ہے۔ یہ خالق کی تخلیق ہے۔ بلا واسطہ طور پر کائنات کا مطالعہ خالق کے کاموں کا مطالعہ ہے۔ کیونکہ خدا کی موجودگی کے ثبوت پوری کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے جدید سائنس ایک جدید دینیات ہے۔



خدا کی موجودگی

جہاں کسی کام کا آغاز ہوتا ہے وہاں آغاز کرنے والا بھی ہوتا ہے۔ کسی کام کرنے والے کے بغیر کسی کام کی شروعات نہ قابل تصور ہیں۔

ہر زمانے کے علماء فضلاء کا بنیادی موضوع خدا کی موجودگی رہا ہے۔ جب انسان اپنی اور اپنے ارد گرد پھیلی کائنات کی تخلیق پر غور و فکر کرتا ہے۔ تو لازمی اس کے ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ میرا اور اس دنیا کا خالق کون ہے۔ اسی لیے خدا کی موجودگی کا موضوع اتنا اہم ہے۔ کہ پوری انسانی تاریخ میں یہ فکر و خیال پر چھایا رہا ہے۔ اس موضوع کی تحقیق کے دو ادوار ہیں۔ ایک سائنسی زمانے سے پہلے کا دور، دوسرا سائنسی ترقی کے بعد کے دور میں۔ پہلے دور میں مذہبی علما کائنات میں موجود منصوبہ بندی کی روشنی میں اپنے دلائل پیش کیا کرتے تھے۔ مثلاً اگر کائنات میں ایک اعلیٰ پلاننگ نظر آتی ہے تو پلاننگ کرنے والا بھی لازمی ہوگا۔ یہ دلائل کائنات کی منصوبہ بندی کے نام سے معروف ہیں۔

دوسرے دور میں کئی دریافتوں نے اس موضوع کو مزید ترقی دی۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں، بگ بینگ نظریہ پیش کیا گیا۔ جس نے اب سائنس دانوں کے درمیان قبول عام حاصل کر لیا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق یہ کائنات تیرہ بلین سال پہلے وجود میں آئی۔ اس نظریہ نے خدا کے وجود کے مزید ثبوت فراہم کر دیئے۔ کیونکہ جہاں کسی کام کا آغاز ہوگا وہاں آغاز کرنے والا بھی ہوگا۔ بغیر آغاز کرنے والے کسی کام کی شروعات ناقابل تصور ہیں۔

قدیم فلسفیوں کا خیال تھا کہ مادے کو ہیئتگی حاصل ہے۔ لہذا کائنات ہمیشہ سے موجود ہے۔ اس کی نہ شروعات ہیں نہ اس کا اختتام ہے۔ لہذا اس تصور میں خدا موجود نہ تھا۔ لیکن ہنگریننگ نظریہ کی دریافت نے اس تصور کو غیر حقیقی ثابت کر دیا ہے۔

جدید سائنس نے خدا کی موجودگی کے حق میں مرئی دنیا (Visible world) کے علاوہ ایک غیر مرئی دنیا (Invisible world) دریافت کی ہے۔ غیر مرئی دنیا ایٹم کے اندر موجود ذرات (Subatomic) ہیں۔ اس نئی سائنسی تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ ایک نظر آنے والے خدا کا مطالبہ نامناسب ہے۔ کیونکہ ایک مقام پر پہنچ کر ہم آنکھیں رکھنے کے باوجود دکھائی دینے والی چیزوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ اُس مقام پر دکھائی دینے والی چیزیں بھی دکھائی نہیں دیتی ہیں۔ سر آرتھر ایڈینگٹن نے اس حقیقت کی وضاحت اپنی کتاب ”سائنس اور غیر مرئی دنیا“ (1929) میں کی ہے۔



ناقابل تصور کائنات

ایک مشین کی بہترین کارکردگی ایک عظیم انجینئرنگ ذہن کو ظاہر کرتی ہے۔ جس نے اُسے سوچا اور پھر معرض وجود میں لایا۔

26 فروری 2015 ایک رپورٹ ”ٹائم اخبار“ نے بعنوان ”سائنس دانوں نے سورج سے بارہ بلین گنا بڑا ایک بلیک ہول دریافت کیا ہے“ شائع کی۔ جس میں بتایا گیا کہ سائنس دانوں نے سائنسی تاریخ کا سب سے بڑا بلیک ہول دریافت کیا ہے۔ یہ نہ صرف سورج سے بارہ بلین گنا زیادہ بڑا ہے بلکہ اس کے مقابلے میں چار سو بیس ٹریلین زیادہ روشن بھی ہے۔ اور یہ بلیک ہول بارہ اعشاریہ آٹھ بلین نوری سال کی دوری پر ہے۔ یہ سب سے زیادہ روشن وجود ہے جو اب تک کائنات میں دیکھا گیا ہے۔ ایک مشین کی بہترین کارکردگی ایک زبردست انجینئرنگ دماغ کو ظاہر کرتی ہے۔ جس نے اُسے سوچا اور پھر معرض وجود میں لایا۔ یہ بات کائنات کے لیے بھی درست ہے۔ جو کہ اتنی وسیع ہے کہ جدید ترین ٹیلی اسکوپ بھی اس کی چوڑائی اور گہرائی کا

احاطہ نہیں کر سکتی۔ کائنات کی یہ ناقابل تصور وسعت ایک ناقابل انکار ثبوت ہے کہ ایک عظیم خالق نے نہ صرف اس کائنات کو تخلیق کیا ہے۔ بلکہ اسے ایک بے مثال طریقہ سے قائم رکھے ہوئے ہے۔

اس قسم کی سائنسی دریافتیں دو کام کرتی ہیں۔ ایک طرف وہ پختہ یقین دیتی ہیں کہ یہ کائنات ایک طاقت ور خالق کی مرہون منت ہے۔ دوسری طرف وہ اس بات کو نمایاں کرتی ہیں کہ اس کائنات کا خالق بڑا رحیم ہے کہ اُس نے اس عظیم کائنات کو انسان کے لیے مضرت رساں (Injurious) نہیں بنایا ہے۔ بلکہ اُس نے اس کائنات کو ہر جاندار کی ضرورت کے مطابق بنایا ہے۔ یہ دریافت انسان کے اندر انکساری پیدا کرتی ہے۔ جو کہ بہت قیمتی اثاثہ ہے کیونکہ انکساری انسان کے وجود سے ہر قسم کی برائی کو جڑ سے ختم کر دیتی ہے۔

سائنس مذہب کی شاخ نہیں ہے۔ لیکن یقینی طور پر یہ سائنسی دریافتیں مذہب کے حق میں بہت مفید ہیں۔ ان کو ہم مذہب کے تائیدی عناصر کہہ سکتے ہیں۔ سائنس کا مطالعہ انسان کے اندر سائنسی طرز پر سوچنے اور حقیقت پسندانہ غور و فکر کو فروغ دیتا ہے۔ جو کردار سازی کی کلید ہے۔ (Key)



چیونٹی کلچر

جنت اُن منتخب افراد کے لیے ہے جو اپنے اختیارات کو درست طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اور منہی ماحول میں گھیرے ہونے کے باوجود اپنی سوچ کو مثبت رکھتے ہیں

ایک چیونٹی جب چینی اور نمک کے ڈھیر کے درمیان سے گزرے گی، تو چینی کا دانہ اٹھائے گی اور نمک کے پاس سے خالی گزر جائے گی۔ چیونٹی کے اس طرز عمل کو ایک فقرے میں یوں سمویا جاسکتا ہے۔ کہ ”نا پسندیدہ بات سے اعراض کریں، اور پسندیدہ چیز کو اختیار کریں“

اس طرز عمل کو ہم اگر چیونٹی کلچر کا نام دیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کلچر چیونٹی کو کس نے سیکھایا؟ بغیر کی شک و شبہ کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کلچر خدا نے چیونٹی کی جبلت (Instinct) میں

رکھا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ چیونٹی کلچر صرف چیونٹی کا کلچر نہیں ہے۔ بلکہ یہ ربانی کلچر اور تخلیق کا حصہ ہے۔ یہ نہ صرف قدرت کے قانون کے مطابق ہے بلکہ اس میں ایک سبق ہے جو خالق اپنی مخلوق کو دینا چاہتا ہے۔ خالق خاموش الفاظ میں کہتا ہے: 'اے انسان! چیونٹی کلچر اختیار کر۔' چیونٹی اپنی جبلت کی وجہ سے اس اصول کو اختیار کرتی ہے۔ اُس کے لیے اس کی پابندی ایک قدرتی مجبوری ہے۔ وہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں جانتی۔ لیکن انسان بااختیار ہے جانور جو اپنی جبلت کی بنا پر کام کرتے ہیں انسان اپنی پسند اور اختیار سے وہ کام کرتے ہیں۔ جو کام چیونٹی کے لیے اُس کی جبلت کا مسئلہ ہے، انسان کے لیے وہ اپنے انتخاب کا مسئلہ ہے۔ اس لیے انسان کو اپنی عقل و فہم استعمال کرتے ہوئے چیونٹی کلچر کو سمجھنا چاہیے، اور اُسے اختیار کرنا چاہیے۔

قدرت کے قانون کے مطابق، ہماری دنیا منفی اور مثبت خصوصیات کا آمیزہ (Mixture) ہے۔ یہ کلچر حادثاتی طور پر وجود میں نہیں آیا ہے بلکہ یہ خدائی اسکیم کا براہ راست ثمر ہے۔ کیونکہ خدا انسان کو وہ کچھ دینا چاہتا ہے جو اُس نے چیونٹی کو مقدر نہیں کیا۔ یہ اختیارات کا صحیح استعمال ہے جو انسان کو جنت کا ایک مستحق امیدوار بناتا ہے۔ جنت اُن منتخب افراد کے لیے ہے جو اپنے اختیارات کو درست طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اور منفی ماحول میں گھیرے ہونے کے باوجود اپنی سوچ کو مثبت رکھتے ہیں۔

انسان کے لیے چیونٹی کلچر اختیار کرنا بہت آسان ہے۔ قدرت کے قانون کے مطابق، ہماری دنیا ہمیشہ منفی اور مثبت خصوصیات کا آمیزہ رہے گی۔ تاہم ہماری دنیا میں منفی عنصر ہمیشہ ایک فیصد سے بھی کم رہے گا۔ جب کہ مثبت عناصر ہمیشہ ننانوے فیصد سے بھی زیادہ ہوں گے۔ قدرت کی اس حقیقت کو دریافت کریں اور دوہرا فائدہ اٹھائیں، ایک طرف یہ آپ کو متوازن سوچ دے گی۔ دوسری طرف آپ کو اس طرح فعال (Active) کرنے کی کہ آپ مثبت خصوصیات کو پسند کریں گے، اور اُن عناصر سے اعراض کریں گے جن میں آپ کو منفیت کی جھلک نظر آئے گی۔



ہمیں زبردست مہم جو (Crusades) دانشوروں

کی ضرورت ہے

آج نظام تعلیم کا سارا تصور اس بات پر ہے کہ طالب علم کو معاشرے کا اچھا رکن بنانے کے بجائے پیشہ وارانہ زندگی کا ماہر بنایا جائے

سوال یہ ہے کہ بھارت کے سامنے وہ کیا رکاوٹ حائل ہے کہ وہ مسائل میں گھیرا ہوا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آزادی سے پہلے ہر کسی نے آزادی سے بڑی لمبی لمبی امیدیں وابستہ کیں اور سہانے خواب دیکھے۔ لیکن اب ہر کوئی محسوس کرتا ہے کہ ان کے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کے لیے ابھی کچھ اور درکار ہے۔ آج وقت کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ ہم ان کمیوں کو دریافت کریں، جن کی وجہ سے خواب خواب ہی رہے، حقیقت نہ بن سکے۔ اور پھر اپنے منصوبوں کو از سر نو ترتیب دیں۔ ہماری قوم کے سامنے یہ کام فوری کرنے والا ہے۔

مسئلے کی جڑ یہ ہے کہ ہم آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد والے ہندوستان میں فرق کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اور پھر یہ ناکامی تمام مسائل کی بنیادی وجہ بن گئی۔ یہ بات واضح رہے ہم کسی اندرونی یا بیرونی سازشیوں کا شکار نہیں ہوئے ہیں بلکہ یہ ہماری اپنی ہی غلط حکمت عملی کا خمیازہ ہے جو ہم بھگت رہے ہیں۔ آزادی سے پہلے ہماری جدوجہد کی اساس معاشرتی فرائض کے بجائے ہمارے سیاسی حقوق رہے۔ تمام جدوجہد کا مرکزی نقطہ اپنے سیاسی حقوق کا حصول تھا۔ اس پلاننگ نے تمام معاشرے کو حقوق شناس معاشرہ بنا دیا۔ جب کہ اچھا معاشرہ وہ ہوتا ہے جس کے ارکان فرض شناس ہوں۔

آزادی سے قبل، انڈین اور انگریزوں میں مساوات نہ تھی، نتیجتاً اُس وقت حقوق کی بنیاد پر جدوجہد معقول لگتی تھی۔ لہذا یہ جدوجہد فعال (Effective) رہی۔ لیکن آزادی کے بعد انڈین انڈین کے درمیان برابری تھی۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ ہم اپنی منصوبہ بندی کو حقوق پرستی سے فرائض پرستی میں تبدیل کرتے۔ لیکن اس معاملے میں ہم مکمل طور پر ناکام ہو گئے۔ ایک

بھی تحریک (Movement) فرض شناس افراد پیدا نہ کر سکی۔ حتیٰ کہ بھارت کا آئین وقت کے بہترین دماغوں نے تشکیل دیا۔ لیکن حیرت کی بات تھی کہ جب یہ پہلی دفعہ نافذ العمل ہوا، تو اس کی تمام شقیں حقوق سے متعلق تھیں۔ ایک بھی شق فرائض کے حوالے سے نہ تھی۔

دوسروں کی شکایت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اس کی دھڑے کا ہم اپنے آپ کو قصور وار ٹھہرائیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ایک نئی دانشورانہ کرسٹیڈ کی نیو (Foundation) اٹھائیں۔ دانشورانہ کرسٹیڈ سے میری مراد ایک تعلیمی کرسٹیڈ ہے جو روائتی تعلیم کے حوالے سے نہیں بلکہ غیر روائتی تعلیم کے حوالے سے ہو۔

روایتی تعلیم اس سلسلہ میں ہماری مدد نہیں کر رہی ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد مکمل طور پر پیشہ وارانہ مہارت پر ہے۔ جو کوئی بھی روائتی تعلیم حاصل کرتا ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے۔ یہ دور پیشہ وارانہ مہارت کا دور ہے۔ لہذا مرد ہو یا عورت اُن کے خیال میں مارکیٹ میں اپنی روزگار کو پکا کرنے کے لیے انھیں پیشہ وارانہ ڈگری حاصل کرنی چاہیے۔ انسان کو معاشرے کا اچھا رکن بنا نے کے بجائے، روائتی تعلیم کے سارے نظام کی بنیاد اس تصور پر ہے، کہ خود کو پیشہ وارانہ میدان میں ماہر کیا جائے۔ بھارت میں ایک بہتر معاشرے کے لیے، ہمیں ایک روائتی تعلیم کے متوازی دانشورانہ مہم کی ضرورت ہے۔ یہی مہم ہے جس کے لیے میں نے دانشورانہ کرسٹیڈ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

اگر کوئی مجھے سے پوچھے کہ اس دانشورانہ کرسٹیڈ کا ماڈل کیا ہے۔ تو میں کہوں گا۔ کہ میں نے اپنے آپ کو پوری یکسوئی کے ساتھ اس کام کے لیے وقف کر دیا ہے۔ ہم اس کام کے لیے مختلف ذرائع ابلاغ مثلاً پرنٹ اور الیکٹرونکس میڈیا، کانفرنسیں، سیمینار، کو استعمال کرتے ہیں۔ یہاں میں ایک واقعہ نقل کرنا پسند کروں گا۔ جو میرے کام کرنے کے طریقہ کی وضاحت کرے گا۔ ایک دفعہ میں جینیوا انٹرنیشنل پورٹ پر ایک بھارتی خاتون سے ملا۔ جو پچھلے دو ماہ سے ایک ثقافتی پروگرام پر کام کر کے واپس بھارت جا رہی تھیں۔ اپنے سویزر لینڈ کے تجربات بتاتے ہوئے انھوں نے دوسروں کی شکایات شروع کر دیں۔ میں نے درمیان میں شائستگی سے مداخلت کرتے ہوئے کہا: 'آپ مذہبی لحاظ سے گائے کو مقدس جانور سمجھتی ہیں لیکن آپ گائے کچھ

کو اپنی حقیقی زندگی میں اختیار نہیں کرتیں۔ گائے قدرتی طور ایک ایسی صنعت ہے جو گھاس پھوس اور چارے کو دودھ میں تبدیل کرتی ہے۔ قدرت کا یہ کمال انسان سے کہتا ہے کہ وہ منفیت کو مثبت میں بدلنے کے گائے کچھ اختیار کرے۔ وہ فوراً میری بات سمجھ گئی اور اُس نے کہا وہ شکایتی رویہ ترک کر دے گی اور ہر صورت حال میں اپنی مثبت سوچ کو جاری رکھے گی۔

یہ ہے جس کو میں نے دانشورانہ کروسیڈ کا نام دیا ہے۔ جو ہر موقع پر لوگوں کو بہتر دانشورانہ تعلیم دے جو اُن کو اچھا انسان اور اچھا معاشرے کا رکن بنائے۔



روحانیت کا کلچر

ہمیں اپنی آزادی کے تحفظ کے لیے، دوسروں کی آزادی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اور اپنی روحانیت کی حفاظت کے لیے، ہمیں دوسروں کو اُس وقت بھی نظر انداز کرنا پڑتا ہے جب وہ آزادی کا ناجائز استعمال کر رہے ہوتے ہیں۔

میں اُتر پردیش کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ اور اپنے بچپن میں ایک ایسا پریشان کن واقعہ دیکھا، کہ برسوں گزر گئے لیکن میں اُس واقعہ کو آج تک بھلا نہ پایا۔

میرے گاؤں کے باہر ایک آم کا درخت ہوا کرتا تھا، جو اپنے موسم میں آموں سے بھر رہتا تھا، ایک دن میں نے دیکھا، کہ ایک لڑکا آم گرانے کے لیے درخت کو پتھر مار رہا ہے۔ میں یہ منظر دیکھ کر لرز گیا، کیونکہ لڑکا درخت پر پتھر برسار رہا تھا، جبکہ درخت بدلے میں ثمر برسار رہا تھا۔ میں نے اس واقعہ پر کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا، تاہم ایک مثبت سوچ میرے اندر پیدا ہوئی، مجھے ایسا لگا جیسے میں قدرت کے اسکول میں ہوں، اور جہاں مجھے یہ سیکھا یا جا رہا ہے: ”اگر تمہیں کوئی پتھر بھی مارے، پتھر بھی تمہیں بدلے میں اُس کو پھل دینا چاہیے“۔ یہ زندگی کی اعلیٰ اخلاقی اقدار کا خلاصہ ہوگا۔ مزید برآں، یہ ذہنی اور روحانی ترقی کا ایک زبردست ذریعہ بھی ہے۔

اس دنیا میں کچھ لوگ اپنی عادت کے ہاتھوں مجبور ہیں کہ وہ آپ پر پتھر برسائیں، اگر آپ رد عمل کی پالیسی اپناتے ہیں۔ تو آپ کو غصہ اور رنج کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ اس کے

برعکس اگر آپ رد عمل کی پالیسی سے اعراض کرتے ہیں، تو آپ بہت اعلیٰ اخلاقی اقدار مثلاً صبر و برداشت، غفو و درگزر، اور منفی صورت حال میں مثبت فکر کا عملی مظاہرہ کرتے ہیں۔

بعد ازاں، اس مسائل بھری دنیا میں، مجھے یہ معلوم ہوا، کہ اپنی روحانیت کو قائم رکھنے کے لیے نہ صرف یہ ہی واحد راستہ ہے۔ بلکہ زندگی گزارنے کے لیے بھی یہ ہی راستہ تسلی بخش ہے جس کے ذریعہ ہم اطمینان سے اپنی شخصیت میں اعلیٰ اقدار کو فروغ دے سکتے ہیں۔

یہ میری زندگی کا پہلا سبق تھا۔ اسی سبق نے مجھے بتایا کہ روحانی کلچر کیا ہوتا ہے۔ کیسے کوئی اپنی شخصیت کو باکردار بنانے کے لیے اپنے ذہن کو متوازن رکھ سکتا ہے۔ اگرچہ یہ سبق میں نے اپنے بچپن میں لاشعوری طور پر سیکھا، لیکن بعد ازاں زندگی میں یہ میرے شعور کا حصہ بن گیا۔ اب یہ میری فطرت کا انمول جز بن چکا ہے۔

میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسے مزاج کا حامل ہوں جو آسانی سے غصہ میں آتا ہے نہ اپنے آپ کو منفی خطوط پر سوچنے کی اجازت دیتا ہے۔ میں الفاظ کا مکمل احساس رکھتے ہوئے، اپنے فکر و خیال کو نفرت و عداوت سے دور رکھ کر زندگی گزارتا ہوں۔ اس طرح کا کردار میرا سب سے بڑا اثاثہ ہے۔ اور شاید اس کردار کا صلہ اُس دیہاتی لڑکے کو جاتا ہے۔ جس نے ایک پریشان کن واقعہ کے ذریعہ مجھے یہ سب کچھ سیکھا دیا۔

ہم سب آزادی سے محبت کرتے ہیں۔ ہر کوئی مکمل خود مختاری کا خواہاں ہے۔ لیکن یہ مطلوب کلچر ایک سنجیدہ مسئلہ کھڑا کرتا ہے۔ مثلاً جب میں اپنی آزادی کا استعمال کرتے ہوئے اپنے ہاتھ کو بے احتیاطی سے حرکت دوں گا، تو ممکن ہے میرا ہاتھ دوسرے کی ناک تک پہنچ جائے۔ ایسی صورت حال میں میری آزادی دوسروں کے لیے اذیت کا باعث بنے گی۔ اس طرح کے مسائل ہماری معاشرتی زندگی کا لازمی جز ہیں۔ اور کوئی بھی آدمی ان کو ختم کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا ہے۔

جب ہم منفی رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے دوسرے شخص کے ساتھ لڑنے لگتے ہیں اُس وقت ہم صرف دوسرے شخص سے ہی نہیں لڑ رہے ہوتے بلکہ اُس شخص کی آزادی کو بھی محدود کر رہے ہوتے ہیں جو کہ کسی شخص کا نہیں بلکہ نظام فطرت کا حصہ ہے۔ چونکہ ہم آزادی کو ختم نہیں کر

سکتے۔ پھر اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم ہمیشہ لڑتے رہیں گے۔ اس طرح ہم مایوسیت اور منفیت میں زندگی گزاریں گے۔ اور ہم روحانیت اور مثبت سوچ کو جو کہ ہمارا سب سے بڑا اثاثہ ہے ضائع کر دیں گے۔

ہمیں اپنی آزادی کو محفوظ کرنے کے لیے، دوسروں کی آزادی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اور اپنی روحانیت کی حفاظت کے لیے، دوسروں کو اُس وقت نظر انداز کرنا پڑتا ہے جب وہ آزادی کا ناجائز استعمال کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ یقینی بنانے کے لیے کہ ہماری اپنی شخصیت صحیح خطوط پر استوار ہو، ہمیں دوسروں کے ناپسندیدہ رویہ سے اعراض کرنا چاہیے۔

اس دنیا میں زندگی گزارنے کا یہ ہی دانشمندانہ طریقہ ہے۔ اور مزید آخر میں کہوں گا کہ زندگی کا حقیقی زاویہ نظر یہ ہے۔ کہ ہمیں جیسے چیزیں ہیں ان کو ویسے ہی قبول کرنا چاہیے۔



بہتر معاشرہ کیسے تشکیل دیں؟

معاشرے کی تشکیل یا قومی تعمیر کا کام کھیلوں کی بیل کی طرح نہیں بلکہ شاہ بلوط کے درخت کی نشوونما کی مانند ہوتا ہے۔ اگر ہم اس کام کا آغاز درست طریقہ سے کرتے ہیں، تو ایک وقت آئے گا جب قومی تعمیر بلند یوں کو چھوئے گی۔

معاملات کا مایوس کن پہلو یہ ہے کہ ہم ایک بدعنوان (Corrupte) دنیا میں رہتے ہیں۔ لیکن شاید ہی یہاں کا کوئی ایسا شخص ہو جو کرپشن سے پاک دنیا کا خواہاں نہ ہو۔ ہر کوئی کرپشن سے پاک دنیا کا خواہش مند ہے اور بغیر کسی شک و شبہ یہ خواہش قابل احترام ہے۔ لیکن یہ خواہش اُس وقت ہی ثمر بار ہو سکتی ہے جب برائی کی درست طریقہ سے بیخ کنی (Rooted out) کی جائے گی۔ کیونکہ غلط طریقہ علاج ہمارے صحت مند مقاصد کی حفاظت نہیں کرے گا۔

بہت سے لوگ ہیں جن میں سیاسی اور غیر سیاسی دونوں قسم کے شامل ہیں وہ اس بات کے حامی ہیں کہ معاشرتی برائیوں کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے اُن کے خیال میں یہ مسائل حل کرنے کا واحد طریقہ ہے اس لیے وہ ہجوم کے سامنے تقریریں، گلی محلوں میں احتجاج اور جلوس

وغیرہ کا اہتمام کرتے ہیں۔ اور کچھ انتخابات میں ووٹ کے ذریعہ مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان تمام سرگرمیوں کا مشترکہ مقصد معاشرتی اور سیاسی برائیوں کے خلاف آواز اٹھانا ہے۔ لیکن اس لائحہ عمل کا مایوس کن حاصل یہ ہے کہ یہ پچھلی نصف صدی سے روبہ عمل ہونے کے باوجود صفر نتیجہ دے رہا ہے۔ مسائل کو حل کرنے کے لیے شکایت و احتجاج کا لائحہ عمل اختیار کرنا، ایسا ہی ہے جیسے زیادہ فصل کے لالچ میں کثیر مقدار میں بیج بویا جائے، لیکن فصل کٹائی کے وقت پیداوار حاصل نہ ہو۔

سوال یہ ہے کہ اس طرح کی کاوشیں کیوں مثبت نتائج دینے میں ناکام رہی ہیں۔ اس کا جواب بالکل واضح ہے۔ معاشرتی تبدیلی کبھی بھی مظاہروں اور احتجاج کے ذریعہ نہیں لائی جاسکتی ہے۔ یہ تبدیلی صرف اسی صورت آسکتی ہے کہ لوگوں کی سوچنے سمجھنے کی سطح کو تبدیل کر دیا جائے۔ معاشرتی تبدیلی کا گلی محلے کی احتجاجی سرگرمی سے تعلق نہیں ہوتا ہے۔ اس تبدیلی کا تعلق دانشورانہ سرگرمیوں سے ہے۔ اس لیے روایتی اور غیر روایتی تعلیم کے ذریعہ سماجی تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ دیکھنے میں یہ طریقہ بہت طویل ہوگا۔ لیکن قانون قدرت کے مطابق، کوئی بھی حقیقی نتیجہ صرف اسی صورت حاصل کیا جاسکتا ہے جب ہم کسی بھی معاملہ کو پوری طرح سوچ سمجھ کر منصوبہ بندی کریں۔ مختصر مدتی منصوبے آپ کو وقتی تسلی بخش نتائج دینے میں ناکام کر سکتے ہیں۔ اور اگر ہم اس طرح کہ خود ساختہ اسلوب کی پیروی کریں گے تو ہم لازمی طور پر مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں ناکام ہو جائیں گے۔

قدرت نے اس بیج کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ کھیرے پیدا کرنے کے لیے فطرت کو چند ماہ درکار ہوتے ہیں۔ لیکن اگر شاہ بلوط کا درخت اُگانا ہو تو اُسے نصف صدی سے زیادہ عرصہ درکار ہوتا ہے۔ معاشرے کی تشکیل یا قومی تعمیر کا کام کھیروں کی بیل کی طرح نہیں، بلکہ شاہ بلوط کے درخت کی نشوونما جیسا ہوتا ہے۔ اگر ہم قومی تعمیر کا آغاز درست طریقہ سے کرتے ہیں، تو ایک وقت آئے گا جب قومی تعمیر بلندیوں کو چھوئے گی۔ تاہم اگر ہم صحیح طریقہ اختیار نہیں کرتے پھر ہزاروں سال کی کوشش کے باوجود بھی، ہم اپنے اہداف حاصل کرنے کے قابل نہیں ہوں گے۔



تکبر اور انکساری کے درمیان کیا ہے

اگر انسان دوسروں کے تعاون کا اعتراف کرے تو یہ اُس کے اندر انکساری اور مثبت سوچ پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔

اُتر پردیش کے ایک کامیاب وکیل نے یونٹیک گالف کنزی ہومز نو نیڈا میں جائیداد خریدنے کا فیصلہ کیا۔ اُس کے ایک دوست نے اُس سے پوچھا کہ وہ اتنے مہنگے علاقے میں جائیداد کیوں خریدنا چاہتا ہے۔ اُس نے جواب دیا: ”کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ اُس کی مرسیڈز کار سینڈوکار کے ساتھ پارک ہو۔“

اس وکیل نے اس طرح کی بات کیوں کی؟ اصل میں اُس نے اپنی کار کو محض تجارتی مال خیال کیا۔ وہ صرف یہ جانتا تھا کہ اُس کے پاس مرسیڈز کار خریدنے کے لیے رقم تھی، لہذا اُس نے مطلوبہ رقم ادا کر کے کار خرید لی۔ جب کہ وہ سارے معاملے کو درست طور پر سمجھ نہ سکا۔ کیونکہ کار بجائے تجارتی مال کے ایک ربانی تحفہ ہے۔

خدا نے انسان کو پیدا کیا، پھر اُس کو سفر کرنے کے لیے قدرتی سواری یعنی گھوڑے، اونٹ، خچر اور اس طرح کے دوسرے جانور دیئے۔ یہ ٹرانسپورٹیشن کا پہلا مرحلہ تھا۔ خدا کے علم میں تھا کہ یہ انسان کے لیے کافی نہ ہوگا۔ لہذا اُس نے امکانی طور پر دنیا میں دوسرے ذرائع سفر رکھ دیئے۔ یہ امکان مشینی گاڑیاں تھے۔ خدا کا عطا کردہ دماغ استعمال کر کے، انسان نے فطرت کی بہت سی نعمتیں دریافت کیں، اور یوں وہ رفتہ رفتہ پہیہ اور مختلف چیزیں ایجاد کرنے کے قابل ہوا۔ پھر ایک طویل تحقیق کے بعد اُس نے پہیوں والی گاڑی ایجاد کی۔ اسی طرح بائیسکل اور کار ایجاد ہوئی۔ درپردہ جدید گاڑیاں خدا کی ودیعت کردہ ہیں۔ کیونکہ بہت سے ممالک اور اُن کے شہری اس پوشیدہ سفری سہولت کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے کئی صدیاں جدوجہد کرتے رہے۔ لہذا ہمیں ان گاڑیوں کو انسانیت کی طرف سے بھی ایک تحفہ سمجھنا چاہیے۔ اگر کوئی ساری تاریخ پر غور کرے، تو وہ سب سے پہلے خدا کی عظمت کا اعتراف کرے گا۔ مذہبی نقطہ نظر سے اس اعتراف کو خدا کا شکر کہا جائے گا۔ پھر جب وہ سوچے گا کہ انسانیت نے جدید گاڑیوں کے بنانے میں کتنی

سخت جانی سے کام کیا ہے۔ تو وہ لامحالہ انسانیت کا بھی شکر گزار ہوگا۔ کیونکہ انسانیت کی اجتماعی کوشش سے پہلے کاربنائی گئی، اور پھر اسے عام استعمال کے لیے تجارتی نقطہ نظر سے بنایا گیا۔ اس تمام تاریخ کو ذہن میں رکھتے ہوئے، ایک آدمی سمجھ جائے گا کہ کار تو خدا کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اور انسانیت نے اسے تجارتی سطح تک پہنچانے کے لیے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ جب کوئی اس زاویے سے سوچے گا۔ وہ سب سے پہلے خدا کا پھر انسانیت کا شکر گزار ہوگا۔ اور اسے معلوم ہو جائے گا کہ وہ دھن دولت جس کے بل بوتے پر اس نے کار خریدی ہے، اس کی اہمیت تو آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے۔

وکیل کا مندرجہ بالا جملہ ہر شخص کی ذہنی عکاسی کرتا ہے۔ لہذا لوگوں میں کوئی تمیز نہیں کی جاسکتی۔ ماسوائے یہ کہ ان کے کہنے کے انداز جدا جدا ہیں۔ ورنہ ہر مرد و عورت ایک سطح پر سوچ رہا ہے۔ تاہم یہ کوئی سرسری سی بات نہیں ہے جس سے صرف نظر کیا جائے۔ کیونکہ جو لوگ اس طرح کی ذہنیت رکھیں گے وہ متکبر بن جائیں گے۔ اس کے برعکس، وہ لوگ جو یہ سوچیں گے۔ کہ یہ چیزیں جو وہ بازار سے خرید کر لائے ہیں وہ ایک زاویہ سے خدائی، اور دوسرے زاویہ سے انسانی تحفہ ہیں۔ اور ان کا ان چیزوں کو وجود میں لانے سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ تو وہ منکسر المزاج بن جائیں گے۔ اور اپنے اندر عاجزی محسوس کریں گے۔ اور یہ بات ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انکساری و عاجزی سے بڑی کوئی اخلاقی صفت نہیں ہے۔

اگر ایک آدمی دوسروں کی معاونت (Contribution) کا اعتراف کر لے، یہ اس کے اندر انکساری اور مثبت سوچ پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔ اس طرح کارویہ اور سوچنے کا انداز ہر طرح کی سماجی اچھائی کا ذریعہ بنے گا۔ اور اگر آدمی انسانی تمدن کی ترقی میں دوسروں کی شرکت کو جاننے میں ناکام ہو جائے تو معاشرے میں تکبر اور غرور پھیلے گا۔ جو کہ تمام سماجی برائیوں کی بنیادی وجہ ہوتا ہے۔



امن کی طاقت

امن کا دائرہ کار ایک وسیع نوعیت کا ہے۔ کیونکہ یہ فرد واحد اور قومی سطح پر یکساں طور قابل اطلاق ہوتا ہے۔ آپ پُر امن راستے کا انتخاب کریں، آپ کی کامیابی حتمی ہے۔ امن کی طاقت تشدد کی نسبت زیادہ موثر اور زیادہ طاقتور ہے۔ تعمیری اہداف صرف پُر امن ذرائع سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ جب کہ تشدد کا حاصل تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

بھارت کی ماضی قریب کی تاریخ میں ایک بہت ہی فکر انگیز مثال موجود ہے۔ 1857 کی جنگ آزادی میں اُس وقت کے راہنماؤں نے انگریز راج سے نجات حاصل کرنے کے لیے تشدد کا راستہ اختیار کیا۔ یہ رجحان بغیر کوئی ہدف حاصل کیے 1919 تک جاری رہا۔ یہی وہ سال ہے جب مہاتما گاندھی (1869-1938) آزادی کی جدوجہد میں شامل ہو گئے۔ حالات کا جائزہ لینے کے بعد، انھوں نے تشدد کے راستے سے واپسی کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ وہ آزادی کی جدوجہد پُر امن طریقہ سے جاری رکھیں گے۔ انھوں نے واضح طور پر کہا کہ سابقہ راہنماؤں کی آزادی کے لیے انگریزوں کے خلاف تشدد کا بم استعمال کرتے تھے۔ لیکن وہ آزادی کے لیے امن کا بم استعمال کریں گے۔

مہاتما گاندھی جی کے اعلان نے ساری کایا پلٹ دی۔ انگریز حکومت کے سارے تانے بانے جام ہو کر رہ گئے۔ وہ اس اعلان سے اتنے حواس باختہ ہوئے کہ ایک برٹش کلکٹر نے اپنے سیکرٹریٹ کو ان الفاظ میں ٹیلی گرام بھیجا ”ہدایات مہیا کریں کہ کیسے ایک شیر کو بغیر تشدد کے ہلاک کیا جائے“

پُر تشدد ایکشن آپ کے مخالف کو پُر تشدد انتقام کا موقع دیتا ہے۔ دوسری طرف اگر آپ پُر امن لائحہ عمل اختیار کرتے ہیں۔ تو آپ کے مخالف کے پاس کوئی جواز نہیں ہے کہ وہ آپ کے خلاف طاقت کا استعمال کرے۔ مہاتما گاندھی کی عدم تشدد پالیسی میں یہی منطق تھی جس نے ہندوستان کی آزادی کو ممکن بنایا۔

امن کا دائرہ کار ایک وسیع نوعیت کا ہے۔ کیونکہ یہ فرد واحد اور قومی سطح پر یکساں طور قابل اطلاق ہوتا ہے۔ آپ پر امن راستے کا انتخاب کریں، آپ کی کامیابی حتمی ہے۔ اس کے برعکس پر تشدد طریقہ بہت خطرناک ہے۔ اس کے نقصانات یقینی اور فوائد مشکوک ہیں۔ پر امن منصوبہ بندی بغیر کسی خطرے کے کامیابی کی ضمانت ہے۔

پر امن پلاننگ کیوں اتنی موثر ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ پر امن پلاننگ انسان کے ضمیر کو مخاطب کرتی ہے۔ جب انسان کے ضمیر پر چوٹ پڑتی ہے تو متعلقہ شخص کے پاس جھک جانے کے سوا کوئی راستہ نہیں بچتا۔

لیکن پر تشدد انداز پر امن پلاننگ سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ فریق مخالف کی انا کو بری طرح مجروح کرتا ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ جب کسی کی انا کو ٹھیس پہنچتی ہے تو وہ اور خطرناک ہو جاتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ نقصان کی صورت میں نکلتا ہے۔ تشدد کے نتیجے میں لازماً تشدد جنم لیتا ہے۔ مسائل اشخاص کے ہوں یا اقوام کے تشدد مسائل کو حل کرنے کے بجائے اور پیچیدہ کر دیتا ہے۔

پر امن طریقہ قدرت کا طریقہ ہے، یہ ناقابل تغیر قانون ہے۔ قدرت کا شکر ادا کریں جو ہمیشہ امن کے راستے پر گامزن رہی ہے اس لیے ہم قدرت میں ہر جگہ کاملیت (Perfection) پاتے ہیں۔ قدرت مختلف کاموں میں مشغول ہونے کے باوجود کبھی کوئی پریشانی پیدا نہیں کرتی ہے۔ یقینی طور پر اسی کی وجہ قدرت کا مستقل مزاجی سے پر امن خطوط پر اپنی اسکیم پر عمل پیرا ہونا ہے۔

ایک اہم پہلو اس پر امن منصوبہ بندی کا یہ ہے کہ یہ وقت اور توانائی کو ضائع ہونے سے بچاتی ہے۔ جہاں تشدد عام حالات کو خراب کر کے تباہی کی سطح پر لے جاتا ہے۔ وہاں مسلسل پر امن حالات کو متوازن رکھتے ہوئے تعمیری راہ ہموار کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ تشدد صرف نفرت اور عدم برداشت پیدا کرتا ہے۔ جب کہ امن محبت اور ہمدردی کو پروان چڑھاتا ہے۔ امن سب سے اعلیٰ معاشرتی خوبی ہے کیونکہ یہ لوگوں کے درمیان مثبت سوچ کو فروغ دیتی ہے۔ جہاں کہیں امن ہوگا۔ وہاں ترقیاتی سرگرمیاں تیز ہوں گی۔ اور پر امن ماحول کے بغیر آپ جو چاہے

کریں ترقی ممکن نہیں ہے۔

ستارے، سیارے اور قدرت کے دیگر حصے شب و روز اپنے اپنے راستے پر مسافر ہیں اُن میں سے کبھی کوئی امن کے راستے سے نہیں بھٹکا ہے۔ فطرت کا کلچر امن ہے اور امن کائنات کا قانون ہے۔ بہتے دریا امن کا پیغام لے کر چلتے ہیں۔ دن رات چلنے والی ہوائیں اسی پیغام کو نشر کرتی ہیں: اے انسان، امن کا راستہ اختیار کر، اور دنیا کا ایک صحت مند حصہ بن۔



جلد بازی نہ کریں

ہر شعبہ میں انسان کو قدرتی راستے کی پیروی کرنی چاہیے
ورنہ وہ کوئی بھی قابل ذکر ہدف حاصل نہیں کر سکتا

ایک آدمی جو درختوں کو بہت پسند کرتا تھا اُس کی خواہش تھی اُس کے گھر کے صحن میں ہرا بھرا درخت ہو، اُس نے سوچا، کہ اگر وہ اپنے صحن میں پودا لگائے تو اُس کے درخت بننے میں تو طویل مدت درکار ہوگی۔ لہذا اُس نے باغ میں جا کر ایک بڑے درخت کا انتخاب کیا، اور کئی مزدور لگا کر اُس کے ارد گرد گڑھا کھدوا کر اُسے وہاں سے نکالا اور اپنے صحن میں جہاں اُسے لگانا تھا وہاں جا کر لگا دیا

پھر وہ آدمی بہت خوش ہوا۔ اور اُس نے اپنے دل میں کہا کہ اُس نے ایک طویل سفر ایک دن میں طے کر لیا ہے بیج بونا اور پودا اُگانا پھر اُس سے درخت کا بننا ایک بہت لمبا عمل تھا۔ میں نے ہرے بھرے درخت کو جلد لگانے کا طریقہ ڈھونڈ لیا ہے۔

لیکن اگلی صبح اُس کے لیے خوشی کا باعث نہ تھی کیونکہ جب اُس کی نظر درخت پڑی تو اُس کے پتے مڑھ چکے تھے، اُس کی شاخوں کی تازگی جاتی رہی تھی دیکھتے ہی دیکھتے چند دنوں کے اندر سرسبز درخت ایک خشک لکڑی بن گیا تھا۔ جب اُس نے خشک درخت کو دیکھا تو وہ بہت مایوس ہوا۔ پھر ایک دن ایک دوست اُس کے گھر آیا اور اُس نے درخت لگانے والے کو بہت افسردہ پایا۔ جب اُس نے افسردگی کی وجہ پوچھی تو اُس نے کہا: 'میں جلدی میں تھا لیکن خدا کو جلدی نہ تھی'

یہ حکایت ہمیں بتاتی ہے کہ یک دم چھلانگ لگانے کے بجائے فطرت کے قانون کی بنیاد بتدریج نشوونما پر ہے۔ جو کوئی فطرت کے اس قانون کی پیروی کرے گا وہ کامیاب ہوگا۔ اور جو کوئی اس قانون کی خلاف ورزی کرے گا ناکامی اُس کا مقدر بنے گی۔

قدرت کے قانون کا اطلاق صرف درختوں پر ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ ایک آفاقی قانون ہے۔ اس لیے ہر شعبہ میں انسان کو اس فطری قانون کی پیروی کرنی چاہیے: ورنہ وہ کوئی بھی قابل ذکر ہدف حاصل نہیں کر سکتا

یہ کیوں ہوا کہ جب تک درخت باغ میں تھا وہ ہر ابھرا تھا جب وہ صحن میں منتقل کیا گیا تو وہ خشک ہو گیا اس کی وجہ یہ ہے جب وہ باغ میں تھا تو اُس کی جڑیں سالم اور مضبوط تھیں جب وہ صحن میں منتقل کیا گیا تو اُس کی جڑیں کٹ گئیں۔ جو کہ اُس کی زندگی کی ضامن تھیں۔ بغیر جڑوں کے ایک درخت ایک خشک لکڑی ہوتا ہے نہ کہ ہر ابھرا شجر۔

یہ فطرت کا قانون ہے جس کا اطلاق تمام انسانی سرگرمیوں پر ہوتا ہے۔ ہر کاروبار، ہر پیشہ اور ہر ادارے کی مضبوط جڑیں ہونی چاہیے اس قانون فطرت سے کسی کو استثناء نہیں ہے۔ مثال کے طور پر تعلیم نوکری کی، اچھی شہرت کاروبار کی اور انفراسٹرکچر قومی ترقی کی بنیاد ہے۔ مضبوط بنیاد کی تعمیر کے لیے طویل وقت درکار ہوتا ہے۔ آپ یہ بنیاد بغیر سوچے سمجھے چھلانگ لگا کر حاصل نہیں کر سکتے۔ جب آپ کسی چیز کو حاصل کرنے میں جلد بازی کرتے ہیں تو قانون قدرت کی نفی کرتے ہیں۔ آپ اپنے خیال کے مطابق اپنی دنیا بنانا چاہتے ہیں۔ جب کہ جلد بازی کا طریقہ اس دنیا میں ممکن نہیں ہے۔ وہ لوگ جو بتدریج طریقہ کار کو اختیار کرتے ہیں وہ فطرت سے معاونت (Support) حاصل کرتے ہیں۔ فطرت کی معاونت کے بغیر اس دنیا میں کوئی کامیابی ممکن نہیں ہے۔

خدا نے فطرت کو یہ بتدریج طریقہ کا حکم کیوں دیا۔ خدا نے یہ حکم اس لیے دیا ہے اس طریقہ سے کائنات میں استحکام آتا ہے۔ اگر آپ چھلانگ لگا کر کچھ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ تو اس کا حاصل خشک درخت کی شکل میں ملے گا۔ لیکن جب آپ بتدریج طریقہ کار اختیار کریں گے، تو آپ اپنی کامیابی کو یقینی بنائیں گے۔



شہد مکھی کلچر

کشید کریں جو آپ کو پسند ہے اور جس چیز کی آپ کو ضرورت نہیں اُسے ترک کر دیں۔ اپنا وقت شکایت اور احتجاج میں ضائع نہ کریں

شہد کی مکھی کا معمول ہے کہ ہر روز اپنے چھتہ سے اُڑتی ہے، اور جہاں اُس کے لیے پھول ہوں وہاں وہ پہنچ جاتی ہے۔ پھر وہ پھولوں سے نیکٹر حاصل کر کے واپس اپنی منزل پر آ جاتی ہے۔ وہ کسی دوسری طرف کوئی توجہ نہیں دیتی ہے۔

جہاں پھول ہوتے ہیں، وہاں کانٹے بھی ہوتے ہیں لیکن شہد کی مکھی کانٹوں کو نظر انداز کرتی ہے وہ اپنا وقت کانٹوں کی شکایت پر ضائع نہیں کرتی ہے۔ وہ صرف پھولوں سے نیکٹر کشید کرتی ہے اور اپنے چھتہ میں واپس آ جاتی ہے۔ شہد کی مکھی کا یہ رویہ انسان کے لیے ایک علامتی سبق ہے: 'شہد کی مکھی کی طرح زندگی گزارو۔ جو چیز اچھی ہے وہ لے لو اور جو چیز ناپسندیدہ ہے اُس کو نظر انداز کر دو۔ احتجاج اور شکایات میں اپنا وقت ضائع نہ کرو۔

عام طور پر جب لوگوں پر تنقید کی جاتی ہے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ چونکہ لوگوں کا یہ رویہ فطرت کے منصوبے کے خلاف ہے۔ اس لیے انہیں اپنے اس رویے کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اُس 'نیکٹر' مثلاً اچھا سبق، دانائی، بہترین نصیحت سے محروم کر لیتے ہیں جو کہ اُن کے لیے ہر چیز اور ہر واقعہ میں دستیاب ہے۔ ہر شخص کا ماحول اپنے اندر اس نیکٹر کو رکھتا ہے۔ انسان کو اپنے اندر یہ قابلیت پیدا کرنی چاہیے کہ وہ نیکٹر کو لے، اور دوسری چیزوں سے صرف نظر کرے۔ ہر مردوزن کا اپنے مقصد حیات کو پیش نظر رکھ زندگی گزارنا انتہائی اہم ہے۔ کیونکہ صرف با مقصد ذہن ہی ترقی کرتا ہے۔ جب آپ مشتعل ہو جاتے ہیں تو در حقیقت آپ دوسرے آدمی کو یہ اجازت دے دیتے ہیں کہ وہ آپ کی نظروں سے آپ کے مقصد حیات کو اوجھل، اور آپ کی یکسوئی کو منتشر کر دے۔

خدا کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، ہر انسان ایک پھول کی مانند ہے۔ ہر کسی کے پاس

اچھے تجربات کی صورت میں نیکٹر دستیاب ہے۔ تاہم اس آفاقی نیکٹر کو حاصل کرنے کی ایک شرط ہے کہ آپ جب کسی سے گفت و شنید کریں، تو ہرگز مشتعل نہ ہوں۔ چاہے آپ کا مخاطب جو مرضی کہے۔ ہمیں شہد کی مکھی کا طرز عمل اپنانا چاہیے۔ کیونکہ یہ ہی دوسروں سے سیکھنے کا طریقہ ہے جو آپ کو کامیاب شخصیت بننے میں مدد دے گا۔



توسیع سے پہلے مضبوط بنیاد بنانے کی ضرورت ہے

اگر معاشرے میں کوئی حقیقی تبدیلی لانا چاہتے ہیں۔ تو سب سے پہلے آپ کو فرد واحد کی سوچ اور عمل میں تبدیلی لانی چاہیے

درخت فطرت کا عجوبہ ہے۔ اس کی مضبوط جڑیں زمین کے اندر، بلند تناسخ سطح ارض سے اوپر اور شاخیں چاروں طرف اُونچائی پر پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس فطرت کے اصول کا اطلاق انسانی دنیا پر بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ انسانی زندگی میں حقیقی تبدیلی اس اصول کی پیروی کر کے لائی جاسکتی ہے۔ پہلے مضبوط بنیاد، پھر توسیع۔ مضبوط بنیاد سے مراد یہ کہ پہلے اچھی طرح نیو (Base) جمالو۔ توسیع سے مراد ہے کہ ہر جگہ پھیلنا ہے۔

اگر آپ معاشرے میں کوئی حقیقی تبدیلی لانا چاہتے ہیں۔ تو سب سے پہلے آپ کو فرد واحد کی سوچ اور عمل میں تبدیلی لانی چاہیے۔ مثلاً اگر آپ ایک کامیاب سیاسی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔ تو لوگوں کی ایسی تربیت کریں کہ وہ اس نظام کو قبول کریں۔ اسی طرح اگر آپ اداروں کو کامیابی سے چلانا چاہتے ہیں۔ تو اس کے لیے آپ فرد واحد کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کریں۔ کیونکہ فرد واحد ہی سماجی عمارت کی بنیاد ہوتا ہے۔ اگر آپ معاشرے میں تبدیلی لانے کے خواہش مند ہیں، تو سب سے پہلے آپ کو فرد کے اوپر توجہ دینی ہوگی۔ بغیر کسی مضبوط اساس کے کسی عمارت کو کھڑا کرنا ریت کے ایسا گھر وندے کی مانند ہوگا جو جلد ڈھے جاتا ہو۔



خدا کا تصور

سائنس دانوں نے صرف مخلوق کو دریافت کیا ہے۔ تاہم مخلوق کی دریافت کے ساتھ ساتھ خالق کی دریافت بھی ہوئی ہے۔

بہت سے لوگ جو اپنے آپ کو سیکولر کہتے ہیں وہ خدا کے وجود کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کی سب سے بڑی ایجاد خدا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان خدا کی ایک بڑی اعلیٰ تخلیق ہے۔ زمانہ قدیم سے فلسفی 'خدا کے وجود کے موضوع پر بحث کناں ہیں۔ لیکن وہ کسی نتیجہ خیز مقام پر نہ پہنچ سکے۔ دوسری طرف گلیلیو اور نیوٹن نے نئے سائنسی طریقے استعمال کیے۔ سائنس دان اپنے موضوع کو فطرت کا مطالعہ کا نام دیتے ہیں۔ اگرچہ خدا سائنس کا موضوع نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ فطرت کیا ہے؟ ہم صاف طور کہہ سکتے ہیں کہ مخلوق کا دوسرا نام فطرت ہے۔ بالفاظ دیگر خدا کا ذکر کیے بغیر سائنس کا علم فطرت کا مطالعہ ہے۔

نیوٹن کے دور میں سائنس دانوں کا خیال تھا کہ کائنات ایک مشین کا سا ڈیزائن رکھتی ہے۔ بعد ازاں، ارنسٹ روتھر فورڈ نے دریافت کیا کہ کائنات ایک با معنی ڈیزائن رکھتی ہے۔ اس کے بعد، فرید حویلی کے دور میں یہ دریافت کیا گیا کہ کائنات ایک ذہین ڈیزائن کی حامل ہے۔

ان دریافتوں کی روشنی میں یہ کہنا مناسب ہوگا، کہ خدا عقل دانش کی سطح پر دریافت ہو چکا ہے۔ بس سارا کا سارا معاملہ نام کا ہے۔ دوسرے الفاظ میں سوال صرف یہ ہے کہ جو حقیقتیں دریافت ہو چکی ہیں ان کے لیے کیا اصطلاح استعمال کی جائے۔ کچھ فلسفی اس حقیقت کو دنیا کی روح کہتے ہیں کچھ سائنس دان ذہین ڈیزائن کا نام دیتے ہیں۔ اور مختلف مذاہب کے ماننے والے اس حقیقت کو خدا کہتے ہیں۔

سائنس دانوں نے صرف مخلوق کو دریافت کیا ہے۔ تاہم مخلوق کی دریافت کے ساتھ ساتھ خالق کی دریافت بھی واقع ہوتی ہے۔



داخلی اور خارجی روحانیت

جو سادہ طرز زندگی اختیار کرتا ہے وہ نہ اپنے لیے مسائل کھڑے کرتا ہے نہ دوسروں کے لیے، اور جو کوئی مثبت فکر کو اختیار کرتا ہے وہی حقیقت میں بے غرض انسان ہوتا ہے۔
مرد اور عورت کا سب سے اعلیٰ وصف روحانیت ہے جو کہ داخلی اور خارجی طور دو پہلو رکھتا ہے:- داخلی پہلو مثبت سوچ، اور خارجی پہلو پُر امن رہنا۔ روحانیت کسی بھی پہلو سے از حد مسرت کا نام نہیں ہے جو کہ عام طور پر کہا جاتا ہے۔
یہ غیر مادیت پسند کلچر ہے جس کا مطلب ہے مادیت کے مقابلے میں غیر مادی اقدار کو زیادہ اہمیت دینا۔ جوہری طور پر یہ سادہ طرز زندگی اور مثبت سوچ کو فروغ دیتا ہے۔ جو کہ انسانیت کی اخلاقی اساس ہے۔

جو سادہ طرز زندگی اختیار کرتا ہے وہ اپنے لیے مسائل کھڑے کرتا ہے نہ دوسروں کے لیے۔ مزید یہ کہ جو مثبت فکر کو اختیار کرتا ہے وہی حقیقت میں بے غرض انسان ہوتا ہے۔ معاشرے میں جو انسانیت سوز سرگرمیاں واقع ہوتی ہیں وہ زیادہ تر لوگوں کے مادی تنازعات کے نتیجے میں ہوتی ہیں۔

لیکن اگر کوئی شخص روحانی اقدار کی پیروی کرے، تو وہ مادیت پرستی سے بالا ہو سکتا ہے جس کے انتہائی مثبت نتائج پیدا ہوں گے۔ جو کوئی ایسا کرے گا وہ معاشرے کا ایک انتہائی مفید رکن ثابت ہوگا۔ اور جو معاشرہ اس طرح کہ روحانی افراد پر مشتمل ہوگا وہ ایک پُر امن معاشرہ بن کر سامنے آئے گا۔

روحانیت فطرت کا کلچر ہے جس کا اظہار فطرت مختلف طریقوں سے کرتی ہے۔ گلاب کے پودے کی مثال لیجیے، گلاب کا پودا مکمل طور پر دو مختلف عناصر پھول اور کانٹے کا مجموعہ ہوتا ہے۔ دونوں ایک ہی شاخ پر رہتے ہیں۔ مگر ان کے درمیان کوئی تنازع کھڑا نہیں ہوتا ہے۔ یہ ہی وہ خوبی ہے جو کہ گلاب کے پھول کو بہت خوبصورت اور فکر انگیز بنا دیتی ہے اور ہمیں اس طرف متوجہ کرتی ہے کہ ہمیں کیسے مختلف معاشرے کے عناصر کے درمیان بغیر کسی الجھاؤ کے زندگی بسر

کرنی چاہیے

روحانیت انسان کا مکمل طور پر داخلی معاملہ ہے۔ لیکن خارجی طور پر اس کے فوائد دوسروں تک پہنچتے ہیں۔ داخلی روحانیت انسان کو اچھا انسان بناتی ہے۔ جب کہ خارجی روحانیت افراد معاشرہ کے درمیان باہمی ہم آہنگی کو یقینی بناتی ہے۔ اگر روحانیت ایک درخت ہے، تو روحانی افراد اس کے پھول ہیں۔

اگرچہ روحانیت فرد واحد کو سچا انسان بناتی ہے۔ لیکن صرف سچا انسان ہونا کافی نہیں ہے۔ بلکہ آدمی کی روحانیت کا اثر اپنے ماحول پر نظر آنا چاہیے۔ لازمی طور پر اس کی بلند روحانی اقدار دوسروں سے معاملات طے کرتے ہوئے دکھائی دینی چاہیے۔ مزید جب کسی سے تنازع پیدا ہو جائے۔ تو اُسے پُر امن طور پر صلح صفائی سے تنازعات کو حل کرنا چاہیے۔ ہر صورت حال میں، اُس کو کھلے منہ سے تجربات کو مثبت میں بدلنے کی اپنی صلاحیت دیکھنا چاہیے۔

مثبت سوچ رکھنے والے مرد و عورت روحانی مالی کی طرح ہوتے ہیں جو دوسرے کے ساتھ معاملات طے کرتے ہوئے معاشرے کو ایک روحانی باغ میں بدلتے ہے۔ خارجی روحانیت سے مراد ہے کہ مختلف روحانی اقدار کو عمل میں لانا۔ یہ روحانی آدمی اور اُس کے ہمسائے دونوں کے لیے فائدہ مند ہے۔ یہ فرد واحد کو ایک مطمئن شخص بناتی ہے۔ اور اُس کے ماحول کو معاشرتی مسائل سے یقینی طور پر نجات دلاتی ہے۔

روحانیت ایک سائنس ہے، یہ ذہن کی سائنس ہے۔ یہ مثبت فکر، مثبت ذوق اور مثبت عادات کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ایک روحانی شخص اپنے گھر، اپنے معاشرے اور اپنی قوم کے لیے ایک نعمت ہوتا ہے۔ سیکولر اصطلاح میں روحانیت مثبت طرز فکر کا نام ہے، اور مذہبی اصطلاح میں یہ ربانی ڈسپلن کا نام ہے۔

☆☆

ذہنی دباؤ ایک مثبت خوبی

ذہنی دباؤ کوئی خامی نہیں ہے۔ یہ نظام فطرت کا لازمی حصہ، اور ایک مثبت سرگرمی ہے۔ ہمارے

جسم کو حرکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر جسم میں حرکت باقی نہ رہے تو یہ بے جان سمجھا جائے گا۔ آج کل ذہنی دباؤ عام سی بات ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لیے ہر طرح کی تکنیک استعمال کرنے کے باوجود یہ مرض اپنی جگہ قائم ہے۔ حقیقت میں ذہنی دباؤ ختم کرنے کے لیے جو نئے نئے طریقہ اختیار کیے گئے وہ نئے نئے انداز میں ذہنی دباؤ لانے کا باعث بنے ہیں۔ جیسے کہ آج کل چھٹی کا دباؤ (Holiday stress) بھی ہے۔ نئے نئے طریقوں کی ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اپنی فطرت کے خلاف طرز عمل اختیار کیے جا رہے ہیں۔ اس لیے وہ اس مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام ہیں۔

ذہنی دباؤ کوئی خامی نہیں ہے۔ یہ نظام فطرت کا لازمی حصہ، اور ایک مثبت سرگرمی ہے۔ جیسے ہمارے جسم کو حرکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر جسم میں حرکت باقی نہ رہے تو یہ بے جان سمجھا جاتا ہے۔ ویسے ہی ہمارے دماغ کو بھی تحریک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ذہنی دباؤ اسی تحریک کا اہتمام کرتا ہے۔ اس لیے دباؤ کوئی منفی سرگرمی نہیں ہے، بلکہ ایک دانشورانہ سرگرمی ہے۔ دباؤ محسوس کرنا صحت مند دماغ کی علامت ہے۔ اگر انسان ذہنی طور پر متحرک ہے تو وہ اس قابل ہے کہ دباؤ کو عام معمول کی بات لے جیسے ایک جسم کی حرکت ہوتی ہے۔ یہ دباؤ ہی ہے جو انسان کے دماغ کو زندگی دیتا ہے۔ دباؤ کے بغیر دانشورانہ عمل رک جاتا ہے۔ نتیجتاً عقلی جمود طاری ہو جاتا ہے۔

انسانی تاریخ کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد، آرلڈ ٹائن بی (1889-1975) نے ایک نظریہ پیش کیا جس کے مطابق، تہذیب و تمدن انسان کی اعلیٰ حیاتیاتی شکل کی وجہ سے وجود میں نہیں آیا ہے، بلکہ انسان نے انتہائی مشکل حالات میں جو چیلنجز قبول کیے تھے اور ان کو پورا کرنے کے لیے جو باکمال جدوجہد کی تھی اُس کا ثمر جدید تہذیب و تمدن کی شکل میں رونما ہوا ہے۔۔۔ مزید ٹائن بی نے چیلنجز کو بُرے اور اچھے درجات میں تقسیم کیا۔ اور کہا کہ بُرے چیلنجز غیر اہم اور معمولی چیلنجز ہیں، البتہ اچھے چیلنجز قوم کے لیے ایک نعمت ہیں کیونکہ یہ قوم کو تہذیب و تمدن کی ترقی کی طرف ابھارتے ہیں۔

دباؤ کے بارے میں بھی یہ بات سچ ہے۔ اگر انسان دباؤ کو کنٹرول نہ کر سکے۔ تو وہ ایک

ہیجان انگیز کیفیت میں مبتلا ہو جائے گا۔ اور مسائل کی گتھی سلجھانے کی صلاحیت کھو بیٹھے گا۔ اور اس طرح کا دباؤ مہلک ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص اپنے دباؤ کو قابو (Manage) کرنے کی اہلیت رکھتا ہے تو یہ دباؤ اُس کے لیے نعمت میں بدل جائے گا۔

مثال کے طور پر، تحریک آزادی کے دور میں دو قسم کے قائدین (Leaders) تھے اُن میں کچھ کانگریس کے ہمنوا اور کچھ مسلم لیگ کے حامی تھے۔ اتفاق سے اُس دور میں مجھے اُتر پردیش جانا ہوا۔ وہاں میری ملاقات محترم محمود صاحب ایل ایل بی سے ہوئی جو کہ مسلم لیگ کے حامی تھے۔ انھوں نے مجھے اپنے ایک کانگریسی دوست سے ملوایا۔ میں نے محمود صاحب سے کہا کہ آپ دونوں دو مخالف سیاسی دھڑوں سے تعلق رکھنے کے باوجود دوستی رکھے ہوئے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہوا۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے اختلاف پر اتفاق کر لیا ہے“۔ حقیقت میں انھوں نے یہ فارمولہ اختیار کر کے اپنے آپ کو دباؤ سے محفوظ کر لیا تھا۔

اپنے دورہ امریکہ کے دوران میرا قیام ایک ایسے بزنس مین کے گھر رہا، جو پچھلے چالیس سال سے امریکہ میں رہ رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا وہ ہمیشہ ہشاش بشاش رہتے ہیں کبھی کوئی دباؤ کی علامت اُن کے چہرے پر نظر نہ آتی تھی۔ جب کبھی اُن کو ناگوار صورت حال پیش آتی تو وہ کہتے: ”چلو یہ بھی ٹھیک ہے“۔ ایک دن میرے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ ہوا۔ ہوا یوں کہ میں نے خود تجویز کیا کہ ہمیں کل کہیں سیر و سیاحت کے لیے چلنا چاہیے۔ انھوں نے میری ہاں میں ہاں ملائی اور تیار ہو گئے اور اگلی صبح وہ آئے اور کہا: ”میں بالکل تیار ہوں میں نے آج کی اپنی تمام مصروفیات ملتوی کر دی ہیں۔ چلو اب چلیں۔“

میرا باہر جانے کو من نہیں کر رہا تھا اس لیے میں نے گھر پر رہنے کو ترجیح دی۔ جب انہیں میری خواہش کا علم ہوا تو انھوں نے بغیر ماتھے پر تیوری ڈالے کہا ”چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔“ میں نے اُن سے پوچھا آپ کا عام آدمی سے بالکل مختلف رویہ ہے اس کی کیا وجہ ہے۔ وہ ہنسے اور کہا خدا نے مجھے اِس سانچے میں ڈھالا ہے۔

آپ کو زندگی میں دباؤ سے جان نہیں چھڑانی چاہیے۔ بلکہ ذہنی دباؤ کو ٹینج (Manage) کرنا کافن سیکھنا چاہیے۔ اکثر ذہنی دباؤ دوسروں کے خلاف شکایت کرنے سے جنم لیتا ہے ہمیں

بجائے شکایت کرنے کے اسے روزمرہ کے معمول کے مطابق لینا چاہیے۔ اگر ہم اس کو شکایت کے انداز میں لیں گے تو یہ ہیجان انگیز دباؤ بن جائے گا۔ اور اگر ہم اس کو روزمرہ کے معمول کے مطابق لیں گے تو اس کی سنگینی جاتی رہے گی۔ برادباؤ پریشانی کا باعث ہے جب کہ اچھا دباؤ دماغ کو متحرک رکھتا ہے۔ بس ذہنی دباؤ کا یہ حل ہے کہ اس کو شکایت سے دور رکھیں اور مسائل کو عام معاملے کی طرح حل کریں۔



گائے کلچر: ذہنی دباؤ سے خلاصی نہایت آسان

ہمیں اپنی شخصیت میں منفی تجربات کو مثبت سوچ میں تبدیل کر دینے

والی صلاحیت کو فروغ دینا چاہیے

میں 1930 میں اتر پردیش کے ایک گاؤں کے مدرسہ میں زیر تعلیم تھا وہاں میں نے ”اردو ریڈر“ میں مشہور شاعر اسماعیل میرٹھی کی ایک نظم بعنوان ”ہماری گائے“ پڑھی۔ اس نظم کا ایک مصرع کچھ یوں تھا:

کل جو گھاس چاری تھی بن میں دودھ بنی وہ گائے کے تھن میں

جو مختلف چیزوں کو دودھ میں بدلتی ہے۔ یہ نظم میرے حافظے میں اتر گئی۔ اس نے مجھے ایک بہترین سبق از بر کر دیا۔ کہ خالق نے گائے کو انسانی رویے کے لیے ایک مثال بنا کر پیش کیا ہے۔ کیونکہ یہ اعلیٰ اخلاق کا درس دیتی ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے کردار میں منفی تجربات کو مثبت سوچ میں تبدیل کر دینے والی صلاحیت کو فروغ دینا چاہیے۔ ہمیں ضرور اس بدل دینے کی صلاحیت کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے۔ تاکہ ہم منفی سوچ کو مثبت سوچ میں بدل سکیں۔

یہ کہا جاتا ہے کہ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ معاشرہ کیا ہے؟ حقیقت میں معاشرہ طرح طرح کے اختلافات کا مجموعہ ہے، ہم معاشرے میں اکثر اشتعال انگیز صورت حال کا سامنا کرتے ہیں۔ ہر روز ہمیں دوسروں کی طرف سے کچھ ناگوار صورت حال کا

تجربہ ہوتا ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب ان معاشرتی تضادات کی وجہ سے ہم غصہ اور دباؤ کا شکار نہ ہوں۔

پھر ایسی صورت میں کیا کیا جائے۔ اس کا جواب گائے کی شکل میں موجود ہے۔ خدا نے گائے کے روپ میں ایک مثال (Model) پیش کی ہے۔ ہمیں گائے کچھ اختیار کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنے اندر منفی کو مثبت میں بدلنے کی صلاحیت پیدا کرنی چاہیے۔ تاکہ ہم منفی صورت حال کو مثبت میں بدل سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہاں ہر شخص کو آزادی ہے ہر کوئی اپنے اختیارات سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ انسان اپنی آزادی کے غلط استعمال پر دسترس بھی رکھتا ہے۔ اور آزادی کا یہ ہی غلط استعمال مسائل کو جنم دیتا ہے۔ ہم لوگوں کی آزادی پر پابندی نہیں لگا سکتے۔ ایسی صورت میں ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں کہ مسائل کو حل (Problem Management) کرنے کا فن سیکھیں۔

موجودہ دنیا ایک امتحان کی جگہ ہے۔ کیونکہ یہاں ہر مرد و عورت کو آزادی حاصل ہے اس لیے یہاں ہر انسان کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ اگر انہیں آزادی کی نعمت میسر نہ تو امتحان بھی نہ ہو۔ یہ آزادی خدا کی ودیعت کردہ (God Given) ہے۔ اس لیے کسی کے پاس یہ اختیار نہیں کہ وہ اس آزادی کو ساقط کر سکے۔ نتیجتاً ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم گائے کا طرز عمل اپنائیں۔ یہ طرز عمل منفی کو مثبت میں بدلنا ہے۔

گائے کچھ سے مراد ہے۔ غصہ کو ضبط کر کے اس کو عنف و درگزر کی خوبی میں، اور اشتعال انگیز صورت حال کو صلح اور امن کی حالت میں بدلنے کا فن سیکھنا۔

معاشرے کو چھوڑ چھاڑ کر جنگل یا پہاڑوں میں جا کر رہنا، روحانیت کی ادنیٰ شکل ہے۔ روحانیت کی اعلیٰ ترین شکل وہ ہے جس کا اظہار گائے کرتی ہے۔ ہمیں افراد معاشرہ کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ پھر دوسروں کی طرف سے ہر طرح کے ناگوار رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن کبھی بھی منفی رد عمل کے اظہار کی کوشش نہ کریں۔ آپ کو گائے کے طرز عمل کو اپنانا چاہیے۔ جیسے گائے گھاس کو دودھ میں بدل دیتی ہے آپ بھی منفی سوچ کو مثبت سوچ میں بدل دیں۔ یہ روحانیت کی سب

سے اعلیٰ شکل ہے۔

اکثر مرد و عورت ذہنی دباؤ کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں وہ سوال پوچھتے ہیں کہ وہ کیا طریقہ ہے جس سے ہم ذہنی دباؤ سے نجات حاصل کر لیں۔ میں انہیں تجویز دوں گا کہ وہ گائے سے سبق سیکھیں۔ وہ اپنے معاملات کی چول بیٹھانے کے لیے گائے کی عادات اختیار کریں۔ اس طرح وہ ذہنی دباؤ سے نجات حاصل کر لیں گے۔ گائے اعلیٰ طرز زندگی پیش کرتی ہے۔ اس طرز عمل کو اختیار کیجیے۔ اور ٹیشن فری زندگی سے لطف اٹھائیں۔

☆☆

اعتراف حقیقت

آپ اپنی طاقت کا ایک با مقصد تخمینہ لگائیں اور پھر فطرت کے قوانین کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کریں۔

مجھے سے ایک دفعہ پوچھا گیا کہ ذہنی دباؤ سے آزاد زندگی گزارنے کا سادہ فارمولا کیا ہے۔ میں نے کہا یہ چند حرفی فارمولا ہے: ”حقیقت کا اعتراف“۔ حقیقت کو تسلیم کریں، اور ذہنی دباؤ اور نفسیاتی کھچاؤ سے آزاد زندگی کا لطف اٹھائیں۔

یہ ذہنی دباؤ اور الجھن (Stress and Tension) کیا ہیں۔ ذہنی دباؤ جسمانی یا دماغی توانائی سے زیادہ مطالبے کا احساس، اور الجھن (Tensions) دماغی تناؤ کی کیفیت ہے۔ لوگ ان برائیوں سے کیوں متاثر ہوتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ زیادہ تر لوگ اپنی سوچ کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ یہ خیال کیے بغیر کے ان سے باہر بھی ایک دنیا ہے۔ جس کی ضروریات لازمی طور پر پوری کرنی پڑتی ہیں۔ ورنہ آپ منفیت کا شکار ہو جائیں گے جس کو عام طور پر ذہنی دباؤ کہا جاتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہماری زندگی ایک کاگ ویل (Cogwheel) کی مانند ہے۔ یہ کاگ ویل ایک دندانے دار پہیہ ہوتا ہے جس کے دندانے دوسرے کاگ ویل سے مشین کی سمت یا رفتار تبدیل کرنے کے لیے ملے ہوتے ہیں۔ زندگی بھی دو پہیوں کی معاونت سے چلتی ہے ایک

پہیہ آپ کا ہے جبکہ دوسرا پہیہ فطرت کا ہے۔ آپ کا پہیہ کمزور اور فطرت کا طاقتور ہے۔ فطرت کے پہیہ کی اپنی رفتار ہوتی ہے آپ کو اپنا پہیہ فطرت کے پہیہ کی رفتار کے مطابق ایڈجسٹ کرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ اپنے پہیہ کو فطرت کے پہیہ سے زیادہ رفتار سے چلانے کی کوشش کریں گے تو آپ کا پہیہ ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ جب کہ فطرت کا پہیہ اپنی رفتار سے چلتا رہے گا۔ یہ اختلاف دباؤ کا باعث بنتا ہے۔ جب لوگ اپنی مرضی کے مطابق اپنا پہیہ چلانا چاہتے ہیں تو فطرت اُن کی مدد نہیں کرتی ہے۔ کیونکہ فطرت کا کاگ ویل مضبوط اور انسان کا کمزور ہے۔ اس لیے عدم مطابقت کی صورت میں یہ انسان ہی ہوگا جو ہمیشہ نقصان برداشت کرے گا۔

اگر آپ اپنی زندگی کی درست منصوبہ بندی حقیقی منصوبہ بندی ہے۔ سب سے پہلے آپ اپنی طاقت کا صحیح تخمینہ لگائیں اور پھر فطرت کے قوانین کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کریں۔ بجائے اس کے کہ آپ قوانین فطرت سے مقابلہ کریں۔ آپ کو چاہیے کہ آپ ان قوانین کے مطابق چلیں۔ اس طریقہ سے آپ یقینی طور پر ذہنی دباؤ سے آزاد زندگی گزاریں گے۔

مثال کے طور پر اگر آپ کسی بین الاقوامی ادارے میں ملازمت حاصل کر لیتے ہیں۔ تو قدرتی طور پر آپ کبھی نہیں چاہیں گے کہ ادارے میں عارضی طور پر ملازم رکھنے اور جب چاہیں برطرف کرنے کی پالیسی کا اطلاق ہو۔ لیکن اس قسم کی خواہش کرنا غیر حقیقی ہے۔ یہ آرزو آپ کو ناگوار پیچیدگیوں کی طرف دھکیل دے گی۔ کیوں کہ یہ ہی طریقہ کار ان اداروں میں اپنایا جاتا ہے۔ اگر آپ ذہنی دباؤ سے آزاد زندگی چاہتے ہیں تو آپ کے پاس صرف دو راستے ہیں۔ یا تو بین الاقوامی کمپنی میں نوکری کر لیں اور اُن کی ملازم رکھنے اور برطرف کرنے کی پالیسی کو قبول کر لیں۔ یا پھر وہاں نوکری نہ کریں۔

ایک دفعہ ایک امریکی پروفیسر دھلی کی ایک یونیورسٹی میں لیکچر دینے آئے۔ ایک انڈین طالب علم جو امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کا خواہش مند تھا اُس نے پروفیسر صاحب سے درخواست کی کہ امریکہ کی کسی یونیورسٹی میں داخلے کے لیے اُس کی مدد کریں۔ پروفیسر صاحب مسکرائے اور کہا امریکہ میں یونیورسٹیوں میں داخلہ میرٹ پر ملتا ہے نہ کہ سفارش پر۔ اس طرح کی

صورت حال میں کوئی کمزور طالب علم امریکہ جائے اور وہاں کے تعلیمی معیار پر پورا نہ اترے تو وہ یقینی طور پر ٹینشن کا شکار ہوگا۔ لیکن اگر وہ ذہین و قابل ہو تو اُس کو داخلہ مل جائے گا۔ اور پھر یہ کوئی معاملہ نہ ہوگا۔ نہ ہی کوئی ٹینشن ہوگی۔

یہ بات اہم ہے کہ حد سے زیادہ پر عزم نہ ہوں بلکہ حقیقت پسند بنیں۔ اگر آپ ضرورت سے زیادہ پر عزم ہوں گے تو آپ ٹینشن کا شکار ہو جائیں گے۔ اگر آپ اپنے لیے قابل حصول ہدف مقرر کرتے ہیں۔ تو ٹینشن فری زندگی گزاریں گے۔
ذہنی دباؤ قدرتی پریشانی نہیں ہے۔ یہ تو انسان خود پیدا کرتا ہے۔ حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار رہیے۔ پھر آپ یقینی طور پر ذہنی دباؤ سے آزاد زندگی سے لطف اندوز ہوں گے۔



خدشات پر کیسے قابو پائیں

خدشات فکر و خیال کے لیے ایک بھونچال کی مانند ہوتے ہیں۔ جو دانشورانہ سرگرمی کو تحریک دیتے ہے اور تخلیقی سوچ کا باعث بنتے ہیں۔

خوف و خدشات ہر مرد و عورت کا مشترکہ مسئلہ ہے۔ یہ خوف و خدشات کیا ہیں لغت (Dictionary) کے مطابق کسی خطرے کی وجہ سے ذہنی دباؤ، پریشانیوں، اور اندیشوں کا احساس خوف و خدشات ہیں۔ کچھ ماہرین اس پر قابو پانے کے لیے چند جسمانی تکنیک بتاتے ہیں۔ جب کہ خدشات ذہنی مسئلہ ہیں جسمانی تکنیک سے ان کا ذائل ہونا ممکن نہیں ہے۔
یہ حقیقت ہے کہ انسان ایک عقلی حیوان ہے۔ اس وجہ سے وہ صرف اُن سوالوں کے جواب آسانی سے قبول کرتا ہے جن کی بنیاد دلائل پر ہو۔ اس لیے درست طریقہ یہ ہے کہ ہم خدشات کی وجوہات کو تلاش کریں۔ پھر دلائل کی روشنی میں اُن وجوہات کو دور کریں۔ اگر کسی کا ذہن وجوہات کی جانچ پرکھ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ تو وہ یقینی طور پر اپنے اندیشوں کو تحلیل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

یہ عام سی بات ہے کہ اگر آپ اسٹیشن جائیں اور وہاں متوقع ریل کے آنے میں تاخیر ہو

، اور آپ کو تاخیر کا سبب معلوم ہو جائے تو آپ کی پریشانی جاتی رہے گی۔ لیکن اگر تاخیر کی وجہ معلوم نہ ہو تو مختلف اندیشے آپ کے ذہن میں جنم لیں گے۔ اس مثال سے یہ بات واضح ہوگی کہ اندیشہ دور کرنے کا واحد حل یہ ہے کہ اُس کے پیدا ہونے کی وجوہات کو معلوم کیا جائے۔ اس کے علاوہ اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہے۔

میں اپنا ایک واقعہ آپ کو بتاتا ہوں جو کسی حد تک اس سے مطابقت رکھتا ہے۔ میں پیدائشی طور کا ملیت پسند (Perfectionist) ہوں اس وجہ سے میں ہمیشہ چیزوں کے مثالی ترتیب سے واقع ہونے کا خواہش مند رہا۔ جب کبھی میں نے چیزوں کو بے ترتیب پایا۔ مجھے بہت ناگوار گزرا۔ اور میرے بچپن میں اس مسئلے نے اتنی شدت اختیار کی کہ میں نے اس سلسلہ میں ایک نظم بھی لکھی۔ اُس نظم کا ایک مصرعہ یہ تھا۔

زندگانی ہے کہ یا خواب کوئی وحشت ناک

میں نے اس موضوع پر بہت کچھ پڑھا بہت زیادہ غور و فکر کیا۔ اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اندیشہ ہر مرد و عورت کا مشترکہ مسئلہ ہے۔ اور قوانین فطرت کے مطابق انسان کو اس دنیا میں تضادات کے ساتھ جینا ہے۔ مجھ پر یہ بات منکشف ہوئی کہ انسان کا ملیت پسند (Perfectionist) ہے لیکن دنیا کا ملیت (Perfection) پسندی سے دور ہے۔ اور چیزیں ایک مثالی ترتیب کے ساتھ واقع نہیں ہوتیں ہیں۔ اس انکشاف کے بعد میں نے زندگی کو حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھا۔ اتفاق سے اُن دنوں میری نظر سے کسی کا قول گزرا جو اس موضوع سے متعلقہ تھا: ”جن چیزوں کو ہم تبدیل نہ کر سکیں اُن کے ساتھ رہنے کی صلاحیت کو پختگی کہتے ہیں۔“ اس قول کو ذہن نشین کر کے میرے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوئی کہ میں مسئلہ کو عقل کی کسوٹی پر پرکھوں۔ اور ٹیمپشن فری زندگی گزاروں۔

دیکھنے میں اندیشے خارجی چیز لگتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ ذہن کے اندر ہوتے ہیں۔ جیسے جب لوگ کسی اندھیرے کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو انہیں اندیشہ ہوتا ہے کہ مبادا کوئی موذی جانور فرش پر ریگ نہ رہا ہو۔ لیکن جب یہ بتی جلاتے ہیں تو انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ کمرے میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ تو صرف اُن کا وہم تھا لہذا اندیشوں کو خارجی طور پر دور نہیں

کیا جاسکتا۔ بلکہ انہیں اپنے ذہن میں حل کرنا پڑتا ہے۔ جب تک وہم کو حقیقت سمجھیں گے خوف ہم پر غالب رہے گا۔ اگر آپ یہ حقیقت جان لیں کہ میرا وہم تو صرف خیالی ہے اس کا حقیقت سے دور دور کا بھی تعلق نہیں ہے تو آپ کا ذہن فوراً اندیشوں سے خلاصی حاصل کر لے گا۔

ظاہری طور پر خدشہ ایک منفی عمل ہے۔ لیکن اس کے اندر ایک مثبت پہلو بھی ہے۔ کیونکہ خدشات ہی فکر و خیال کے لیے ایک بھونچال کی مانند ہوتے ہیں۔ جو دانشورانہ سرگرمی کو تحریک دیتے ہیں اور تخلیقی سوچ کا باعث بنتے ہیں۔ اس لحاظ سے خدشات ہماری زندگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

خدشات زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ یہ انسان کے ذہن کو متحرک رکھتے ہیں۔ اندیشوں کے بغیر، انسان کی سوچ پر جمود کا خطرہ منڈلاتا رہتا ہے۔ اس لیے ہمارے پاس اندیشوں پر قابو پانے کا صرف ایک طریقہ بچتا ہے کہ ہم اپنے فکر و خیال کو درست کریں اور اندیشوں کو منفی طور پر لینے کے بجائے مثبت پہلو سے دیکھیں۔



بہتر مستقبل کا انتظار

خالق نہ صرف خود مثبت ذہن ہے بلکہ مثبت سوچ سے محبت کرتا ہے۔ وہ اُن لوگوں سے بھی الفت رکھتا ہے جو مثبت راہ پر چلتے ہیں۔

میں ایک خاتون سے ملا جو دہلی میں کسی کمپنی میں ملازم تھیں۔ انہوں نے شکایت کی، کہ کمپنی کے ملازمین کے بارے میں شرائط اور قوانین (Term and Condition) بہت سخت ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہ ذہنی دباؤ کا شکار رہتی ہیں۔ میں نہ پوچھا: کیا آپ ذہنی دباؤ سے خلاصی کا فارمولا جاننا چاہتی ہیں جب انہوں نے اثبات میں جواب دیا تو میں نے وہ روحانی فارمولا دیا جو پیغمبر اسلام ﷺ نے دیا تھا۔ ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”بہتر مستقبل کا انتظار بھی عبادت کی ایک شکل ہے۔“

چند ماہ بعد اُسی خاتون سے میری پھر ملاقات ہوئی۔ اس وقت وہ بہت خوش

تھی۔ ہماری گفتگو کے دوران، اُس نے کہا: ”اب مجھے دوسری کمپنی میں نوکری مل گئی ہے جو ہر لحاظ سے پہلی کمپنی سے بہتر ہے۔“ یہ کوئی منفرد مثال نہیں ہے۔ میں اس فارمولے کو اپنی زندگی میں کئی بار استعمال کر چکا ہوں۔ اور میں نے اس فارمولا کو ناگوار صورت حال سے نمٹنے کے حوالے سے بہترین پایا ہے۔

اس فارمولے میں کوئی پراسرار بات نہیں ہے بلکہ یہ فارمولا تو قدرت کے ثابت شدہ قانون کے مطابق ہے۔ جب آپ کسی ناپسندیدہ صورت حال کا سامنا کرتے ہوئے منفی رویہ اپنا لیتے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ نکلے گا۔ کہ ایک طرف آپ مایوسی کا شکار ہوں گے۔ دوسری طرف آپ اپنی ذہنی ترقی (Intellectual Development) میں رکاوٹ بن جائیں گے۔ مزید اپنی نوکری سے غیر مطمئن ہوں گے۔ ممکن ہے ایسے میں آپ کی کارکردگی غیر تسلی بخش ہو۔ اور آپ کمپنی کے لیے غیر مطلوب شخص بن جائیں۔ آپ کی کارکردگی کے یہ نقائص آپ کی زندگی میں منفی اثرات مرتب کریں گے۔

لیکن اگر آپ مندرجہ بالا فارمولا اختیار کرتے ہیں تو آپ ذہنی دباؤ سے آزاد اور پُر امید شخص بن جائیں گے۔ اور یہ فارمولا مثبت سوچنا آپ کی مستقل عادت بنا دے گا۔ مثبت سوچ لازمی طور پر آپ کی مہارت و قابلیت میں اضافہ کرے گی۔ اور آپ شکایت کناں ہونے کے بجائے مواقع کے متلاشی ہوں گے۔

یہ فارمولا کسی مذہبی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ اس کی اساس انسانی فلاسفی پر ہے۔ اگر انسان کی ذہنیت منفی ہو جاتی ہے تو اپنی صلاحیتوں کو ضائع کر دیتا ہے۔ لیکن اگر وہ مثبت ذہن کے ساتھ سخت محنت کرتا ہے۔ تو اپنی قابلیتوں میں مزید نکھار لے آتا ہے۔ یہ ہی قدرت کا قانون ہے جو کہ نہ قابلِ تغیر ہے۔

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ تربیت (Training) انسان کے لیے وسیع مواقع فراہم کرتی ہے۔ لیکن تربیت کو صرف پیشہ ورانہ اداروں تک محدود نہیں کرنا چاہیے۔ تربیت کا دوسرا ادارہ (Institution) ہمارا اپنا دماغ ہے۔ اور مثبت سوچ ذہنی تربیت کی ایک قدرتی شکل ہے۔ یہ تربیتی ادارہ مستقل کام پر لگا ہوا ہے۔ اور آہستہ آہستہ انسان کو ایک بہتر شخصیت میں تبدیل کرتا

ہے۔ یہ قدرت کا معجزہ ہے اور ہم میں سے ہر کوئی اس پر دسترس رکھتا ہے۔ ہر کوئی یہ تجربہ کر سکتا ہے۔۔۔

دماغ کا یہ پہلو فطرت کا عظیم تحفہ ہے۔ جب ہم منفیت سے گریز کرتے ہیں اور مثبت فکر کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ تو ہم اپنے ذہن کو اپنی شخصیت کی تعمیر پر لگا دیتے ہیں۔ مثبت طرز فکر پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں مدد کرتی ہے۔ اس کی وجہ ہے کہ ایک مثبت فکر شخص اپنی زندگی میں ترقی کے امکانات کو زیادہ روشن کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس، منفی طرز فکر شخصیت سازی کے لیے بہت مضمر (Ingurios) ہے۔ صحیح معنوں میں صرف مثبت سوچ ہی مددگار ہے۔

ہماری دنیا کا نظام معروف قدرتی قوانین کے زیرِ تَحْت چلتا ہے۔ ترقی کا واحد راستہ ان قوانین کا دریافت کرنا اور ان پر تہدہی سے عمل پیرا ہونا ہے۔ تقریباً ناکامی کے تمام واقعات قوانین فطرت پر عمل پیرا نہ ہونے کے نتیجے میں واقع ہوئے ہیں۔ ان قوانین کی پیروی کرنا ایسا ہے جیسے ایک سڑک پر سفر کرنا جو سیدھی آپ کی منزل مقصود پر پہنچتی ہو۔ اگر آپ گاڑی کو سیدھی سڑک سے دائیں یا بائیں اتار لیتے ہیں تو آپ کے لیے اپنی مطلوبہ منزل پر پہنچنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ اس دنیا کا خالق بذاتِ خود مثبت ذہن ہی نہیں ہے بلکہ وہ مثبت سوچ سے محبت کرتا ہے۔ وہ ان لوگوں سے بھی محبت کرتا ہے جو مثبت راہ پر چلتے ہیں۔ اس لیے اپنے ذہن میں مثبت ذہنیت کو فروغ دیں۔ مثبت سوچ آپ کو قدر اور شخصیت بنا دے گی۔ وہ ہی شخصیت ہر میدان میں کامیابی کا پرچم بلند کرتی ہے۔ جو مثبت خطوط پر استوار ہو۔



انا کو کنٹرول کرنے کا ہنر سیکھیں

انا کا مسئلہ انسان کا اپنا مسئلہ ہے، دوسرے افراد کسی کے نقائص کی قیمت کبھی بھی ادا نہیں کریں گے۔ اس لیے انسان کو اپنی سطح پر اس مسئلے کو حل کرنا چاہیے۔ انا ہر انسان کی نفسیات کا پیدائشی طور پر حصہ ہوتی ہے۔ یہ انسان کی کردار سازی میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ کیونکہ انا خود شناسی کا ذریعہ ہے۔ یہ یقین محکم، اعتماد اور عزم و ہمت کا

سرچشمہ ہے۔ اس لحاظ سے یہ ہر انسان میں ایک بہت بڑی قوت، اور باکمال صحت مند عنصر ہے۔ اس کی عدم موجودگی میں انسان بیکار ہو جاتا ہے۔ اور جہاں تک بڑی کامیابی کا تعلق ہے بغیر اتنا کے تو کامیابی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

یہ انا کا مثبت پہلو ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ اس کا منفی پہلو بھی ہے۔ اور یہ ہی منفی پہلو مسائل کی جڑ ہے۔ انسان کو ایک معاشرتی حیوان ہونے کے ناطے دیگر افراد معاشرہ کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ وہ ایک وقت میں خاندان کا فرد بھی ہوتا ہے اور سماج کا رکن بھی۔ دوسرے الفاظ میں مل جل کر رہنا انسان کی جبلت (Intrinsic) میں ہے۔ یوں مل جل کر رہنے کے ساتھ مختلف مسائل کا کھڑا ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ جب انسان تہا رہتا ہے اُس وقت اُس کی انا خوابیدہ حالت میں ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ معاشرے کے اندر مل جل کر رہتا ہے۔ تو اُسے دیگر افراد معاشرہ کے ساتھ مختلف معاملات طے کرنے پڑتے ہیں۔ جہاں ایسی صورت حال پیدا ہونے کے امکان بڑھ جاتے ہیں، اور افراد کی انا باہمی تنازعات پیدا کرنا کا باعث بن جاتی ہے۔

نظام قدرت میں تنوع (Diversity) فطرت کی منصوبہ بندی کا لازمی جز ہے۔ یہ بات انسان کے لیے بھی درست ہے۔ کیونکہ تمام مرد اور خواتین متضاد خصوصیات کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ معاشرہ مختلف شخصیات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اور مختلف افراد کے ذوق، سوچنے کے انداز، اور تاثرات کے اظہار میں اختلاف ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے مسائل جنم لیتے ہیں۔ انا کا مسئلہ اُس وقت جنم لیتا ہے جب انسان مختلف مزاج و کردار کے حامل افراد کے درمیان رہتا ہے۔

یہ کہا جاتا ہے جب انا کو مجروح کیا جاتا ہے تو کمزور انا بھی طاقتور انا میں بدل جاتی ہے اور اس کا حاصل بربادی ہوتا ہے۔ اس قول میں کافی حد تک حقیقت ہے، لیکن اسے مناسب پس منظر میں سمجھنا چاہیے۔ اصل میں یہ مسئلہ تہا رہنے کے بجائے اجتماعی طور پر رہنے پر کھڑا ہوتا ہے۔ یقیناً اجتماعیت مسائل کو جنم دیتی ہے لیکن ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی تسلیم کر لینا چاہیے کہ انگلیوں پر گنے چنے افراد ہی تہا زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ کیونکہ معاشرتی زندگی میں ہر ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کرتا ہے۔ اور یہی اشتراک افراد کو اپنی شخصیت کی تعمیر میں مدد کرتا، اور اُن کے منصوبوں کو عملی جامہ پہناتا ہے۔ اشتراک کرنے کی خواہش کے بغیر، بہت کم ایسی چیزیں ہیں جو

انسان کی رسائی میں ہو سکتی ہیں۔

ہر شخص ایک گلاب کے پھول کی مانند ہے جو ایک طرف پھول اور دوسری طرف کانٹے بھی رکھتا ہے۔ انسان کے اس دورنے پن کو بطور حقیقت تسلیم کر لینا چاہیے۔ جب ایک شخص کا دوسرے شخص کی پھول جیسی عادت سے واسطہ پڑتا ہے۔ تو اس کا تحمل قائم رہتا ہے۔ لیکن جب وہ کسی شخص کی کانٹے جیسی عادت کی چھن محسوس کرتا ہے۔ تو اس کی انا بھڑک اٹھتی ہے۔ ظاہر ہے ان مسائل سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اس طرح کے واقعات معاشرتی زندگی کا معمول ہیں۔ انسان کو دوسرے کے کانٹے کو بھی تسلیم کرنا چاہیے جیسے وہ دوسروں کے پھولوں کا اعتراف کرتا ہے۔ اگر وہ انسان کے ان پہلوؤں کو تسلیم نہیں کرے گا تو وہ ناقابل تلافی نقصان کا خود ذمہ دار ہوگا۔ معاشرتی زندگی میں باہمی اشتراک کا عمل ہر ایک کے لیے نفع بخش ہے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ باہمی انا کا منفی ٹکرو بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

پھر اس صورت حال میں کیا کیا جائے؟ اس صورت حال کا واحد حل یہ ہے کہ اپنی انا کی طاقت کو مثبت رخ دینے کا ہنر سیکھیں۔ کیونکہ اجتماعی زندگی کے فوائد حاصل کرنے کے لیے یہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ قیمت ادا کیے بغیر کوئی اس جنس کا خریدار نہیں بن سکتا ہے۔ جب ہم معاشرتی فوائد کے ثمر سمیٹ رہے ہوتے ہیں۔ تو یہ بات بالکل درست ثابت ہوتی ہے اگر کوئی ان معاشرتی ثمرات کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو لازمی طور پر اپنی انا کی بہتر منصوبہ بندی (Ego Management) کرنے کا ہنر سیکھنا ہوگا۔

انا کا مسئلہ انسان کا اپنا مسئلہ ہے، دوسرے افراد کسی کے نقائص کی قیمت کبھی بھی ادا نہیں کریں گے۔ اس لیے انسان کو اپنی سطح پر اس مسئلے کو حل کرنا چاہیے۔ یہاں صرف دو انتخاب ہیں۔ یا اپنی انا کو منیج (Manage) کر کے خوشحال ہو جائیں، یا اپنی انا کو منفی رخ دے کر تباہی سے دوچار ہو جائیں۔



ذہنی دباؤ ایک اچھا خادم، اور بُرا حاکم ہے

جب آپ ذہنی دباؤ کا سامنا کریں، تو اس کو منفی مسئلہ کے طور پر نہ لیں، بلکہ اس کو بطور چیلنج قبول کریں، اور اپنے ذہن کو مثبت سمت میں متحرک رکھیں

ہمارے دور کا ایک مشترکہ مسئلہ یہ ہے کہ ہر کوئی چاہے وہ جوان ہو یا عمر رسیدہ ذہنی دباؤ اور ٹینشن کی شکایت کرتا ہے، اور یہ چلن اتنا عام ہو گیا ہے کہ ذہنی دباؤ سے نجات کے لیے کئی مراکز قائم ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ سب عارضی نوعیت کا علاج کرتے ہیں۔ ذہنی دباؤ کا مستقل حل اُن کے بس میں نہیں ہے۔ کیونکہ حقیقت میں ٹینشن یا ذہنی دباؤ مثبت صورت کا منفی نام ہیں۔ یہ ایک صحت مند زندگی کی علامت، اور مصیبت کے بھیس میں ایک نعمت ہے۔

آپ کا ذہن لامتناہی (Unlimited) صلاحیتیں رکھتا ہے۔ لیکن یہ صلاحیتیں جو کہ قدرتی تحائف کی شکل میں ہیں ایک امکانی صورت میں ہوتی ہیں۔ اس لیے آپ کے لیے لازم ہے کہ اس امکان کو حقیقت میں بدلیں۔ یہاں پر ایک سوال یہ ہے کہ آپ کو اس کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی پوشیدہ صلاحیتیں اُسی صورت آشکارہ ہو سکتی ہیں۔ جب آپ کو مختلف دباؤ اور ٹینشن کا سامنا ہو۔ یہ دباؤ ہی ہے جو ہمارے ذہن کے خوابیدہ محاسن کو بیدار کرتا، اور قدرتی طریقہ کار کو حرکت دیتا ہے جو کہ ذہنی ارتقا کا باعث بنتا ہے۔ نتیجتاً دباؤ ہماری شخصیت کو ترقی دینے میں اہم کردار ادا کرتا ہے

والی بال میں دو کھلاڑی ایک والر (Waller) اور دوسرا بوسٹر (Booster) ہوتا ہے۔ والر کا کھیل میں کلیدی کردار (Key role) ہوتا ہے لیکن اُس کو بوسٹر کی ضرورت ہوتی ہے۔ بغیر بوسٹر کے کوئی بھی والر کھیل میں اپنا کردار پوری طرح ادا نہیں کر سکتا۔ یہ بوسٹر بال کو اُٹھا کر والر کو دیتا ہے جس پر وہ والی لگاتا ہے یہ اُٹھانے کا کردار ہر انسان کی زندگی میں جاری ہے۔ اس لیے جب آپ کسی قسم کا دباؤ محسوس کریں تو مایوس نہ ہوں بلکہ اسے بطور ایک چیلنج، ایک ذہنی صلاحیت کو ترقی دینے والا لیں۔ کیونکہ دباؤ ایک مثبت علامت، اور ایک صحت مند سرگرمی ہے۔ یہ آپ کی دماغی صلاحیت کو فروغ دیتی ہے۔

تمام بڑے لوگوں نے بڑے مصائب کا سامنا کیا ہے۔ لیکن ان مصائب نے نہ صرف اُن کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ بلکہ اُن کی شخصیت کے نئے گوشوں کو بھی آشکارہ کیا۔ مثلاً انگلش شاعر جان ملٹن نے انگریزی ادب میں نمایاں اضافہ کیا۔ اُس نے انگلش ادب کی شاہکار نظم ”گمشدہ جنت“ (Paradise Lost) اُس وقت لکھی تھی جب وہ نابینا ہو چکا تھا۔ تقریباً تمام تخلیقی افراد نے اسی قسم کے مشکلات کے پہاڑ سر کیے ہیں۔

جب آپ ذہنی دباؤ کا سامنا کریں، تو آپ اسے منفی مسئلہ کے طور پر نہ لیں بلکہ اس کو بطور چیلنج قبول کریں، اور اپنے ذہن کو مثبت سمت میں متحرک رکھیں۔ کبھی بھی اپنی مثبت سوچ کو ضائع نہ کریں، اور کبھی شکایات زبان پر نہ لائیں۔

جب کبھی آپ کو کسی ذہنی دباؤ کا سامنا ہو، تو اسے معمول کے مسئلے کی طرح لیں اور اپنے روزمرہ کے معمولات جاری رکھیں۔ پھر آپ بہت جلد یہ معلوم کریں گے کہ دباؤ نے آپ کو خوش حالی کی سمت بڑھا دیا۔ اگر آپ اپنے دباؤ سے پہلے اور دباؤ کے بعد والے حالات کو موازنہ کریں۔ تو آپ واضح طور پر جان جائیں گے کہ دباؤ سے پہلے والے حالات کو ٹینشن نے بہتر کر دیا ہے۔

ایک دفعہ موہن داس گاندھی جی کے ساتھ جنوبی افریقہ میں غیر شائستہ سلوک کیا گیا۔ اس سلوک سے پہلے وہ ایک عام وکیل تھے، لیکن اس سلوک کے نتیجے میں وہ انڈین قوم کے باپ بن گئے۔

جب آپ کو موقع ملتا ہے اور آپ اُسے استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن کسی وجہ سے آپ اپنا مقصد حاصل کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ تو آپ کو ٹینشن کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن آپ کو یہ جان لینا چاہیے کہ اس دنیا میں موقع کا اختتام نہیں ہے۔ اگر ایک موقع ہاتھ سے گیا تو اسے آخری موقع نہ سمجھیں۔ زندگی میں اور بہت سے مواقع موجود ہیں۔ حقیقت میں دنیا مواقع سے بھری پڑی ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ پہلی دفعہ ناکام ہو گئے تو کوئی بات نہیں دوسرا موقع موجود ہے اُسے استعمال کر لیں اور دوسرا بھی ناکامی سے دوچار ہوتا ہے تو تیسرا موقع آپ کا منتظر ہے اُسے استعمال کریں۔ غرض اس طرح کے بے شمار مواقع موجود ہیں۔ ان مواقع میں وقفہ تو

ضرور آجاتا ہے لیکن ان کا اختتام کبھی نہیں ہوتا ہے۔ تو بجائے اس کے آپ ٹینشن کا شکار ہوں، یہ فارمولا اختیار کریں: 'کوشش، کوشش پھر کوشش۔'

یہ ٹینشن سے خلاصی کا فارمولا ہے۔ تفکرات میں جینا، یا اپنی سوچ و سمجھ کے راستے بند کر دینا مسئلے کا حل نہیں ہے۔ فہم و فراست کے دروازے بند کرنے کے بجائے انھیں مزید وسعت دینا چاہیے۔ اس طرح آپ بہت جلد جان لیں گے کہ ذہنی دباؤ اور مصائب آپ کی زندگی میں عقلمندانہ کو فروغ دیتے ہیں۔



امن قائم کرنے کا عملی فارمولا

انسان کی شخصیت مکمل طور پر اُس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔

اُس کو اپنے فکر و خیال اور قلب و دماغ پر پورا اختیار ہے۔

لارڈ ماونٹ بیٹن ہندوستان میں برطانیہ کے آخری وائسرائے تھے۔ ہندوستان کے لیے وہ لمحات انتہائی تاریخی تھے جب ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء نصف شب کو انھوں نے آل انڈیا ریڈیو پر یہ اعلان کیا: "آج انڈیا آزاد ہے"۔ لیکن جب تحریک آزادی کے تمام راہنما یہ اعلان سن رہے تھے عین اُس وقت مہاتما گاندھی جی، آزاد ہندوستان کے سب سے بڑے حامی، دلی میں موجود نہ تھے۔

ان فیصلہ کن لمحات میں وہ نواکھلی کے علاقے میں امن بحالی کی کوشش میں مصروف تھے جہاں تقسیم سے قبل خونی بلوے پھوٹ پڑے تھے۔ انھوں نے نواکھلی سے اپنے ایک گجراتی دوست کو چٹھی میں لکھا: کہ "میرے چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے لیکن میرا دل پرسکون ہے۔" مہاتما گاندھی جی میں یہ صلاحیت تھی تاریخ کے اس نازک موڑ پر جب امن و سلامتی دور کی بات لگتی تھی، وہ اُس وقت بھی اپنے دل کو پرسکون پاتے تھے۔ امن کے لیے یہ فارمولا انتہائی کارآمد ہے۔ بین الاقوامی طور پر امن کی بحالی ایک طویل مدتی عمل ہے۔ لیکن فرد واحد اس ہدف کو فوری طور پر حاصل کر سکتا ہے۔ اگر آپ اپنے ارد گرد کے ماحول میں امن کا قیام کرنا چاہتے

ہیں۔ تو آپ کو اتنا پختہ فکر ہونا چاہیے کہ انتہائی بدامنی کی صورت حال میں بھی ذہنی سکون کے ساتھ اپنا کام جاری رکھ سکیں

یہ ہی پُر امن زندگی کے لیے قابل عمل فارمولا ہے۔ یہ ثنویت یا دوہرا پن (Duality) جو کہ ہر انسان کے بس میں ہے۔ مہاتما گاندھی جی نے بڑے واضح طور پر اس کا اظہار کیا۔ یہ سارا عمل اپنے فکر و خیال کو منظم (Thought Mangement) کرنے کا فن ہے۔ انسانی دماغ بے انتہا صلاحیتوں کا حامل ہے۔ کسی شخص کا دو یا دو سے زیادہ زبانوں پر عبور رکھنا عام سی بات ہے۔ اگر انسان کے لیے یہ لسانی (Bilingual) فارمولا ممکن ہے۔ تو مندرجہ بالا گاندھی جی کا فارمولا بھی ہر کسی کے لیے ممکن ہے۔

انسان کی شخصیت مکمل طور پر اُس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اُسے اپنے فکر و خیال اور قلب و دماغ پر پورا اختیار ہے۔ وہ ویسے سوچ سکتا ہے جیسے وہ سوچنا چاہتا ہے۔ وہ ویسی تمنا کر سکتا جیسی اُس کے من میں ہے۔ وہ ویسا محسوس کر سکتا ہے جیسا وہ محسوس کرنے کا آرزو مند ہے۔ ان ہی خطوط پر انسان کو یہ فارمولا اختیار کرنا چاہیے: ”میں امن سے رہوں گا چاہے اس کی مجھے کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔ مزید میں ہر حال میں پرسکون ذہنیت کو اپناؤں گا اور میں ہرگز کسی کو اجازت نہیں دوں گا کہ وہ میرے ذہنی سکون کو برباد کرے اس طرح وہ اپنے ذاتی دائرہ عمل میں مکمل طور پر امن اور ذہنی سکون سے رہ سکتا ہے۔“

لیکن خارجی دنیا اُس کے بس میں نہیں ہے۔ وہ تو بالکل خود مختار ہو کر کام کرتی ہے۔ لہذا انسان کو اپنے فکر و خیال کو دو درجوں میں تقسیم کر لینا چاہیے۔ پہلے درجے میں اُس کے اپنے ذہن کا تعلق ہے۔ جس میں وہ مکمل طور پر پر امن رہ سکتا ہے۔ دوسرے درجے میں خارجی دنیا کا تعلق ہے جو اُس کے دائرے اختیار سے باہر ہے۔ یہاں اُسے دوسروں کی خیر خواہی کے لیے ہمیشہ اچھے مشورے دینے چاہئیں۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ سامع (Listener) کو اختیار دے دے کہ وہ آپ کے مشوروں کو مانیں یا نہ مانیں۔

آپ دنیا کو تبدیل کر سکتے ہیں نہ دنیا آپ کے ذہن کو تبدیل کر سکتی ہے۔ اس تقسیم کو قبول کریں اور امن و سکون سے رہیں۔ اور اس اثناء میں اپنے ارد گرد معاشرے کو پُر امن رہنے کی

طرف راہنمائی دیتے رہیں۔

ثنویت یا دہراپن (Duality) زندگی کا حصہ ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں انسان اس فارمولے کو اختیار کرتا ہے۔ مثلاً ہم دو یا دو سے زیادہ زبانیں سیکھتے ہیں، اور کئی مضامین پر عبور حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم بیک وقت دو کاروباروں میں کامیابی سے اترنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم ایک ہی وقت کئی دوست رکھتے ہیں۔ لہذا اگر دوہراپن دیگر دائروں میں ممکن ہے تو امن کے دائرے میں کیوں ممکن نہیں ہے؟

یہ کہا جاتا ہے کہ ہر مسئلہ ذہن میں شروع ہوتا ہے۔ اور ذہن میں ہی حل کیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ مسائل کو حل کرنے کی اس ذہنی صلاحیت کو فروغ دیں۔ تو نتیجتاً آپ وہاں بھی پر امن زندگی گزاریں گے۔ جہاں امن نہ ہو۔



حوصلہ شکن دنیا میں حوصلہ کے ساتھ جنیں

انسان کو اپنے آپ کو ضائع ہونے سے بچانا چاہیے اور اس حوصلہ شکن دنیا میں حوصلے سے رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ایک دفعہ میری ملاقات ایک بزنس مین سے ہوئی جس نے مجھے رازدارانہ انداز میں بتایا کہ وہ پہلے دوسروں کی مدد کرنے میں بہت فیاض ہوا کرتا تھے۔ لیکن اب انہوں نے یہ سلسلہ منقطع کر دیا ہے چونکہ لوگ صرف زبانی تعریفوں کے ڈونگے برساتے ہیں حقیقت میں اُس کی اعانت (Contribution) کا اعتراف نہیں کرتے۔ یہ تجربہ اُن کے لیے حوصلہ شکن ثابت ہوا نتیجتاً انہوں نے لوگوں کی امداد کرنے کی عادت ترک کر دی۔ میں نے اُن سے گزارش کی کہ ایک پرانی کہاوت ہے۔ نیکی کر دیا میں ڈال۔ یعنی جو آپ نے دوسروں کے لیے بھلائی اور خیر خواہی کے کام کیے ہیں انہیں بھول جائیں۔ میں نے مزید کہا جو کچھ آپ کے ساتھ پیش آیا یہ صرف چند افراد کی کہانی نہیں ہے۔ بلکہ معاشرے کی اکثریت کا یہ عام تجربہ ہے۔ اس کا بہترین حل یہ ہے خیر و بھلائی کے کام اپنی داخلی طمانیت کے لیے کیا کریں نہ کہ دوسروں سے اعتراف کی خواہش

میں۔

بھلائی کی صرف یہ ہی صورت نہیں ہے، کہ آپ ضرورت مندوں کو کچھ رقم دے دیں۔ نیکی اور بھلائی کی کئی اقسام ہیں، دوسروں کے خیر خواہ بننا، لوگوں کو اچھے مشورے دینا، صرف دوسرے کی فلاح و بہبود کے لیے بولنا، انتقام نہ لینا، معاشرے میں مہذب شخص بن کر رہنا۔ یہ ساری اقسام دوسروں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کرنے کی ہیں۔ دوسروں کی مدد کرنا حقیقت میں اپنی مدد کرنا ہے۔ کیونکہ بھلائی کے کام انسان کے اپنے اندر مثبت زاویہ نظر پیدا کرتے ہیں۔ نتیجتاً ایک بہتر شخصیت وجود میں آتی ہے۔ یہ طرز عمل انسان کو معاشرے کا دینے والا (Giver) فرد بناتے ہیں۔ کسی شخص کا دوسرے آدمی کے ساتھ اچھا سلوک پورے معاشرے کے ساتھ اچھے سلوک روار کھنے میں اُس کی مدد کرتا ہے۔

جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اُسے قدرتی طور پر اپنی اغراض سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اور یہ اغراض مثبت اور منفی دونوں پہلو رکھتے ہیں۔ مثبت پہلو سے یہ انسان کی اپنی اغراض ہوتی ہیں۔ جو انسان کے اندر ایک تحریک پیدا کرتی ہیں۔ ان کے بغیر انسان کی تمام سرگرمیاں جامد ہو جاتی ہیں۔ اغراض کا معاشرے میں یہ مثبت کردار ہے۔ جب کہ منفی پہلو یہ ہے کہ انسان لوگوں سے اعتراف کی خواہش رکھتا ہے۔ کیونکہ جب ایک شخص خالصتاً بے غرض ہو کر کوئی کام کرے گا۔ تو قدرتی طور پر وہ اس کے صلے کی بھی توقع کرے گا۔ یہ انسان فطرت ہے اس سے کسی کو مفر نہیں۔ لیکن اُس کا یہ عمل اُس کے لیے تو اچھا ہے لیکن جس کے ساتھ بھلائی کی گئی ہے اُس کے لیے بُرا ہے۔

در اصل یہ عمل قدرت کے قانون کی وجہ سے ہے۔ جہاں قدرت کا قانون آجائے وہاں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اُسے تسلیم کیا جائے۔ انسان کو اسے لامحالہ قبول کرنا پڑتا ہے کیونکہ یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ اگر سچائی سے غور کریں۔ فطرت کے قوانین کی پیروی انسان کو ٹینشن سے نجات اور مثبت فکر جیسے فائدے دے گی اس کے برعکس اگر انسان جو ابی رد عمل کی پالیسی اختیار کرتا ہے۔ تو پھر اُس کو دوہری قیمت ادا کرنی پڑے گی، پہلے نمبر پر اُس کو خارجی دنیا میں افسوس ناک تجربے کا سامنا ہو

گا۔ دوسرے نمبر پر اُسے ذہنی دباؤ کا شکار ہونا پڑے گا۔
انسان کو اپنے آپ کو ضائع ہونے سے بچانا چاہیے اور اس حوصلہ شکن دنیا میں حوصلے
سے رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔

☆☆

تفکرات پر کیسے قابو پائیں

تشویش کوئی مادی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ سوچنے کا انداز ہے۔ اگر آپ ذہنی طور ایک
بیدار شخص ہیں اور اپنے سوچنے کے انداز کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو پھر اندیشے کی
کوئی بات نہیں ہے

تشویش یا فکر مندی پریشانی کی شکل ہے، بعض اوقات ہمیں ماضی کے نقصانات کی تلخ
یادیں پریشان کر دیتی ہیں۔ اور کبھی مستقبل کے بارے میں قسم قسم کے اندیشے ہماری جان کو آتے
ہیں۔ یہ طرز فکر اتنا عام ہے۔ کہ تشویش ایک مشترکہ مسئلہ بن گئی ہے۔ کیونکہ اکثر مرد و خواتین
پریشانی کے بھنور میں پھنس جاتے ہیں

فکر مندی ایک قاتل ہے۔ یہ ہر طرح کی منطق کو پاش پاش کر دیتی ہے۔ اکثر
معاملات میں کوئی بیرونی عنصر آپ کو اذیت کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کرتا، بلکہ یہ خود آپ ہیں جو
اپنے آپ کو ذہنی اذیت میں مبتلا کرتے ہیں۔

دنیا آپ کے راستے میں کئی قسم کے مسائل کھڑے کرتی ہے جن کو دور کرنا آپ کے
دائرے اختیار میں نہیں ہوتا ہے۔ تاہم جہاں تک ان مسائل کو دیکھ کر پریشان ہونے کا تعلق ہے تو
یہ پریشانی تو آپ کی اپنی تخلیق کردہ ہے۔ مطلب یہ کہ پریشانی دور کرنا دوسروں کی نہیں بلکہ آپ
کی مٹھی میں ہے۔ پھر شکایت کس بات کی؟ آپ بہترین لائحہ عمل پر غور کریں، اور اُس کو عملی جامہ
پہنادیں۔ نتیجتاً آپ تفکرات سے نجات حاصل کر لیں گے۔

پریشانی کوئی مادی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ سوچنے کا انداز ہے۔ اگر آپ ذہنی طور ایک
بیدار شخص ہیں اور آپ اپنے سوچنے کے انداز کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو پھر پریشانی

کی کوئی بات نہیں ہے۔

مثال کے طور پر اگر آپ اپنے ماضی کے کسی نقصان پر غمگین ہیں۔ تو آپ کو ماسوائے مسلسل سوچنے کے اور کیا حاصل ہوگا جو نقصان ہو چکا وہ تو کبھی واپس نہ آئے گا۔ اب اپنے ذہن کو پرسکون کرنے کا آسان حل یہ ہے کہ آپ حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔ کہ جو کچھ آپ نے کھو دیا وہ واپس ملنے والا نہیں ہے۔ اور اگر مستقبل کے اندیشے آپ کی پریشانی کا سبب ہیں تو آپ اپنے وہم کو یہ کہہ کر دور کر سکتے ہیں کہ میں ایسی چیز کے بارے میں کیوں فکر مند ہوں جو ابھی تک واقع نہیں ہوئی ہے۔ اور ہو سکتا یہ واقع ہی نہ ہو۔

پریشانیاں تین قسم کی ہوتی ہیں۔ پہلے نمبر پر زمانہ حاضر سے تعلق رکھنے والی پریشانیاں۔ جنہیں آپ دانشمندانہ منصوبہ بندی سے سے ذائل کر سکتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر زمانہ ماضی سے وابستہ پریشانیاں۔ جنہیں دور کرنے کا سادہ سا طریقہ ہے کہ ان کو بھول جائیں، پریشانیاں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ تیسرے نمبر پر مستقبل سے تعلق رکھنے والی پریشانیاں۔ یہ تو قطعاً پریشانیاں نہیں ہیں۔ یہ تو ایک بے بنیاد خوف ہیں۔ اور ایک بے بنیاد چیز آپ کے لیے کیسے پریشانی کا سبب ہو سکتی ہے۔

پریشانی کے اسباب معلوم کیجیے آپ نہایت آسانی سے اس سے چھٹکارا حاصل کر لیں گے۔ کیونکہ پریشانی کوئی فزیکل مسئلہ نہیں ہے۔ یہ دماغ میں شروع ہوتی ہے اور دماغ میں ہی ختم ہوتی ہے۔



صبر کیا ہے؟

ایک بامقصد شخص جذبات کی رو میں بہہ کر کبھی کوئی کام نہیں کرتا صبر کے لفظی معنی ”رکنا“ ہے۔ ایک بامقصد شخص جذبات کی رو میں بہہ کر کبھی کوئی کام نہیں کرتا۔ اُسے جب کوئی صورت حال پیش آتی ہے، وہ کچھ دیر ٹھہر کر سوچتا ہے۔ کہ اُسے کس طرح کا اظہار کرنا چاہیے۔ جو کہ اُس کے اصولوں اور مقصد حیات سے مطابقت رکھتا ہو۔ وہ اس

طرح کے جوابی رد عمل سے دور رہتا ہے جو کہ اُس کے اصولوں اور مقصد حیات سے متصادم ہوں۔
اس طرح وہ صبر کا مظاہرہ کرتا ہے۔

صبر ہماری زندگی کے ہر شعبہ سے منسلک ہے فرض کریں آپ کو کسی چیز کی شدید خواہش ہے۔ لیکن جیسے ہی یہ خواہش پیدا ہوتی ہے ویسے ہی آپ اُس کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بلکہ اپنی خواہش کو کنٹرول کرتے ہیں اُس کے بارے میں سوچ بچار کرتے ہیں پھر اُس صورت حال میں عقل و دانش جو راہنمائی دے اُس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ یہ ہی صبر پر چلنا ہے۔ فرض کریں کوئی شخص آپ کے لیے پریشانی کا باعث ہے۔ اور آپ اُس سے انتقام لینا چاہتے ہیں۔ لیکن آپ خود کو بدلہ لینے سے روکتے ہیں، پھر وہ کرتے ہیں، جو آپ کا ایمان (Faith) آپ سے چاہتا ہے۔ تو یہ صبر ہوگا۔ دوسری طرف صورت حال پر غور و فکر کیے بغیر جلد بازی میں جواب دینا بے صبری کے زمرے میں آتا ہے۔ اس لیے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ معاملات کا ہر پہلو سے گہرے غور و فکر کے ساتھ جائزہ لے کر جو اظہار کیا جائے، اُسی کو صبر کہتے ہیں۔



اپنا ہیرا خود تراشیں

انسان ہیرے کی مانند پوشیدہ خوبیوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ ان پوشیدہ خوبیوں کو حقیقت میں بدلے
ہیرا دنیا کی سب سے مہنگی ترین معدنیات ہے۔ یہ خالص کاربن کا بنا ہوتا ہے اور اس کے وہی بنیادی عناصر ہوتے ہیں جو کونکے کے ہوتے ہیں۔ ہیرا کو قدرتی شکل میں آنے کے لیے ایک طویل مدت درکار ہوتی ہے۔ جب یہ زمین سے نکالا جاتا ہے۔ تو یہ خام حالت میں ہوتا ہے۔ لیکن جب اسے تراشا اور پالش کیا جاتا ہے تو یہ قیمتی جوہر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ خام ہیرے سے ایک قیمتی ہیرا بننے تک اس کا پینٹنس (۳۵) سے ساٹھ (۶۰) فیصد تک حصہ ضائع کر دیا جاتا ہے۔

جو بات ہیرے کے لیے درست ہے، وہ انسان کے لیے بھی درست ہے۔ انسان ہیرے کی مانند پوشیدہ خوبیوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ ان پوشیدہ خوبیوں کو حقیقت میں بدلے۔ جس پر یہ راز منکشف ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی امکانی صلاحیتوں کو حقیقت میں بدلنے اور اپنی ممکنہ قابلیتوں کو سچائی کا روپ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ہی وہ شخص ہوتا ہے جیسے انسانی دنیا کا ہیرا کہا جاسکتا ہے۔ اگر آپ یہ سب کچھ کرنے کی کوشش نہیں کرتے، تو یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ نے اپنے نادر اشیاء ہیرے کو کچرا کنڈی میں پھینک دیا ہو۔

ہم سب کے اندر ایک امکانی کردار پوشیدہ ہے۔ یہ کردار فطرت کا ودیعت کردہ تحفہ ہے۔ یہ کردار خود روپ دے کی طرح خود بہ خود پروان نہیں چڑھتا ہے۔ بلکہ اس کی نشوونما کے لیے ہمیں جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ یہ ہی وہ جدوجہد ہے جو ہمیں اپنی ذات کے لیے کرنا پڑتی ہے۔ اور یہ ہی ہماری اصل آزمائش ہے۔

ہمیں اپنا اصل کردار دریافت کرنا چاہیے، جو فطرت نے ہم کو تحفہً دیا ہے۔ یہ کردار ایک نادر اشیاء ہیرے کی مانند ہوتا ہے۔ ہمیں دانشمندانہ پلاننگ سے اس ان گھڑے ہیرے کو ایک چمکتے ہوئے جوہر میں تبدیل کرنا چاہیے۔ اگر آپ اس کام میں ناکام ہو گئے، تو آپ زندگی میں ناکام ہو گئے۔



ناگوار صورت حال میں کیا کرنا چاہیے

ہمیشہ یاد رکھیں کہ دوسرے آپ کی زندگی میں رکاوٹیں کھڑی کر سکتے ہیں۔ لیکن کوئی آپ کی قسمت کا فیصلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے

ایک دفعہ میرے ایک قاری نے مجھے سے پوچھا کہ کن صورتوں میں معاف کرنا اچھا عمل نہ ہوگا۔

معاف کر دینے کا مطلب ہرگز پسپائی یا چپ سادہ لینے کا رویہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب ہے، جو ممکن ہو وہ کریں، جو ناممکن ہو اس کو نظر انداز کر دیں۔ بعض صورتوں میں لوگ یہ

دیکھتے ہیں کہ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز۔ لیکن اس طرح کی سوچ ناقابل عمل ہے۔ آپ معاملات کو اُن کے جائز یا ناجائز ہونے کے حوالے سے نہیں، بلکہ اُن کے نتائج کے حوالے سے دیکھیں۔ اگر آپ کے اقدامات کے نتائج اچھے آنے کی اُمید ہے۔ پھر یہ اچھے اقدام ہیں۔ اور اگر نتائج برے آنے کا خدشہ ہے۔ تو بہتر ہے ان اقدامات سے گریز کریں۔

اس زندگی میں انتخاب ہمیشہ صحیح اور غلط کے درمیان نہیں، بلکہ انتخاب قدرے چھوٹی اور بڑی برائی کے درمیان ہوتا ہے۔ ہر صورت حال میں چیزوں کی جانچ پرکھ بامقصد انداز سے ہونی چاہیے اس لیے یہ دریافت کرنے کی کوشش کریں کہ کون سا انتخاب آپ کے لیے بہتر ہے۔ بہتر انتخاب صحیح اور غلط کے حوالے سے نہیں بلکہ چھوٹی اور بڑی برائی کے حوالے سے ہو۔ جب انتخاب دو متضاد چیزوں کے درمیان ہو۔ تو کوئی بھی سمجھ دار آدمی ایسے عمل کا انتخاب نہیں کرے گا جس کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلے۔

چھوٹی برائی کا انتخاب کرنا صرف بڑی برائی سے گریز نہیں ہے۔ بلکہ اس کے دو بڑے واضح فائدے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ انتخاب آپ کو مزید نقصان سے بچاتا ہے۔ دوسرے نمبر پر آپ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ اپنے وقت کو ضائع نہ ہونے دیں۔ اور از سر نو اپنے سرگرمیوں کی منصوبہ بندی کر کے اپنے اہداف کو حاصل کریں۔

وسیع معنوں میں کوئی بھی صورت حال ناموافق نہیں ہوتی ہے، البتہ محدود معنوں میں کسی صورت کو آپ ناموافق کہہ سکتے ہیں۔ اور کسی صورت حال کا ناموافق ہونا صرف یہ ہے آپ کے لیے ایک راستہ بند ہو گیا ہے لیکن اسی اثناء میں دوسرا راستہ کھولا ہوتا ہے۔ آپ صرف سمت بدل کر اپنا سفر جاری رکھ سکتے ہیں۔ جب بھی آپ ناگوار صورت حال کا سامنا کریں، تو ہرگز تاخیر نہ کریں، بلکہ پلان کا از سر نو جائزہ لیں اور نئی جہتوں کے ساتھ اپنی ترجیحات طے کریں ہمیشہ یاد رکھیں دوسرے آپ کی زندگی میں رکاوٹیں کھڑی کر سکتے ہیں۔ لیکن کوئی آپ کی قسمت کا فیصلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے۔ آپ کا مقدر آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اور آپ صورت حال کا دوبارہ جائزہ لے کر، اپنے منصوبوں کو نئے سرے سے ترتیب دے سکتے ہیں اور اپنے اہداف کو متبادل راستے پر چل کر حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کو کچھ نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے تو اسے

عارضی سمجھیں۔ کیونکہ کوئی نقصان بھی مستقل نہیں ہوتا ہے۔

زندگی نشیب و فراز سے پُر ہے۔ ہر لمحے زندگی میں تغیر رونما ہوتے رہتے ہیں۔ نفع اور نقصان بھی تبدیلی کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ صورت حال، چاہے مثبت ہو یا منفی، عارضی نوعیت کی ہوتی ہے۔ تو جب کسی ناپسندیدہ صورت حال کا سامنا ہو تو مایوس نہ ہوں۔ صرف یقین رکھیں جلد بایدر مسئلہ ختم ہو جائے گا۔

صورت حال دن اور رات کی طرح ہوتی ہے۔ ہر تاریک رات کا خاتمہ ایک روشن دن پر ہے۔ یہ بات ہر انسان کے لیے درست ہے۔ ایک مشہور شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

یہ قانون فطرت ہے اور کسی میں طاقت نہیں کہ اس کو تبدیل کر سکے۔ انسانی تاریخ انفرادی اور قومی سطح پر اس طرح کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی مشکل صورت حال کا سامنا کرتا ہے لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہر چیز معتدل (Normal) ہو جاتی ہے۔ قوم کا معاملہ خصوصیت کا حامل ہے۔ کیونکہ کوئی بھی شخص تاریخ کا راستہ یا درپیش حقائق کو بدل نہیں سکتا۔ اس لیے ہمیں اس سے سبق لینا چاہیے۔

ناپسندیدہ صورت حال کیسی بھی ہو ماسوائے ایک نئے چیلنج کے اور کچھ نہیں۔ جب آپ چیلنج کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے تو جان لیں گے کہ یہ چیلنج تو آپ کے لیے ایک پوشیدہ نعمت تھا۔ اس ناپسندیدہ صورت کا پیش آنا درحقیقت آپ کو بہتر چیز کے لیے بنیاد فراہم کرنا تھا۔



مسئلہ بذات خود ایک حل ہے

ہر سوال اور مسئلہ آپ کے دماغ کے لیے ایک چیلنج ہوتا ہے۔ ایسے چیلنج کو ہمیشہ دماغ قبول کرتا ہے پھر بطور ایک قدرتی فرض کے ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے مشہور کہاوتیں ہیں: 'ضرورت ایجاد کی ماں ہے'۔ 'جہاں چاہ وہاں راہ'۔ ان کہاوتوں کی

اساس انسان کے دماغ کی پوشیدہ صلاحیتوں پر ہے۔ اور ہر آدمی کا دماغ زبردست ممکنہ قابلیت کا حامل ہوتا ہے۔ جب دماغ کے سامنے کوئی مسئلہ پیش آتا ہے۔ تو اُس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کرنا اُس کی فطرت میں ہے۔ ماسوائے یہ کہ آپ دانستہ اُس کے سوچنے کے عمل کو معطل کر دیں۔

ایک دفعہ برطانیہ کے ایک شہر میں میری ملاقات ایک نوجوان عرب سے ہوئی، جس نے مجھے بتایا کہ اُس نے ماسٹر کی ڈگری حاصل کر لی ہے اور اب اُس نے اپنے نام ڈاکٹریٹ میں داخلہ لینے کے لیے رجسٹرڈ کر دیا ہے۔ میں یہ سن کر بہت خوش ہوا، اور اُس کی کامیابی کے لیے دعا کی۔ کیونکہ میں حصول تعلیم کا بڑا حامی ہوں۔ اس لیے میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ تعلیم ہر طرح کی ترقی کے لیے، چاہے وہ نظریاتی ہو یا عملی، لازمی ہے۔ لیکن چند سال کے بعد جب میں اُسی شہر میں دوبارہ گیا۔ میری اُس عرب نوجوان سے دوبارہ ملاقات ہوئی، تو اُس نے مجھے بتایا کہ اُس نے اپنے ڈاکٹریٹ سے متعلقہ کام روک دیا ہے۔ مجھے یہ سن کر بہت دکھ ہوا۔ میں نے پوچھا آپ نے ایسا کیوں کیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُس نے حال ہی میں شادی کی ہے اور اُس کی بیوی کو انگلش زبان نہیں آتی ہے۔ لہذا گھر کے باہر کے سارے کام اُسے کرنے پڑتے ہیں۔ میں نے کہا یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے میں آپ کو ترکیب بتاتا ہوں: کہ 'مسئلے کو حل نہ کرنا بھی مسئلے کو حل کرنا ہے'۔

میرے اصرار پر، اُس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اُس کے مُرشد نے اُسے حکم دیا ہے کہ میں اپنی تعلیم دوبارہ جاری کروں، اور گھر کے کام اپنی بیوی پر چھوڑ دوں۔ اُس دن سے وہ خاتون اندرونی اور بیرونی تمام گھریلو کاموں کی ذمہ دار ہو گئی۔ پھر ایک سال کے اندر اندر یہ معجزہ ہوا کہ اُس نوجوان عرب کی بیوی نے عام بول چال کی انگلش میں عبور حاصل کر لیا۔ اور تمام گھریلو کام با احسن خوبی انجام دینے شروع کر دیئے۔

اگر آپ نئے مسائل کا سامنا کرتے ہیں تو ہرگز یہ نہ کہیں کہ آپ ان مسائل کو حل کرنا نہیں جانتے۔ آپ صرف ان مسائل کو حل کرنے میں لگ جائیں بہت جلد آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ آپ کا دماغ ایسے راستے پر چل پڑا ہے جو انتہائی تیزی سے آپ کو مسئلے حل کرنے کے قابل کر دے گا۔

جب آپ کوئی مسئلہ کمپیوٹر کے سپرد کرتے ہیں۔ تو یہ اُس پر ناقابل یقین رفتار سے کام

شروع کر دیتا ہے۔ جو کہ جدید الیکٹرونکس نے اُس کے لیے ممکن بنا یا ہے۔ یہ چند منٹوں میں اور بعض اوقات تو چند سیکنڈز میں وسیع اعداد شمار کی جانچ پرکھ کر کے آپ کو صحیح جواب دے دیتا ہے۔ دماغ کے لیے بھی یہ بات سچ ہے۔ دماغ ایک سپر کمپیوٹر کی مانند ہے۔ جس کے سامنے جب کوئی آپ مسئلہ پیش کرتے ہیں تو یہ فوراً اُس پر کام شروع کر دیتا ہے۔ اور تمام متعلقہ معلومات کو کھنگال کر، اور معاملے کا ہر پہلو سے جائزہ لے کر آپ کے سامنے ایک بہترین حل پیش کرتا ہے۔

ہر سوال اور مسئلہ آپ کے دماغ کے لیے ایک چیلنج ہوتا ہے۔ ایسے چیلنجز کو ہمیشہ دماغ قبول کرتا ہے پھر بطور ایک قدرتی فرض کے ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لہذا اگر آپ کسی مسئلہ کا سامنا کرتے ہیں۔ تو ذہنی دباؤ یا مایوسی کا شکار نہ ہوں۔ بس اس مسئلہ کو دماغ کے سپرد کر دیں۔ آپ کا دماغ مسائل کو بہت اچھا حل کرنے والا ہے۔ آپ دیکھیں گے یہ خود کار طریقہ سے ایک مشین کی طرح کام کرتا ہے۔ یقینی طور، یہ اُس وقت آرام تک نہیں کرے گا جب تک مسئلہ کا حل نہ تلاش کر لے۔

نفسیات کا علم ہمیں بتاتا ہے کہ دماغ کبھی کام کرنے سے نہیں رکھتا۔ یہ دن رات خود کار مشین کی طرح کام کرتا ہے۔ یہ دماغ ہمیشہ آپ کے پاس ہوتا ہے۔ آپ اسے کسی بھی وقت استعمال کر سکتے ہیں اور آپ کی عقل و دانائی کے حوالے سے یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ مسئلہ بغیر دماغ کے ایک مسئلہ ہے لیکن مسئلہ دماغ کے ساتھ مل کر حل بن جاتا ہے۔ دماغ ایک طاقتور نمائندہ ہے جس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ مسئلے اور حل کے درمیان جو فاصلہ ہے اُس کو سمیٹ دیتا ہے۔

نفسیات دماغ کی سائنس ہے۔ اور اس سائنس نے ثابت کیا ہے۔ دماغ کے اندر لامتناہی صلاحیت ہے۔ یہ کسی بھی مسئلہ کو حل کرنے کی لامحدود قابلیت رکھتا ہے۔ بس آپ نے اپنے دماغ کو مطالعے، مشاہدے اور غور و فکر سے تیار رکھنا ہے۔

ابتدائی طور پر دماغ آپ کو مواقع کی نشاندہی کرے گا۔ یہ صرف آپ ہیں جو ان مواقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی ترقی کی نیو (Base) اٹھا سکتے ہیں۔ ہر شخص دماغ کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن

صرف وہ ہی لوگ اپنے دماغ کو بھرپور طریقے سے استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جنہوں نے مطالعے اور تربیت سے اپنے دماغ کو چاک و چوبند کیا ہے۔



کامیاب زندگی کیسے گزاریں

ہر مرد و عورت کا سب سے طاقتور جذبہ اپنے ذاتی مفاد کا خیال رکھنا ہے۔ ہر انسان کا من خواہشات سے بھرا ہوا ہے۔ ہر انسان یہ ضروری خیال کرتا ہے کہ اُس کی خواہشیں پوری ہوں۔ یہ ہی وہ رویہ ہے جو کرپشن، عدم انصاف اور ہر طرح کی برائی کا باعث ہوتا ہے۔ چونکہ تخلیقی منصوبہ کے مطابق، یہاں ہر کوئی آزاد ہے اس لیے ممکن نہیں کہ معاشرتی برائیوں کا جڑ سے قلع قمع کر دیا جائے۔

انسان کو پھر ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تمام معاشرتی برائیوں کو ختم کرنا ممکن نہیں ہے۔ پھر دوسروں کی لوٹ مار سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ یعنی استحصال کرنے والی دنیا میں استحصال سے بچ کر جینا۔ استحصال سے کبھی کوئی دور خالی نہیں رہا ہے۔ لیکن اپنے آپ کو استحصال سے بچانا ہر دور میں ممکن رہا ہے۔ مسائل کی شکایات نہ کریں۔ بلکہ مسائل کی چول اس طرح بٹھائیں کہ وہ آپ کے موافق ہو جائیں۔

یہ صورت حال جو کہ ساری دنیا میں چھائی ہوئی ہے۔ یہ کوئی برائی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک عظیم نعمت ہے۔ یہ ہی وہ چیز ہے جو چیلنج اور مسابقت کو تخلیق کرتی ہے۔ اور انسانی ترقی کا واحد راستہ یہ چیلنج اور مسابقت ہی ہیں۔ اور یہ ہی وہ حالات ہیں جو انسانی قابلیتوں کو ظہور میں لاتے ہیں۔

ایک دفعہ میں ایک چڑیا گھر (Zoo) گیا جہاں ہرنوں کی ایک بڑی پارک تھی جس کو اس طرح بنایا گیا تھا کہ جتنا ممکن ہو سکے، وہ قدرتی ماحول کے مطابق ہو۔ یقیناً یہ جنگلی جانوروں کے لیے ایک مثالی ماحول تھا لیکن چڑیا گھر کے منتظمین کے مطابق، اس پارک میں گوشت خور جانور نہ ہونے کی وجہ سے ہرنوں میں پھرتی نہیں ہے۔ اور یہ بھی مشاہدہ کیا گیا کہ جب ہرن اپنے

قدرتی ماحول یعنی جنگل میں ہوتے ہیں۔ وہ بھیڑیا اور اسی طرح کے اور خون خوار جانوروں کی وجہ سے مسلسل خطرے میں ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں پارک میں انہیں اس طرح کا کوئی خطرے نہیں ہے۔ نتیجتاً ان کے جسمانی اور ذہنی سستی کی وجہ سے ان کا تولیدی نظام (Reproductive System) متاثر ہو جاتا ہے۔ اس لیے چڑیا گھر کے منتظمین نے بتایا کہ وہ گاہے بگاہے بھیڑیا پارک میں چھوڑ دیتے ہیں۔ تاکہ ہرنوں کو جیسے بھی ہو اپنی جان بچانے کے لیے دوڑنا پڑے۔ ایک دفعہ جب ہرن اس طرح ڈر جاتا ہے۔ تو معمول کے مطابق متحرک ہو جاتا ہے۔ اور ان کی اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت بحال ہو جاتی ہے اور وہ اپنی نسل کو باقی رکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

یہ فطرت کا قانون صرف جانوروں کے لیے ہی نہیں بلکہ انسانوں کے لیے بھی ہے۔ تمام انسان بہت سی ممکنہ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ان صلاحیتوں کو آشکارا کرنے کے لیے انہیں مسلسل چیلنجز کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے فلسفی برائی کا مسئلہ کہتے ہیں درحقیقت وہ چیلنجز کا مسئلہ ہے۔ یہ چیلنجز ہیں جو انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار رکھتے ہیں۔ زندگی چیلنجز سے لبریز ہے ہر نقصان ایک چیلنج ہے، غربت ایک چیلنج ہے۔ مشکلات ایک چیلنج ہیں۔ ناگوار صورت حال ایک چیلنج ہے۔ حتیٰ کہ پیدائشی طور پر معذور پیدا ہونا ایک چیلنج ہے۔ یہ تمام چیلنجز درحقیقت پوشیدہ نعمتیں ہیں۔ یہ چیلنجز ترقی کی بنیاد ہیں۔



کمفرٹ زون

آپ کا پرسکون دائرہ عمل میں رہنا ممکن ہے آپ کے لیے آرام دے ہو۔ لیکن یہ صرف آپ کے سوچنے کا انداز ہے۔ اگر آپ اپنے سوچنے کا انداز بدل دیں تو ہر دائرہ عمل آپ کے لیے راحت جا بن جائے گا۔

کسی انسان کا کمفرٹ زون وہ ہوتا ہے جہاں وہ سکون اور آسانی محسوس کرتا ہے۔ یہ رجحان عام ہے۔ تقریباً ہر مرد و عورت کبھی نہ کبھی اس طرح کی صورت حال سے ضرور گزرتے ہیں

لیکن کمفرٹ زون کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بس یہ ایک نفسیاتی حالت ہے جس کی وضاحت غالباً کمفرٹ زون کہہ کر کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر شادی سے پہلے لڑکا اور لڑکی اپنے حقیقی خاندان (Blood relation) کے ساتھ رہتے ہیں۔ جو کہ رفتہ رفتہ اُن کے لیے ایک کمفرٹ زون بن جاتا ہے۔ لیکن شادی کے بعد انہیں نئے رشتوں (None blood relation) کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ یہ معاملہ اگر شعوری نہیں تو غیر شعوری طور پر اُن کے لیے نان کمفرٹ زون بن جاتا ہے۔ جبکہ اس کے لیے کوئی بھی مضبوط جواز موجود نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تو صرف ایک نفسیاتی حالت کا نام ہے۔ اگر لڑکا اور لڑکی اصل صورت حال کو سمجھیں تو وہ جان لیں گے کہ یہ مسئلہ منجمنٹ کا معاملہ ہے نہ رد عمل کا۔

کمپنیز کے حوالے سے بھی یہ بات سچ ہے۔ اکثر ملازمین جب طویل عرصہ ایک جگہ تعینات رہتے ہیں تو اُن کی تعیناتی کی جگہ اُن کے لیے کمفرٹ زون بن جاتی ہے۔ پھر وہ پسند نہیں کرتے کہ وہاں سے کہیں اور اُن کا تبادلہ ہو۔ میں دوبارہ پھر کہوں گا یہ ایک نفسیاتی حالت ہے ورنہ ایسے محسوس کرنے کی کوئی بھی معقول وجہ موجود نہیں ہے۔

شاید کمفرٹ زون آپ کو کمفرٹ لگے۔ لیکن یہ صرف آپ کے سوچنے کا انداز ہے۔ ورنہ اگر آپ یہ مشروط سوچ کو تبدیل کر دیں، ہر زون آپ کے لیے کمفرٹ زون ہوگا۔ نام نہاد کمفرٹ زون چیلنجز سے خالی ہوتا ہے۔ جہاں یقیناً سکون محسوس ہوگا۔ لیکن چیلنجز کی عدم موجودگی میں، آپ نئے تجربات کے راستے بند کر دیں گے۔ اس طرح آپ اپنی ذہنی ترقی اور تخلیقی سوچ کو ترقی دینے کے قابل نہ رہیں گے۔ اس صورت حال میں ڈر ہے کہ مبادا آپ کی عقل و بصیرت ذہنی بونا پن (Dwarfism) کا شکار نہ ہو جائے۔

اس کے برعکس اگر آپ کمفرٹ زون میں رہنے کو ترجیح نہیں دیتے۔ اور ہر نئے زون میں اُترنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ ہر لمحہ نئے تجربات سے آگاہ ہوں گے اور ہر موڑ پر مختلف چیلنجز کا سامنا کریں گے۔ اور ان صورت حال سے نبر آزما ہوتے ہوئے۔ آپ اپنے اندر تخلیقی فکر کو ترقی دینے کی قابلیت پیدا کر لیں گے۔

ممکن ہے ایک کمفرٹ زون ہر طرح کی تعیش کا سامان رکھتا ہے۔ لیکن اس زون میں

رہنا آپ کی ذہنی ترقی کو کبھی بھی فروغ نہیں دے سکتا۔ کمفرٹ زون میں رہنا آپ کو چیلنجز سے نمٹنے کی قابلیت چھین لیتا ہے۔ اگرچہ یہ زون آپ کے پیشہ وارانہ کام کرنے کی جگہ ہو، لیکن اس کے اثرات آپ کی گھریلو زندگی اور دیگر شعبہ ہائے زندگی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ابتداء میں آپ اپنے پیشہ وارانہ کام کرتے ہوئے مسائل کو تخلیقی انداز میں حل کرنے میں ناکام ہوں گے۔ لیکن بعد ازاں آپ زندگی کے دیگر معاملات کو تخلیقی انداز میں حل کرنے میں قاصر ہو جائیں گے۔

کمفرٹ زون ایک غیر تخلیقی زون کا خوبصورت نام ہے۔ جیسے پرندے جب پنجرے میں رہتے ہیں تو ممکن یہ ان کے لیے ایک کمفرٹ زون ثابت ہو۔ لیکن اپنے پروں کو استعمال نہ کرنے کی وجہ سے یہ پرنا کارہ ہو جاتے ہیں۔

سماول سمائل اسکا وٹس مصنف نے اپنی کتاب سیلف ہیلپ (Self Help) میں بالکل درست کہا ہے۔ کہ انسان کو آسانی نہیں جدو جہد، سہولت نہیں مشکل انسان بناتی ہے۔ مشکلات آدمی کو متحرک رکھتی ہیں۔ جہاں مشکلات نہ ہوں وہاں آدمی دھیرے دھیرے سُست اور ناکارہ ہو جاتا ہے۔

تاہم یہ بات مناسب نہیں ہے کہ محض اپنے عزم کے جوش میں اپنے زون سے باہر چھلانگ لگا دیں۔ یہ حادثات کا موجب ہو سکتا ہے۔ البتہ اگر صورت حال تبدیلی کا تقاضا کرے تو ہرگز نہ ہچکچائیں۔ بلکہ اسے حالات کا تحفہ سمجھ کر قبول کریں۔ کوئی بھی حادثہ اچھا نہیں ہوتا ہے۔ لیکن ہمت اور دانائی کے ساتھ چیلنجز کا سامنا کرنا، لازمی طور پر اپنی قیمت ادا کرتا ہے۔

ایک کمفرٹ زون ایک خیالی دنیا ہے۔ آپ اپنی عقل و بصیرت کی اساس پر نہیں، بلکہ اپنے جذبات کی بنیاد پر یہ دنیا تخلیق کرتے ہیں۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تاریخ کی تمام کامیابیاں جذبات کا نہیں بلکہ عقل دانش کا ثمر ہیں۔

☆☆

کوئی گلاب کانٹے کے بغیر نہیں ہے

وہ شخص جو منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوتا ہے، اور اس کی زندگی مسائل سے بھی آزاد ہوتی

ہے۔ وہ اپنے آپ کند ذہن پاتا ہے۔ اس کے برعکس وہ شخص جو مشکلات اور مسائل بھری دنیا میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ متحرک ذہن رکھتا ہے۔

ہر انسان ذہنی سکون کا خواہشمند ہے۔ لیکن بمشکل ایسا کوئی انسان ملے گا جو یہ کہہ سکتا ہو کہ اُس نے ایک اسی متوازن ذہنی حالت حاصل کر لی ہے جو اُسے کامل سکون و اطمینان سے زندگی گزارنے میں معاون ہو۔۔۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ذہنی سکون ایک خواب بن کر رہ گیا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ ایک مثالی امن کے خواہشمند ہیں یعنی مکمل سکون۔۔۔ ایسا سکون جو ہر قسم کی بد امنی سے دور ہو۔

لیکن فطرت کے کارخانے میں اس قسم کا سکون نہیں ہے۔ گلاب کی مثال لیجیے۔ گلاب کا پھول بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ لیکن اس کی ہر شاخ پر کانٹے ہیں۔ یقیناً کانٹے گلاب کے پودے کا لازمی حصہ ہیں۔ کسی شاعر نے بالکل درست کہا ہے کہ کانٹے گلاب کے چوکیدار ہیں۔ شعر کا مفہوم کچھ یوں ہے۔ پھول کی حفاظت ناممکن ہو جاتی اگر کانٹے ریشم جیسے نرم و نازک ہوتے۔ لہذا پھولوں کی حفاظت کانٹے کرتے ہیں۔ اور نرم و ملائم پھول کے ساتھ ایک تیز کانٹوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے گھردری اشیاء پر امن اشیاء کے ساتھ ہونی چاہیے۔ ایک پر سکون دماغ انسانی فطرت کا انتہائی قیمتی تحفہ ہے۔ اور اُسے بھی اپنا منفرد معیار برقرار رکھنے کے لیے حفاظت کی ضرورت ہوتی ہے۔

نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ پریشانی سے آزاد ذہن بہت جلد جمود کا شکار ہو کر اپنی تخلیقی صلاحیتیں ضائع کر دیتا ہے۔ اس وجہ سے فطرت ہمیشہ لوگوں کو چیلنجنگ صورت حال سے روشناس کراتی ہے۔ اس لیے یہ غیر آسودہ اشیاء ہی ہیں جو انسانی ذہن کے لیے چیلنج کا کردار ادا کرتی ہیں۔ اور یہ بات حتمی ہے کہ ایک پر امن ذہن کی تخلیقی صلاحیتیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ مزید تخلیقی ذہن ہمیشہ زندہ و بیدار رہتا ہے۔

یہ ایک عام سی چیز ہے کہ وہ شخص جو منہ میں سونے کا چچے لے کر پیدا ہوا ہو، اور اُس کی زندگی میں مسائل و پریشانیوں کا گزر نہ ہوا ہو وہ کند ذہن ہو جاتا ہے۔ اُس کے ذہنی گوگھن لگ جاتا ہے۔ اس کے برعکس وہ شخص جس نے مشکلات اور مسائل سے لبریز ماحول میں جنم لیا ہو۔ وہ

تیز طرار اور متحرک ذہن شخص ہوتا ہے۔ اس طرح کا آدمی اپنی تخلیقی صلاحیت کو فروغ دیتا ہے۔ اور اُس کا ذہنی ارتقاء بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہتا ہے۔

یہاں میں ایک ذاتی مشاہدہ آپ کی نظر کروں گا۔ میں ایک ایسے سیاست دان کو جانتا ہوں۔ جس کے دو بیٹے تھے ایک سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔ اُس نے اپنے اس بیٹے کی پسند کی شادی کروائی۔ اور رہنے کے لیے ایک فارم ہاؤس دیا جہاں وہ سکھ چین کی زندگی بسر کرے۔ میں اُس سیاست دان کے چہیتے بیٹے سے ملا اور اُس سے گفتگو کے دوران مجھے یوں لگا گویا کہ میں کسی پاگل سے بات کر رہا ہوں۔ اُس نے کچھ مجھے سے الٹ پٹ فصول سی باتیں کیں۔ اُس کی ساری گفتگو میں کہیں بھی دانائی کا گزرنہ تھا۔ مجھے اُس کے دوسرے بھائی سے بھی ملاقات کا موقع ملا۔ جس کو اُس کے والد نے پر تعیش زندگی سے دور رکھا تھا۔ اس لیے وہ شہر چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلا گیا۔ چند سالوں کی جدوجہد کے بعد وہ ایک کامیاب شخص بن گیا۔ میری اُس سے ملاقات ہوئی مجھے اُس کی ساری گفتگو حکمت و دانائی لبریز محسوس ہوئی۔

انسانی ذہن پتھر کی مانند ساکن نہیں ہوتا، اُسے مسلسل چیلنجز کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اُسے متحرک رکھیں چیلنجز کے ماحول میں یہ لگا تار ترقی کرتا ہے حتیٰ کہ یہ اعلیٰ دماغ بن جاتا ہے۔ دوسری طرف ایسے ماحول میں جہاں چیلنجز نہ ہوں۔ وہاں انسانی دماغ ایسے مرجھائے خشک پودے کی مانند ہوتا ہے جس میں کوئی نشوونما نہ ہو۔

امن کوئی بنی بنائی چیز نہیں ہے۔ اس کے لیے خود کوشش اور انتظام کرنا پڑتا ہے۔ انسان کو اتنا ذہین ہونا چاہیے کہ وہ اپنے دماغ کو مثبت خطوط پر استوار کر سکے تاکہ وہ ناپسندیدہ صورت حال کو اچھے طریقے سے سنبھال سکے۔ پُر امن دماغ کا دوسرا نام مثبت ذہن ہے۔

سماول سمائل اس کا وٹش مصنف نے بالکل درست کہہ ہے۔ آسانی نہیں جدوجہد، سہولت نہیں مشکل انسان کو انسان بناتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ آسانی اور سہولت ذہنی ترقی میں مستقل رکاوٹ ہیں۔ جب کہ مشکلات اور جدوجہد ایک بنیاد کی مانند ہیں جس پر عقل و دانش کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔



زندگی ایک چیلنج ہے

یہ فیصلہ بہت اہمیت کا حامل ہے کہ جس لمحے ہم محسوس کریں کہ ہم نے غلط راستے پر قدم اٹھالیا ہے۔ ہمیں مزید تباہی سے بچنے کے لیے فوراً وہاں سے یوٹرن لے لینا چاہیے۔ برٹش تاریخ دان آرئلڈ ٹونن بی نے بالکل درست نشاندہی کی ہے کہ قوموں کو لازمی طور پر چیلنج قبول کرنا چاہیے۔ چیلنج کے دو درجے ہیں۔ یا تو اتنے شدید ہوتے ہیں کہ انہیں کو سنبھالنا ناممکن ہوتا ہے۔ یا پھر وہ حد کے اندر اور قابل تسخیر ہوتے ہیں۔ موخر الذکر چیلنج ترقی میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ لیکن جب مسائل بہت زیادہ اور سنگین نوعیت کے ہوں اور حالات کنٹرول سے باہر ہو جائیں تو یہ تباہ کن ثابت ہوتے ہیں۔

بطور ایک قانون کے چیلنج دو درجات میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایسے چیلنج جنہیں آسانی سے پورا (Tractable) کیا جاسکتا ہے اور دوسرے ایسے چیلنج جن کا پورا کرنا ممکن نہیں ہے۔ اول الذکر چیلنج قدرت کے متواتر کام کرنے کا طریقہ ہے۔ یا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ خالق کائنات کی اسکیم کا حصہ ہے۔ یہ ہی فطرت کا طریقہ جس کے ذریعہ وہ صورت حال وجود میں آتی ہے جس کے نتیجے میں چیلنج اُبھر کر سامنے آتے ہیں جو لوگوں کو تحریک دیتے ہیں کہ وہ اپنی حتی المقدور کوشش سے انہیں پورا کریں۔ تاکہ ان کی پوشیدہ قابلیتیں ظہور میں آئیں۔

بطور ایک قانون، فطرتی طریقہ کے تحت چیلنج پورا کرنا کسی حد تک آسان ہوتے ہیں۔ تاہم اگر کوئی چیلنج ناقابل حصول ہو۔ تو یہ لازمی طور پر انسان کی غیر حقیقت پسند پالیسی کا خمیازہ ہوتا ہے۔ مشہور کہاوت ہے کہ ”غلطی کرنا انسان کا خاصا ہے۔“ اور غلطی کرنا کسی آدمی یا قوم کے لیے کوئی اچھے کی بات نہیں ہے۔ یہ لامحالہ ہو جاتی ہے لیکن اہمیت کی بات یہ ہے کہ جس لمحے ہمیں معلوم ہو کہ ہم نے غلط سمت میں سفر شروع کر دیا ہے۔ تو ہمیں مزید نقصان سے بچنے کے لیے فوراً وہاں سے یوٹرن لے لینا چاہیے۔ ماضی قریب میں اس کی بہت سے مثالیں ملیں گی۔ مثال کے طور پر 1965 میں سنگا پور اپنے اندرونی دباؤ کی وجہ سے ملائیشیا سے علاحدہ ہو گیا تھا۔ اس علیحدگی کے نتیجے میں ملائیشیا کو وسیع علاقے سے دستبردار ہونا پڑا۔ یہ ضرور ملائیشیا کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا

تھا۔ لیکن اس میں اُس کا کوئی نقصان نہ ہوا۔ کیونکہ ملائیشیا نے اسے بطور ایک چیلنج قبول کر کے بڑی حقیقت پسندانہ سوچ کا مظاہرہ کیا۔ اس طرح یہ سارا معاملہ قابل انتظام رہا۔ اور دونوں ملکوں کی ترقی کا باعث بنا۔

دوسری مثال جرمنی کی ہے۔ جیسے بیسویں صدی کے آغاز میں معاشی اور سیاسی مسائل نے گھیر لیا۔ شروع شروع میں تو جرمنی نے اُن سنجیدہ مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جب معاملات زیادہ بگڑ گئے۔ تو جرمنی لیڈرشپ نے ہمسایہ ممالک سے جنگ چھیڑ دی جو بڑھتے بڑھتے دوسری جنگ عظیم میں تبدیل ہو گئی اور یہ جرمنی کے لیے ایک ایسا زبردست چیلنج بنا، جو اُس کی شکست پر منتج ہوا۔ تاہم 1945 میں دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر، جرمن لیڈرشپ نے اپنی شکست کو قبول کیا، اور اپنے آپ کو مزید تباہی سے بچانے کے لیے بغیر وقت ضائع کیے یوٹرن لے لیا۔ اس طرح انھوں نے بھرپور جوش و جذبہ سے اپنی قومی تعمیر کا آغاز کیا۔ جس کے نتیجے میں جرمن بہت ہی قلیل عرصہ میں یورپ کی ایک طاقتور قوم بن کر ابھری۔

زندگی فرد واحد اور قوم دونوں کے لیے ایک آزمائش ہوتی ہے۔ اس لیے قابل حصول چیلنجز کے ذریعہ ان کی آزمائش کی جاتی ہے۔ اور اُس وقت قوم یا فرد کو دو میں سے ایک حقیقی یا غیر حقیقی لائحہ عمل چننا ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں قابل حصول اور ناقابل حصول اہداف میں امتیاز کرنا پڑتا ہے۔ اس سخت مرحلے سے ہر فرد و قوم کا سابقہ پڑتا ہے۔ جو کوئی حقیقت پسندانہ لائحہ عمل طے کرتا ہے وہ اپنا ہدف حاصل کر لیتا ہے۔ جب کہ وہ شخص جو ایسے اہداف حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو کہ حقیقت میں ناقابل حصول ہوتے ہیں۔ یقینی طور نا کامی اُس کا مقدر ہوگی۔



ذہن: شعور اور لاشعور

سچائی کو تلاش کرنا بہت آسان ہے۔ بربادی سے بچنے کی واحد شرط یہ ہے کہ سادہ زندگی اور اعلیٰ سوچ اختیار کی جائے۔

ہر انسانی دماغ دو لازمی حصوں یعنی شعور اور لاشعور میں منقسم ہے۔ اس تقسیم میں کسی بھی

انسان کو استثناء حاصل نہیں ہے۔ دماغ کا شعوری حصہ ہر اُس چیز کے ساتھ معاملات کرتا ہے جو ہمارے علم و آگہی کے دائرے میں ہے۔ جب کہ لاشعور اُن تمام معاملات کو منظم کرتا ہے جن کے بارے میں انسان بے خبر ہوتا ہے۔ لیکن وہ معاملات اُس کے رویہ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

انسانی جسم کا نظام بہت پیچیدہ ہے۔ اس میں ہر وقت بے شمار کام انجام پارہے ہوتے ہیں۔ جیسے دیکھنا، سننا، نظام انہضام اور نظام تنفس کا خود بخود کام کرنا وغیرہ وغیرہ۔ تقریباً ان تمام نظاموں کو لاشعور کنٹرول کر رہا ہوتا ہے۔ ان جسمانی سرگرمیوں میں شعوری حصہ کا کردار بہت معمولی ہے۔

تاہم شعوری حصہ سوچنے سمجھنے اور حقائق کا تجزیہ کرنے کی لامحدود صلاحیت رکھتا ہے، جس کی وجہ سے یہ ہماری شخصیت کا بڑا اہم حصہ ہے۔ تاہم ربانی اسکیم کے مطابق، بہت زیادہ چیزیں لاشعوری حصہ کے زیر نگرانی ہیں۔ تو پھر سوال ہے کہ شعوری حصہ کی لامحدود صلاحیتوں کا کیا کردار ہے؟ دراصل خالق کائنات نے شعور کو انسان کی داخلی سرگرمیوں سے کسی حد تک دور رکھا ہے تاکہ وہ ایک سوہو کر عظیم سچائی کو تلاش کرے۔ جیسا کہ سچ کی تلاش ہر انسان کا سب سے اعلیٰ و ارفع مقصد ہے۔

سچ کیا ہے؟ اگر کھلے الفاظ میں بیان کیا جائے۔ تو سچ زندگی کی حقیقت ہے۔ ہمیں یہ ضرور معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ زندگی کے اسرار (Secret)، زندگی کا مقصد اور زندگی کا حقیقی ہدف کیا ہے۔ ہمارے دل میں یہ جاننے کی خواہش ہونی چاہیے کہ فرد واحد اور معاشرے کے لیے کیا بہتر ہے، مختصر یہ کہ ہماری زندگی کے گہرے معنی کیا ہیں۔

ان سوالوں کے جوابات کسی پہاڑ پر گنداں نہیں ہوتے۔ کہ جہاں جا کر انسان انہیں پڑھ لے، بلکہ یہ انسان کی ذمہ داری ہے۔ کہ وہ ان تمام چیزوں کو دریافت کرے تاکہ اُس کی رسائی سچائی تک ہو جائے۔ اور سچائی کا علم اتنا ضروری ہے کہ خالق کائنات نے ہمارے جسمانی معاملات لاشعور کے سپرد کر دیئے ہیں اب انسان اور اُس کا شعور زندگی کی سچائیوں کو تلاش کرنے کے لیے مکمل طور پر آزاد ہے۔ لیکن انسان کی اس طرف توجہ نہیں ہے جیسے کہ یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ مایوسانہ زندگی گزارتے ہیں حتیٰ کہ عظیم لوگ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ وہ مایوسی میں

جیتے اور مایوسی میں مر جاتے ہیں۔ ٹینشن اور ذہنی دباؤ ہمارے زمانے کی سب سے بڑی نفسیاتی بیماریاں ہیں۔ اس صورت حال کی وجہ یہ ہے کہ لوگ سچ کو تلاش کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں۔ قدرتی طور پر ہر شخص متلاشی (Seeker) ہے لیکن ہر کوئی اپنا مقصد حیات جانے بغیر زندگی گزار رہا ہے۔ بے مقصدیت کے احساس کے نتیجہ میں، لوگ الجھن اور پریشانی میں زندگی گزارتے ہیں۔ وہ بولتے ہیں لکھتے ہیں لیکن بغیر کسی واضح نصب العین کے۔ اُن کی زندگی تضادات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ وہ کچھ تلاش کے کرنے خواہاں ہیں یہ جانے بغیر کہ وہ کس چیز کے متلاشی ہیں۔

ٹینشن سے آزاد وہ ذہن ہوتا ہے جو تضادات کے باوجود مثبت سوچ سکتا ہے۔ لوگ عدم اطمینان میں جیتے ہیں وہ کام کرتے ہیں لیکن اپنی نوکری سے مطمئن نہیں ہوتے۔ وہ دھن دولت کماتے ہیں لیکن داخلی کیفیت عدم اطمینان سے دوچار رہتی ہے۔ وہ اس فارمولے کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ زندگی سے لطف اٹھاؤ! لیکن وہ نہیں جانتے کہ زندگی کیا ہے۔ حقیقی مسرت کس چیز کا نام ہے۔ یہ ایک تناقض (Paradoxical) صورت حال ہے۔ اور نتیجتاً ہر کوئی تضادات کی دنیا میں رہ رہا ہے

یہ تضادات، ذہنی دباؤ ٹینشن سب اپنے تخلیق شدہ مسائل ہیں۔ جب خالق کائنات نے آپ کو دماغ دیا ہے۔ اور آپ کو اسے آزادی سے استعمال کرنے کو موقع دیا ہے تو پھر آپ کو اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے آپ کو اپنے سوچنے کی صلاحیت کو متحرک کرنا اور حقیقت کو دریافت کرنا چاہیے۔ آپ کو وہ بھی پڑھ لینا چاہیے جو کارخانہ قدرت میں پوشیدہ غیر تحریری شکل میں موجود ہے۔

یہ ہی اپنے آپ کو نفسیاتی ہیجان سے باہر نکالنے کا واحد راستہ ہے۔ سچ کا شعور انسان کے خمیر میں موجود ہے۔ لہذا سچ کی تلاش بہت آسان ہے۔ اور نقصان سے بچنے کی واحد شرط یہ ہے کہ سادہ زندگی اور اعلیٰ سوچ اختیار کی جائے۔

اگر آپ اپنے آپ کو گمراہ ہونے سے بچانا چاہتے ہو۔ تو اپنے غور و فکر کرنے کی صلاحیت کو تیز کریں۔ سوچیں، سوچیں اور سوچیں! پھر آپ یقیناً سچ کے دروازے پر دستک دیں گے۔



مسائل: پوشیدہ نعمتیں

اگر وہ اُن مسائل کو عقل دانش کی روشنی میں حل کرے گا جو کہ اُس کے سامنے چیلنج بن کر کھڑے ہو گئے ہیں، تو وہ یقینی طور پر استدلال (Reason) کی صلاحیت استعمال کرتے ہوئے اس قابل ہوگا کہ مسائل کی گتھی آسانی سے سلجھا سکے۔

برٹش ایم پی انوک پاؤل نے ایک دفعہ کہا تھا کہ: ”سیاست دانوں کا ذرائع ابلاغ کی شکایت کرنا ایسا ہی ہے، جیسے بحری جہاز کا کپتان سمندر کی شکایت کرے۔“ برٹش ایم پی کا یہ تبصرہ بالکل درست ہے۔ اس کا اطلاق نہ صرف سیاست دانوں پر ہوتا ہے بلکہ تمام انسانوں پر بھی ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی ایک چیلنج ہے اور ہر کسی کو چاہے اُس کا کوئی بھی دائرے عمل ہو مسائل و پریشانیوں کا سامنا ضرور کرنا پڑتا ہے۔ اس میں کسی بھی انسان کو استثناء حاصل نہیں ہے۔ مثلاً اگر بحری جہاز کا کپتان سمندر کی لہروں کو دیکھ کر پریشان ہو جائے، تو وہ مایوسیوں کا شکار ہو جائے گا۔ لیکن جب وہ سمندر کی لہروں کو بطور ایک چیلنج قبول کرتا ہے۔ تو وہ خراب صورت حال میں بھی اُمید کی کرن دیکھتا ہے۔

قانون فطرت کے مطابق یہ بات ہر انسان کے لیے سچ ہے کہ وہ چاہے گھر کے اندر ہو یا باہر مسائل و پریشانیاں ضرور اُس کے راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہوتی ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ وہ ان سے رکاوٹوں سے نہ گھبرائے۔ اگر وہ ان رکاوٹوں سے پریشان ہو جائے گا تو اُمیدوں کے چراغ گل ہو جائیں گے اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن اگر وہ اُن مسائل کو عقل دانش کی روشنی میں حل کرے گا جو کہ اُس کے سامنے چیلنج بن کر کھڑے ہو گئے ہیں، تو وہ یقینی طور پر استدلال (Reason) کی صلاحیت استعمال کرتے ہوئے اس قابل ہوگا کہ مسائل کی گتھی کو آسانی سے سلجھا سکے۔

زندگی میں مسائل کا موجود ہونا کوئی خامی نہیں ہے۔ بلکہ یہ مسائل ہمارے لیے پوشیدہ

رحمتیں ہیں۔ کیونکہ یہ بھی وہ رکاوٹیں ہیں جو ہمارے ذہن کو متحرک کرتی ہیں۔ اصل میں مسائل کا کھڑے ہونا ذہن لڑانے (Brainstroming) کا باعث بنتا ہے۔ مسائل کے نتیجے میں تخلیقی سوچ ظہور پذیر ہوتی ہے جو کہ انسانیت کے لیے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اور اگر آپ مسائل و پریشانیوں کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہرائیں گے تو آپ منفی سوچ میں جنیں گے۔ اس کے برعکس اگر آپ مسائل کو قانون فطرت کا لازمی جز سمجھیں گے، تو آپ معاملات کو بڑے ٹھنڈے اور پرسکون انداز میں حل کر دیں گے۔

مسائل پر مبنی سوچ منفی ذہنیت کی راہ ہموار کرتی ہے۔ چیلنج پر مبنی سوچ مثبت نکتہ نظر کو فروغ دیتی ہے۔ جو کہ سونے چاندی اور ہیرے موتیوں سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔



اپنے ذہن کو تخلیقی بنائیں

زندگی میں کوئی بھی ناکامی حرف آخر نہیں ہوتی ہے۔ بس ناکامی سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنا پہلا انتخاب حاصل کرنے میں محروم ہو گیا۔ ورنہ ابھی دوسرا انتخاب باقی ہے۔ مشہور و معروف برٹش فلسفی برٹریڈ رسل (1872-1970) نے اپنی سوانح عمری میں اپنے بارے میں لکھا ہے:

”جب میں اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہوں، تو ناممکن نظریات کے حصول میں وقف شدہ زندگی مجھے غیر مفید لگتی ہے۔ میری سرگرمیاں میری عادات کے زور پر چلتی رہتی ہیں۔ دوسروں کی رفاقت میں، مجھے اُس افسردگی کا احساس نہیں ہوتا، جو کہ میرے روزمرہ کے معمولات میں چھپی ہے۔ تاہم جب میں تنہا اور فارغ ہوتا ہوں تو میں اس بات کو اپنے آپ سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتا کہ میری زندگی مقصدیت سے خالی ہے۔ مزید نہ ہی میں کسی ایسے نئے مقصد حیات کو جانتا ہوں جس کے لیے اپنی زندگی کے بقیہ سال نچھاؤں کر دوں۔“

برٹریڈ رسل نے اپنی زندگی کا آغاز نادِر رُوزگار شخصیت کے روپ میں کیا تھا۔ لیکن ستانوے سالے کی عمر میں، وہ ایک مایوس شخص کے روپ میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوا،

اس المیہ کی پشت پر کیا وجوہات تھیں؟ اس کا جواب مذکورہ بالا اُس کی سوانح عمری کے اقتباس میں ہے۔ اصل میں برٹریڈ رسل کا ساری دنیا میں امن قائم کرنے کے لیے ایک عالمی گورنمنٹ تشکیل دینے کا خواب تھا۔ اُس کے مطابق واحد چیز جو انسان کو نجات دلا سکتی ہے وہ باہمی تعاون ہے جو کہ صرف ایک عالمی حکومت بنا کر حاصل کی جاسکتا ہے۔ اگرچہ اُنھوں نے اپنی ساری زندگی اپنے مشن کے لیے وقف کر دی لیکن پھر بھی ناکام ہو گئے۔

زندگی میں کوئی بھی ناکامی حرفِ آخر نہیں ہوتی ہے۔ بس ناکامی سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنا پہلا انتخاب حاصل کرنے میں محروم ہو گیا۔ ورنہ ابھی دوسرا انتخاب باقی ہے۔ برٹریڈ رسل دوسرے راستہ کو دریافت کرنے میں ناکام ہو گیا۔ رسل کی یہی محرومی اصل ناکامی تھی۔

رسل کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ مطالعے کا بہت حریص تھا۔ تاہم جیسے کہ اُس نے خود قبول کیا ہے کہ مطالعہ اُس کی عادت بن چکا تھا۔ عادت ایک متواتر غیر شعوری رویہ ہے جو کہ کسی چیز کو تسلسل کے ساتھ کرنے سے مزاج کا حصہ بن جاتا ہے۔ یہ رسل کی شخصی کمزوری تھی۔ کہ اُس نے وسیع مطالعہ تو کیا، لیکن اُس نے یہ سارا عمل، بجائے کسی شعوری منصوبہ بندی کے، ایک عادت کے تحت کیا، اگر آپ کوئی کام شعوری منصوبہ بندی کے مطابق کرتے ہیں تو یہ آپ کے ذہن کو تخلیقی بنا دے گی۔ لیکن اگر آپ نے کوئی کام بطور ایک عادت کیا۔ تو آپ کا طرز عمل آپ کی تخلیقی سوچ کی نشوونما نہیں کرے گا۔ کوئی کام بطور ایک عادت کے کرنا ایسے ہی جیسے جانور اپنے کام اپنی جبلت کے تحت کرتے ہیں۔ جانوروں کے لیے جو جبلت ہے انسانوں کے لیے وہ عادت ہے۔

کسی شعوری پلاننگ کے تحت جو کام کیا جاتا ہے وہ انسان کے ذہنی ارتقا اور تخلیقی سوچ کا باعث بنتا ہے۔ اور جو شخص منصوبہ بندی کرتا ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنا محاسبہ خود کرے۔ اور از سر نو اپنے منصوبوں کا جائزہ لے کر یوٹرن لے۔ پھر وہ اپنے لیے نئے راستے کا انتخاب کر سکتا ہے۔ تخلیقی ذہن ایک زندہ ذہن ہوتا ہے جو اس قابل ہوتا ہے کہ ہر لمحے نئے فیصلے کرے۔ جو نظر یہ رسل نے پیش کیا وہ قابل حصول نہ تھا۔ اگر رسل تخلیقی ذہن کا مالک ہوتا، وہ از سر نو اپنے ہدف کا جائزہ لیتا، اور اُسے حاصل کرنے کے لیے نیا راستہ اختیار کرتا۔ یہ طریقہ اُس

کی زندگی کو ایک دفعہ پھر بامعنی بنا دیتا۔

تجربات بتاتے ہیں کہ عام طور پر لوگ تخلیقی ذہن کے مالک نہیں ہوتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر لوگ اپنی سرگرمیوں کی شعوری پلاننگ نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ وہ بندھی بندھائی عادت کے ساتھ جیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر وہ کوئی کام شعوری پلاننگ کے تحت بھی کریں، تو دھیرے دھیرے، اُن کی شعوری پلاننگ بھی داخل عادات ہو کر غیر شعوری پر کام شروع کر دیتی ہے۔ اس طرح کے لوگ زندگی میں نئے فیصلہ نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی عادات کے اسیر ہو کر زندگی گزارتے ہیں۔ جب کہ اُن کے لیے سب سے صحیح چیز ایک بیدار ذہن ہے۔

اپنی شعوری پلاننگ کے نتیجے میں انسان کو ہر چیز کرنی چاہیے۔ اس طرح انسان مایوسی کا شکار نہ ہوگا۔ کیونکہ اگر اس کا ہدف قابل حصول ہے تو وہ کامیابی سے ضرور ہمکنار ہوگا۔ لیکن اگر اُس کا ہدف ناقابل حصول ہے۔ تو اس کا تخلیقی ذہن نئے فیصلہ اور نئی ترجیحات متعین کرے گا۔ عادت ایک عام اصطلاح ہے جو کو تمام انسانی سرگرمیوں کا احاطہ کرتی ہے جس میں شراب پینے کی عادت سے لے کر سیاست کا حصہ بننے تک سب آجاتے ہیں۔ مایوسی صرف اُن لوگوں کے لیے ہے جو چیزوں کو بطور ایک عادت کرتے ہیں۔ جو اپنی سرگرمیوں کو شعوری پلاننگ کے تحت کرتے ہیں وہ کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہو سکتے۔

☆☆

پیشہ وارانہ دنیا میں رہنا

آپ کی سب سے پہلی ترجیح اپنے ذہنی ارتقا کو فروغ دینا ہے پھر زندگی کے تمام پہلوں کو منظم کرنے کی کوشش کریں

ہم ایک پیشہ ور دنیا میں رہتے ہیں۔ آج کی دنیا میں کسی کا پیشہ ہی اُس کی پہچان ہے۔ عام طور پر ہر انسان کی پیشہ وارانہ زندگی کو اُس کے طرز حیات (life style) کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔

پروفیشن کا مطلب ہے جیسے بازار زر (Money Market) حکم دیتا ہے ویسے

رہنا۔ اس لیے ہر کوئی کوشش کرتا ہے کہ پیشہ وارانہ ٹیکنیک میں مہارت حاصل کرے تاکہ بازار میں جو دولت کا بہاؤ ہے، اُس میں وہ ایک شراکتی حصہ دار کے رہنے کا اہل ہو۔

یہ کلچر نئے رجحان کا نتیجہ ہے جو ماضی میں نا پید (Absent) تھا، جیسے خارجی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر، اور باطنی ضروریات سے صرف نظر کر کے زندگی گزارنا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہر کوئی اپنی شخصیت کو اپنے پیشے کے لحاظ ترقی دیتا ہے۔ جب کہ اپنی فطرت کے حوالے سے سب کی شخصیت ترقی پذیری ہے

آپ کسی سے بھی اُس کے پیشے کے بارے میں پوچھ لیں۔ وہ فوراً بنا بنا یا مخصوص سا جواب دے گا۔ آپ اُس کے پیشہ وارانہ مضمون پر بات کریں تو وہ بڑی تفصیلات فراہم کرے گا۔ لیکن اگر آپ اُس سے زندگی سے متعلقہ، یعنی غیر پیشہ وارانہ، معاملات کے بارے میں کچھ پوچھیں۔ تو پھر آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ شخص اُن موضوعات پر بات کرنے کے لیے ذہنی طور پر بالکل تیار نہیں ہے۔

ایک دفعہ یورپ کے ایک شہر میں، میری ملاقات ایک پڑھی لکھی خاتون سے ہوئی۔ جب میں نے اُن کے پیشے کے بارے میں پوچھا۔ میں نے محسوس کیا کہ انھوں نے اچھی خاصی معلومات فراہم کر دیں۔ مجھے اُن سے اُن کے پیشہ کے بارے میں بیش بہا معلومات ملیں۔ لیکن اُن کے تعلقات اپنے شوہر سے کشیدہ تھے اور انھوں نے اپنے شوہر سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے اِس گھریلو تنازع کی وجہ پوچھی، تو انھوں نے پُر اعتماد طریقہ سے بتایا کہ اُن کے شوہر ایک ضدی شخص ہیں۔ اور وہ ضدی افراد کو پسند نہیں کرتیں ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کے شوہر ایک انتہائی پر مشقت ملازمت کرتے ہیں اِس کے لیے اُن کے مزاج کو غیر چلک پذیر ہونا چاہیے۔ لیکن خاتون کو قائل کرنے کی میری تمام کاوشیں رائیگاں گئیں۔ وجہ اِس کی یہ تھی کہ وہ اپنے پروفیشن کی سائنس جانتی تھیں۔ لیکن زندگی کی سائنس سے بالکل ناواقف تھیں۔

یہ ہر مرد و عورت کے لیے سچ ہے۔ ہر شخص دُورے کلچر میں رہتا ہے۔ جب وہ اپنے پیشہ سے متعلق ہوتا ہے تو اچھا خاصا علم رکھتا ہے۔ لیکن جہاں تک زندگی کی سائنس کا تعلق ہے۔ وہاں ہر کوئی خالی الذہن ہو جاتا ہے۔ اور یہ مسئلہ اتنا عام ہے کہ اِس میں کسی بھی شخص کے لیے

استثناء تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔

یہ توازن کا سوال نہیں، بلکہ ترجیحات کا مسئلہ ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ ہر ایک شخص کو مطلوبہ دونوں ضروریات میں توازن رکھنا چاہیے۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ہر ایک آدمی کو اپنی ترجیحات کا تعین درست طور پر کرنا چاہیے یا اپنی ترجیحات از سر نو طے کرنی چاہیے۔ مسئلہ یہ ہے کہ جب آپ از سر نو ترجیحات کا تعین کرتے ہیں۔ تو آپ کو خدشہ لگا رہتا ہے کہ اس کی زد آپ کے مالی مفادات پر نہ پڑے۔ لیکن جب آپ کا ذہن دانشورانہ سرگرمی میں مشغول ہوگا۔ تو ذہن دولت سے متعلقہ معاملات پر توجہ نہیں دے گا۔ آپ ایک وقت ایک چیز حاصل کرتے ہیں تو اسی اثناء میں آپ دوسری چیز کھودیتے ہیں۔ لیکن یہ بہانہ کوئی اساس نہیں رکھتا ہے۔ آپ کو دولت کے حوالے سے سوچنے کے بجائے ذہنی ارتقا کے حوالے سے سوچنا چاہیے۔ ذہنی ترقی اتنی ضروری ہے کہ اسے نظر انداز کرنے والا کوئی بھی بہانہ قابل قبول نہیں ہے۔ سادہ فارمولا اختیار کیجیے: اور ذہنی ترقی کو پہلی ترجیح قرار دیں اور پھر زندگی کے تمام معاملات کو منظم کرنے کی کوشش کریں۔

ذہنی ترقی کا نہ ہونا کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ ذہنی ترقی کا فقدان ہے کہ آج ہم سب ٹینشن، غیر ضروری امراض، ذہنی عدم سکون، کے مسائل سے دوچار ہیں اور سب سے بڑا یہ کہ اس ذہنی زوال کی وجہ سے انسان نے مسرت و اطمینان کو کھودیا جس کا وہ شدت سے خواہش مند ہے۔



بڑی کامیابی کے راز

اپنی فطرت بچائیں، اپنا وقت بچائیں

جب آپ فطرت کے مسلمہ راستوں پر چلیں گے، تو آپ کے پہیہ کے دندانے (Cages) فطرت کے پہیہ کے دندانوں سے مل جائیں گے، اس طرح آپ فطرت کے ساتھ قدم بقدم آسانی سے چلیں گے۔

موکاش امبانی کے بیٹے آکاش امبانی، ۲۴، کا پہلا انٹرویو ۲۰۱۴ جولائی ۲۰۱۴ کو ٹائمز آف انڈیا کے میگزین 'ہیلو' میں شائع ہوا۔ اپنے انٹرویو کے دوران آکاش امبانی نے اپنے خاندان کی کچھ صحت مند روایات بتائیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے بتایا کہ اسکول کے دنوں میں ان کے دوستوں کے مقابلہ میں ان کی والدہ انھیں معمولی سا جیب خرچ دیا کرتی تھیں۔ اور دوسری وہ نصیحت بتائی جو انھیں ان کے دادا دھیرو بھائی امبانی نے کی: ”گمشدہ دولت دوبارہ کمائی جاسکتی ہے لیکن گیا وقت کبھی ہاتھ نہیں آتا۔ اس لیے اپنے وقت کو دانائی سے استعمال کرو۔“ کامیاب زندگی کے لیے یہ دو بہت اہم عناصر ہیں۔

معمولی جیب خرچ کا مطلب ہے کہ سادہ زندگی۔ یہ ایک نگران کی طرح کام کرتا، آپ کو گمراہ ہونے سے روکتا اور ناپسندیدہ سرگرمیوں میں حصہ لینے سے مانع ہوتا ہے۔ مزید یہ بری عادات اپنانے اور بری حرکتوں کرنے میں ایک مستقل رکاوٹ ہے۔ یہ آپ کو وہ طرز زندگی اپنانے سے منع کرتا ہے جس میں آپ صرف اپنا مفاد دیکھتے ہیں۔ یاد رکھیں پر تعیش زندگی کا اختتام غیر صحت مند کردار پر ہوتا ہے۔

اس طرح کم جیب خرچ انسان کی فطرت کی نگہبانی کرتا ہے۔ یہ انسان کی فطرتی صلاحیتوں کو تباہ ہونے سے بچاتا ہے۔ یہ آدمی کو تصنع اور بناوٹ کے روپ میں ڈھالنے کے بجائے فطرت کے مطابق ڈھالتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اپنی فطرت کے ساتھ

مخلص ہونا تمام اچھائیوں کا ذریعہ ہے۔ اور اپنی فطرت کے اُلٹ سفر کرنا تمام برائیوں کا ماخذ ہے۔ کم جیب خرچ آپ کو غیر فطری انداز اختیار کرنے سے روکتا ہے کیونکہ آپ جیب میں معمولی رقم ہونے کی صورت میں غیر فطری انداز کی قیمت ادا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اپنی فطرت سے جڑ کر رہنے سے اچھا کردار وجود میں آتا ہے۔ اور فطرت سے ٹوٹ کر رہنے سے بُرا کردار ظاہر ہوتا ہے۔

خالق کائنات نے خود بتایا ہے کہ فطرت انسان کے لیے صحیح راستہ ہے فطرت کی پیروی میں کامیاب زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ اس کی قربت ترقی کی راہ ہموار کرتی ہے۔ تاہم جس آدمی نے اپنی فطرت سے دوری اختیار کر لی ہو، وہ اپنی شخصیت کی تعمیر درست زاویوں پر نہیں کر سکتا۔ دوسرا اہم اصول یہ ہے کہ: ”گمشدہ دولت دوبارہ کمائی جاسکتی ہے لیکن گیا وقت کبھی ہاتھ نہیں آتا۔ اس لیے اپنے وقت کو دانائی سے استعمال کرو۔“ انسان کے پاس اپنی فطرت کے بعد جو سب سے قیمتی اثاثہ ہے وہ وقت ہے۔ وہ انسان کامیابی حاصل کرتا ہے جو اپنے وقت کا صحیح استعمال کرتا ہے۔ جو اسے ضائع کر دیتا ہے وہ ناکام ہو جاتا ہے۔

لیکن اس طرز زندگی کو اپنانا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے سمجھدار استاد کی ضرورت ہوتی ہے جو انسان کی راہنمائی کے فرائض با احسن خوبی انجام دے۔ خوش قسمتی سے آکاش امبانی کو اپنی والدہ کی شکل میں ایک استاد مل گیا تھا۔ اُن کی والدہ دوسری خواتین کے لیے ایک مثال تھیں۔

ہر کوئی دوز بردست خوبیوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ داخلی طور پر اُسے خدا کی ودیعت کردہ فطرت ملتی ہے۔ خارجی طور پر وقت کی انمول دولت میسر آتی ہے۔ جو انسان خدا کے ان دو تحائف کی قدر کرتا ہے، اُس کی خوش بختی یقینی ہے۔

جب آپ فطرت کے مسلمہ راستوں پر چلیں گے، تو آپ کے پہیہ کے دندانے (Cogs) فطرت کے پہیہ کے دندانوں سے مل جائیں گے، اس طرح آپ فطرت کے ساتھ قدم بقدم آسانی سے چلیں گے۔ اگر آپ فطرت کے راستے سے انحراف کریں گے۔ تو اپنے پہیہ کے دندانے (Cogs) فطرت کے پہیہ کے دندانوں سے ملانے میں ناکام ہو جائیں گے۔ اس

طرح آپ بے یار و مددگار شخص بن جائیں گے۔ نتیجتاً کامیاب نہیں ہوں ہے۔ ایک کامیاب منصوبہ بندی کے لیے وقت انتہائی قیمتی اثاثہ ہے۔ اگر آپ وقت کو درست استعمال کرنے میں ناکام ہو گئے۔ تو آپ کامیابی کی واحد اساس سے محروم ہو جائیں گے۔

کامیابی درست پلاننگ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اور درست پلاننگ کے دو بنیادی عناصر ہیں داخلی طور پر فطرت جس کے ساتھ آپ پیدا ہوئے ہیں۔ اور خارجی طور پر وقت، جس سے آپ اپنی تمام سرگرمیوں کو منظم کرتے ہیں۔ اگر آپ نے دونوں میں سے کسی میں بھی کمی کی۔ تو اس کا خمیازہ آپ کو تباہی و بربادی کی صورت میں بھگتنا ہوگا۔۔

کامیابی منصوبہ بندی سے آتی ہے اور منصوبہ بندی قدرتی دانائی اور وقت کا حکیمانہ استعمال ہے۔



ہر ایک کے لیے اچھی خبر

جب تک آپ اپنی مثبت ذہنیت کو برقرار رکھتے ہیں کوئی ناکامی آپ کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی۔ اہمیت آپ کی مثبت سوچ کی ہے نہ کہ منفی تجربات کی۔

جیمس میت نوسر وان جی ٹاٹا (1839-1904) بھارت کے مقامی صنعت کار اور انڈیا کے ایک بہت بڑے اور معروف ٹاٹا گروپ کے بانی کے حوالے سے مشہور شخصیت ہیں۔ اُن کی سوانح عمری میں ہمارے لیے ایک اہم سبق پوشیدہ ہے۔ ایک دفعہ انھوں نے واٹسن ہوٹل بمبئی میں ایک کمرہ بک کروانا چاہا۔ اُس وقت واٹسن انتظامیہ انڈین کوکالے (Non-white) ہونے کی وجہ سے ہوٹل میں رہنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ صرف گورے ہوٹل میں رہنے کے مجاز تھے۔ اس لیے جیمس میت ٹاٹا کو ہوٹل میں رہنے کی اجازت نہ ملی۔ ظاہر ہے یہ اُن کے لیے ایک بڑا افسوس ناک واقعہ تھا۔ لیکن انھوں نے اس واقعہ کو منفی ذہنیت سے نہ لیا۔ بلکہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ واٹسن ہوٹل سے زیادہ شاندار ہوٹل بھارت میں کھولیں گے۔ اس کے لیے انھوں نے ایک بے مثال اسکیم تیار کی۔ وہ اس سلسلہ میں لندن، پیرس، برلن، اور ڈوسلدورف کے بڑے ہوٹلوں

میں گئے۔ تاکہ وہ ہوٹلنگ کے جدید رجحان سے واقف ہوں، مزید اُنھوں نے وہاں سے آرٹ کے نمونے، بہترین فرنیچر، اور اپنے ہوٹل کی اندورنی تزئین و آرائش کا سامان لیا۔ واٹسن انتظامیہ نے جیسیمیت ٹاٹا کو ہوٹل میں داخلے سے روک دیا تھا۔ لیکن جیسیمیت ٹاٹا کی ذہنی بصیرت نے اُن کے لیے پوری دنیا کو کھول دیا تھا۔

آخر کار اُن کی محنت رنگ لائی اور اُنھوں نے 16 دسمبر 1903 کو تاج محل اینڈ ٹاور کے نام سے انتہائی پر تعیش ہوٹل کھولا۔ یہ پہلی تاج پراپرٹی اور پہلا تاج ہوٹل تھا۔ ہوٹل کی عمارت بحیرہ عرب کے ساحل پر واقع تھی

یہ ایک تاریخ مثال ہے جو ہمیں زندگی کا اہم راز بتاتی ہے۔ کہ اگر آپ کا کسی منفی عمل سے سابقہ پڑتا ہے، تو ہرگز منفی ذہنیت اختیار نہ کریں، کسی بھی قیمت پر جوابی رد عمل نہ اپنائیں اور کسی کے خلاف شکایت کناں نہ ہوں۔ بلکہ اپنے پلان کو مثبت خطوط پر دوبارہ تشکیل دیں۔ شکایت یا احتجاج کے بجائے اپنی تمام توانائیاں تعمیری سرگرمیوں میں صرف کریں۔ آپ حیران کن نتائج پائیں گے۔ اور قوی امکان ہے کہ ماضی میں جو نقصان ہوا ہے اُس سے زیادہ آپ کو فائدہ حاصل ہو جائے۔

جیسیمیت ٹاٹا کی کہانی کوئی خوش قسمتی کا قصہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک مثبت سوچ کا واقعہ ہے۔ یہ بخت آوری خود بخود واقع نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ یہ اُن کی اپنی تخلیقی منصوبہ بندی کا ثمر تھا اس لیے ٹاٹا کی کامرانی کوئی ذاتی واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک مثال ہے کہ انسان کا دماغ بحرانی کیفیت میں کیسے اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو سامنے لاسکتا ہے۔

یہ قانون فطرت ہے کہ یہاں ناکامی سے زیادہ کامیابی کے مواقع موجود ہیں۔ جب تک آپ اپنی مثبت ذہنیت کو برقرار رکھتے ہیں کوئی ناکامی آپ کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی۔ اہمیت آپ کی مثبت سوچ کی ہے نہ کہ منفی تجربات کی۔ اگر آپ کا پہلا پلان ناکام ہو گیا ہے تو اس میں بھی آپ کے لیے اچھی خبر پوشیدہ ہے۔ کیونکہ قانون فطرت کے مطابق آپ کی ناکامی آپ کے ذہن کو متحرک کرے گی۔ یہ نئے دروازہ کھولے گی جو اب تک بند تھا۔ آپ کی ناکامی آپ کو وہ گُر سکھائے گی کہ آپ بہتر انداز میں کام کرنے لگیں گے۔ اور عظیم کامیابی حاصل کریں گے۔ اس

طرح ناکامی ایک پوشیدہ رحمت ہے۔

تاریخ ہمیں بہت سے ایسے افراد کے بارے میں بتاتی ہے جو ناکامی کے بعد ایک ہیرو بن کر نمودار ہوئے۔ ناکامی نے اُن افراد کو اس قابل کیا کہ وہ از سر نو اپنے پلان کو تشکیل دیں۔ پھر کامیابی کی نئی بلندیوں کو چھوئیں۔ تقریباً تمام بڑی کامیابی حاصل کرنے والے، شروع میں بڑا نقصان اٹھانے والے تھے۔ بڑی کامیابی کا سفر بڑی ناکامی سے شروع ہوتا ہے۔ اپنے آخری مرحلہ میں کامیابی ایک خارجی واقعہ ہے۔ لیکن اپنے ابتدائی مرحلے میں یہ اندرونی فیصلہ کا نتیجہ ہے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ کو کوئی بھی شخص کامیابی کے آسمان کو چھو نہیں سکتا، جب تک وہ ناکامی کا مزانہ چھکے۔ اگر آپ اپنی مثبت ذہنیت قائم رکھتے ہیں تو ناکامی آپ کو بصیرت (Vision)، منصوبہ بندی کے لیے نئے خیالات (Ideas)، اور اپنے سفر پر گامزن رہنے کے لیے نئے راستے دے گی۔ تمام انسانی تاریخ کا یہ ہی سبق ہے۔

اعلیٰ کامیابی ہر ایک کا خواب ہے۔ لیکن اعلیٰ کامیابی اچانک ایک روز آپ کے دروازے پر دستک نہیں دیتی ہے۔ بلکہ یہ سخت محنت، جُہد مسلسل، بہترین منصوبہ بندی، ساتھ ساتھ ایک نقطہ پر تمام صلاحیتوں کو مرکوز کرنے، اور سب سے زیادہ غیر متزلزل مثبت پلاننگ کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ کامیابی ہمیشہ اُن کے پاس چل کر آتی ہے جو کامیابی کو خلوص دل سے تلاش کرنے والے ہوتے ہیں۔ اپنے آپ کو کامیابی کے سچے متلاشی بنائیں۔ آپ یقیناً اپنی منزل مقصود کو پالیں گے۔



مشکلات کا کردار

دوسروں کی شکایت نہ کریں۔ اپنے دماغ کو استعمال کرنے کی کوشش کریں۔ یقیناً اس طرز عمل سے آپ زندگی میں جو حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ کر لیں گے۔

اسکاوٹس مصلح سیمول سہائل نے، اپنی کتاب سیلف ہیپ (Self Help)

(اشاعت 1859) میں بالکل درست لکھا ہے۔ ”آسانی نہیں مشقت، سہولت نہیں مشکل انسان بناتی ہے۔“ اُس کا یہ بیان ایک فطرتی حقیقت ہے۔ جس پر تاریخ مہر تصدیق ثبت کرتی ہے۔ قطع نظر اس بات کہ عظیم افراد زندگی کے کس شعبے سے تھے، یہ بات مسلمہ ہے وہ مشکلات کا حاصل تھے نہ کہ سہولتوں کا۔ انہوں نے چیلنجز کا مقابلہ کیا نہ کہ گوشہ عافیت میں پناہ لی۔ نتیجتاً وہ عظیم کامیابی حاصل کرنے والے بن گئے۔

لیکن سوال یہ ہے شخصیت سازی میں مشقت سہولت کے مقابلے میں بڑا کردار کیوں ادا کرتی ہے۔ وہ اس لیے ادا کرتی ہے کہ اس کے اسباب قوانین فطرت میں موجود ہیں۔ یہ ہی قوانین ایسے نتائج کا ذمہ دار ہوتے ہیں یہ حقیقت ہے کہ ہمارے تمام چھوٹے بڑے اعمال کا تعلق براہ راست ہمارے دماغ سے ہوتا ہے۔ یہ دماغ ہی ہوتا ہے جو ہماری شخصیت کی تمام سرگرمیوں کو ہدایات دیتا ہے۔ انسانی دماغ کائنات کی تمام چیزوں سے بڑا ہے: یہ چونکا دینے والی صلاحیت رکھتا ہے۔ کیونکہ دماغ ہماری تمام سرگرمیوں کا منتظم ہے۔ اس لیے یہ ہماری شخصیت کا حکمران ہے۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ ہماری ساری کارکردگی کا انحصار مکمل طور پر ہمارے دماغ پر ہے۔ دماغ کے پاس لامحدود توانائی کے ذخائر ہیں۔ جب ہم کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ تو دماغ فوراً کام کرنے کے لیے توانائی فراہم کرتا ہے۔ اور ہم اس توانائی کی مدد سے کام کو انجام دے دیتے ہیں۔ دماغ اس توانائی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ہم جو کچھ بھی کرنا چاہیں وہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب دماغ ہمیں توانائی فراہم کرے۔ اگر ہم آسان کام کرنے کا انتخاب کرتے ہیں تو دماغ اتنی کم توانائی فراہم کرے گا۔ اور اگر ہم کچھ مشکل اور عظیم کام کرنے کی ٹھان لیتے ہیں، تو دماغ اتنی زیادہ توانائی فراہم کرے گا۔

شخصیت کی تعمیر کا انحصار انسان کی اپنی جدوجہد پر ہے۔ اگر کوئی سست اور آرام طلب ہے تو ظاہر ہے وہ دماغ سے کم توانائی پائے گا۔ نتیجتاً اُس کی شخصیت میں بہت سے رخنے اور کمزوریاں رہ جائیں گی۔ اگر کوئی شخص پر عزم اور کسی بڑے کام کے کرنے کا بیڑا اٹھاتا ہے تو اُس کا دماغ پھر بڑی مقدار میں انرجی مہیا کرے گا۔ نتیجتاً وہ مضبوط شخصیت کا حامل ہوگا۔

ہر شخص صحت مند دماغ کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن کچھ لوگ اس کی توانائی کو استعمال نہیں کر پاتے، اور اس جہان فانی سے بغیر اپنی شخصیت کو ترقی دیئے رخصت ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ عظیم اہداف مقرر کرتے ہیں۔ تو اُن کا دماغ انہیں بڑے کام کرنے کے لیے بڑی توانائی فراہم کرتا ہے۔ اس طرح وہ عظیم کام کرنے والے بن جاتے ہیں۔

”انسان خود اپنی قسمت کا مالک ہے“۔ یہ قول بالکل سچا ہے۔ اور اس میں کوئی پر اسراریت نہیں ہے۔ کیونکہ اس بات کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ ایک آدمی نے کس قدر اپنی دماغی صلاحیتوں کو اجاگر کیا ہے اور دماغ نے اُسے کتنی توانائی مہیا کی ہے۔ کسی شخص کا زندگی میں چھوٹی یا بڑی کامیابی حاصل کرنا اس بات پر منحصر ہے کہ اُس کے دماغ نے کتنی انرجی فراہم کی۔ یہاں ہر آدمی خود تعمیر کردہ (Self made) ہے۔ اور کامیابی کا حجم اُس کی اپنی پلاننگ پر منحصر ہے۔ حکمت و دانائی پر مبنی منصوبہ بندی انسان کو فوق البشر (Super man) بنا دیتی ہے۔ جب کہ حماقتوں پر مبنی چالیں انسان کو زندگی کی دوڑ سے باہر کر دیتی ہیں۔

انسان کا دماغ ایک بڑے آبی ذخیرے کی مانند ہے۔ اس ذخیرے کا دروازہ کھولنے کا انحصار آپ کے ہدف پر ہے۔ اگر کسی کا معمولی ٹارگٹ ہے تو دماغ توانائی کا معمولی سا دروازہ کھولے گا۔ اگر کسی کا بہت اعلیٰ مقصد ہے تو دماغ اعلیٰ پیمانے پر توانائی کا دروازہ کھولے گا۔ یہی فرق کسی کی کامیابی کے معیار کا فیصلہ کرتا ہے۔

دوسروں کی شکایت نہ کریں۔ اپنے دماغ کو استعمال کرنے کی کوشش کریں۔ یقیناً آپ اس طرح جو مقاصد زندگی میں حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ کر لیں گے۔



بڑی کامیابی حاصل کرنے والا کیسے بنیں۔

ہر انسان چند بے نظیر خوبیوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور ان ہی خوبیوں کی دریافت اور پھر بہترین منصوبہ بندی کے ذریعہ ان کے استعمال پر کامیابی کا انحصار ہوتا ہے۔ میرا ایک واقف مسلمان نوجوان دیہات میں پیدا ہوا، مدرسہ میں پڑھا۔ وہ دو غیر ملکی

زبانیں، عربی اور انگریزی، بڑی روانی سے بول سکتا ہے، جب کہ وہ کسی یونیورسٹی کا سند یافتہ بھی نہیں ہے۔ میں نے ایک دفعہ اُس سے پوچھا کہ اپنی اس غیر معمولی کامیابی کا راز مجھے بتائے۔ اُس نے کہا میری کامیابی کا راز صرف ایک لفظ ”جنون“ میں پوشیدہ ہے۔ اُن کے کہنے کا مطلب تھا، کہ اگر آپ اپنا ہدف حاصل کرنے کے لیے مستقل پُر عزم رہتے ہیں۔ تو آپ لازماً اپنا ہدف حاصل کر لیں گے۔

یہ نوجوان ایک عام آدمی تھا۔ لیکن یہ فارمولا اُن لوگوں کے لیے بھی سچ ہے جو اعلیٰ دماغ کے حامل جانے جاتے ہیں۔ البرٹ آئین اسٹائن کا معاملہ بھی کچھ اسی طرح کا تھا۔ اگرچہ اُن کی زندگی کا آغاز بہت معمولی تھا۔ لیکن انھوں نے ایسی شاندار دریافتیں کیں، جن سے سائنس کی تاریخ بدل گئی۔

1879 میں البرٹ آئین اسٹائن ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کی ابتدا مفلسی اور مصائب کے ساتھ کی۔ لیکن قدرت نے اُنھیں اعلیٰ دانائی سے نوازا تھا وہ شروع سے ہی بہت اولو العزم (Ambitious) تھا۔ یعنی وہ ایسے عزم کے حامل تھے جو اپنے ہدف کا آخری حد تک تعاقب کرتا ہے۔ یہ عزم اُن کا سب سے عظیم اثاثہ تھا جس کی وجہ سے وہ آخر کار ایک عظیم ترین سائنس دان بن کا سامنے آئے۔

آئین اسٹائن کا معاملہ کوئی ایسا معمہ نہیں ہے جو سمجھ نہ آسکے۔ بلکہ یہ فطرت کا ایسا فارمولا ہے جس کا اطلاق ہر مرد و عورت پر ہو سکتا ہے۔ دنیا میں ہر انسان باکمال اوصاف کے ساتھ جنم لیتا ہے۔ امکانی طور پر ہر انسان چاہے وہ مرد ہو یا عورت سپر مین (Super man) ہے۔ تاہم اس کے لیے انسان کے اندر ایک نہ بچھنے والی پیاس کی مانند ایک ایسی خواہش کی ضرورت ہوتی ہے جو امکانات کو حقیقت میں بدل دے۔

کامیابی کبھی طشت میں رکھ کر نہیں دی جاتی ہے۔ بلکہ یہ تو آپ اپنی جدوجہد اور مشقت سے حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے اگر آپ بڑی کامرانی کے خواہش مند ہیں تو سب سے پہلے اپنی صلاحیتوں کو دریافت کریں۔ دنیا میں ہر انسان چند بے نظیر خوبیوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اور ان ہی خوبیوں کی دریافت اور پھر بہترین منصوبہ بندی کے ذریعہ ان کے استعمال پر

کامیابی کا انحصار ہوتا ہے۔

لیکن یہ بات ہمیشہ یاد رہے کہ آپ مخلوق ہیں خالق نہیں۔ اس لیے آپ کو اپنی حدود اور بیرونی مجبوریوں کا ادراک ہونا چاہیے۔ اور ساتھ ساتھ قوانین فطرت کا علم بھی ہونا چاہیے۔ اپنے وسائل اور خارجی مسائل زندگی کے ان دو عناصر میں سے کسی ایک کا بھی عدم ادراک آپ کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

اولو العزم ضرور بنیں لیکن بن دیکھے چھلانگ نہ لگائیں۔ پر اعتماد ضرور رہیے، لیکن انکساری ہاتھ سے نہ جائے۔ آپ کا ح نظر (Target) بالکل واضح ہو لیکن کبھی دوسرے شخص کے ذہنی سکون یا کامیابی کی قیمت پر اُسے حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ آپ کو ایک اچھا منصوبہ ساز ہونا چاہیے، لیکن کسی بھی قسم کے بد عنوان طرز عمل سے دور رہیں۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا اچھا ہے۔ لیکن دوسروں کے حقوق کچل کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا معیوب ہے۔ مختصراً، منفی تجربات سے دل برداشتہ نہ ہوں: منفی کو مثبت میں بدلنے کی کوشش کریں۔

ہمیشہ یاد رکھیں آپ کی خواہش میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ خارجی دنیا کے معاملات کا تعین کرے۔ بلکہ عظیم کامیابی کی راہ ہموار کرنے کے لیے آپ کی خواہشات اور خارجی حقائق کے درمیان مبنی بر حکمت مطابقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ کوئی آپ کی خواہشوں کو مسترد نہیں کر سکتا، لیکن یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ آپ بھی قوانین فطرت کو مسترد نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہمیشہ حقیقت پسند بنیں۔ کسی بھی قسم کی کامیابی حاصل کرنے کے لیے حقائق کا اعتراف ایک بہت اہم اصول ہے۔

ہر انسان، خاص ہو یا عام، وہ دو حالتوں، یعنی حدود اور فوقیت (Advantage)، میں رہنے پر مجبور ہے۔ لہذا جب آپ اپنی فوقیت (Advantage) سے لطف اندوز ہو رہے ہوں تو اپنی محدودیت کو بھی پیش نظر رکھیے۔ اپنی حدود سے کبھی بھی تجاوز نہ کریں، اور کبھی بھی ایسی چیز کو استعمال نہ کریں جو بلا آخر آپ کی رسائی سے باہر ہو جائے۔ ہمیشہ زندگی کے ان دو پہلوؤں کے درمیان توازن قائم رکھیں اور نتیجہ یقینی طور پر کامیابی ہوگا۔

زندگی کا سفر آرام دے نہیں ہے۔ یہ ہر طرح کے ناپسندیدہ حالات سے بھرا ہوا ہے۔

اس لیے حقیقت سے لڑنے کے بجائے اسے تسلیم کریں۔ اور اس دانائی کو کبھی فراموش نہ کریں، اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا نام بھی اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے والوں کی فہرست میں شامل ہو۔



حوصلہ افزائی طرف داری (Favour) سے بہتر ہے

وہ شخص جو دولت و امارت کے ماحول میں پیدا ہو وہ ذہنی ارتقا کے لحاظ سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ جب کہ وہ شخص جو غربت و ماحول میں پیدا ہو وہ ذہنی ترقی میں آگے نکل جاتا ہے۔

دنیا کے سوا میر ترین آدمیوں کے سروے کرنے سے یہ بات سامنے آئی کہ ان میں 27 وراثتی طور پر امیر ہیں جب کہ 73 اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر امیر ترین لوگوں کی فہرست میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان 73 امیر لوگوں میں 18 افراد کسی کالج کے سند یافتہ نہیں ہیں۔ 36 غریب والدین کی اولاد ہیں۔ جب کہ کچھ عرب پتی افراد کے پاس نہ کوئی تعلیمی ڈگری ہے نہ ہی انھیں امیر والدین کا ترکہ میسر آیا ہے (انڈین ٹائمز 11 اگست، 2013ء)

دوسرے الفاظ میں عظیم کامیابیاں حاصل کرنے والے پیدائشی کامیاب نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ اپنی محنت سے اپنے پاؤں پر کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت مسلمہ ہے خارجی حمایت نہیں بلکہ انسان کی اپنی جدوجہد انسان کی اعلیٰ کامیابی کا باعث بنتی ہے۔ بڑی کامیابی وراثتی طور پر حاصل نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ اپنی محنت کے بل بوتے پر حاصل کی جاتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ پیدائشی طور پر کوئی بھی ارب پتی نہیں ہوتا ہے۔ لیکن ہر انسان ممکنہ طور پر ارب پتی ہے۔ اور اپنی ممکنہ صلاحیتوں کو ظہور میں لانا انسان کو ارب پتی اور اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے والا بناتا ہے۔

فطرت انسانوں کے درمیان امتیازی سلوک روا نہیں رکھتی۔ قدرتی تحائف ہر ایک کو مساوی بنیادوں پر ملتے ہیں۔ تاہم بعض افراد ان تحائف سے استفادہ کرتے اور بعض ان سے مستفید ہونے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ نام نہاد محروم (Deprived) افراد حقیقت میں خصوصی اوصاف کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کی محرومی کی حالت انھیں داخلی طور پر کچھ کرنے کے لیے

اکساتی ہے۔ جب وہ دوسروں کو ترقی کرتا دیکھتے ہیں اُن کی محرومی (Deprivation) اُن کے لیے زبردست ترغیب کا باعث بنتی ہے۔ اور اُن کے من میں اپنے آپ کا میاب بنانے کی مضبوط خواہش پیدا کرتی ہے۔ یہی خواہش انسان کو ایک سپر انسان (Super Man) بناتی ہے۔

اُن کی محرومی (Deprivation) کی حالت اُن کے ذہن میں ایک ایسا طوفان برپا کرتی ہے جس سے اُن کے کام کرنے کی لگن بہت تیز ہو جاتی ہے۔ پھر وہ اپنی بھرپور صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے مقابلے کی دنیا میں اُتر جاتے ہیں۔ اور اپنے اندر آریا پار ہونے کا جذبہ پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ وہی وہ زبردست جذبہ ہے جو اُن کے لیے بڑی کامیابی کی راہ ہموار کرتا ہے۔ کہاوت ہے کہ فلاں صاحب تو منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ دولت و امارت کے ماحول میں پیدائش ایک امیر شخص کے لیے اطمینان کا باعث ہوتی ہے۔ لیکن یہ ہی اطمینان کچھ کر گزرنے کے جذبے کے لیے زہر ہلا بل ہے۔ جب کہ وہ شخص جو افلاس کے ماحول میں پیدا ہوتا ہے۔ اُس کے اندر افلاس عدم اطمینان کو جنم دیتا ہے۔ اور یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ عدم اطمینان انسان کے دماغ کو متحرک کرتا ہے۔ اور کام کرنے کے لیے اکساتا ہے۔

آپ شاذ ہی ایسے خاندان کو پاسکتے ہیں جس کی تاریخ سونے چاندی اور ہیرے موتیوں سے شروع ہوتی ہو۔ کیونکہ ہر خاندان کا مالی لحاظ سے مضبوط ہونا مستقبل کا مسئلہ ہوتا ہے نہ کہ حال کا۔ ہر خاندان کی تاریخ کا آغاز چیتھڑوں سے ہوتا ہے، نہ کہ دولت سے۔ یہ چیتھڑوں اور دولت کی کہانی کچھ خاص لوگوں کی نہیں ہے بلکہ ہر انسان کی کہانی ہے۔ حقیقت میں غریب سے امیر ہونے کی یہ کہانی ہر کامیاب خاندان اور کامیاب شخص کی کہانی ہے۔

بے شمار مثالیں ہیں جہاں کوئی آدمی اپنی جدوجہد کے بل بوتے پر معمولی مقام سے اعلیٰ مقام پر پہنچا۔ لیکن اُس کی اولاد کند ذہن اور سست ہو گئی۔ اس کی وجہ بالکل صاف ہے۔ کیونکہ والد نے اپنی زندگی کا آغاز عدم اطمینان کے جذبے سے کیا تھا جب کہ اولاد اُس جذبے سے تہی دست تھی آسائش نے اُن کے اندر اطمینان پیدا کر دیا تھا اس لیے انھوں نے اپنے سفر کی شروعات اطمینان کے جذبے سے کی۔ اس اختلاف کی وجہ سے والد اور اولاد کی زندگیوں کے درمیان وسیع خلیج حائل ہو گئی وہ شخص جو غریب گھرانے میں جنم لیتا ہے اور اپنی محنت سے دولت حاصل کرتا

ہے۔ وہ دولت کے علاوہ ذہنی ارتقا کی شکل میں بھی ایک مزید چیز حاصل کرتا ہے جو دولت کے مقابلے میں کہیں افضل ہے۔ اُس کے مشکل حالات اُس کے ذہن میں دانشوار نہ جدوجہد پیدا کرتے ہیں۔ یہ جدوجہد اُس کی باطنی صلاحیتوں کو جلا بخشتی ہے۔ نتیجتاً وہ ایک دانشور شخص کے روپ میں ڈھل جاتا ہے۔

وہ شخص جو دولت و امارت کے ماحول میں پیدا ہوتا ہے ذہنی بونے پن کا شکار ہونا اُس کا مقدر بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو انسان مفلسی کے اندھیروں میں جنم لیتا ہے وہ ذہنی طور پر قد آور شخص بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ فطرت کے قوانین ہر چیز کے مقابلے میں زیادہ اٹل ہیں۔ یہ قوانین دائمی اور ناقابلِ تغیر ہیں۔ یہ ہمیں بتاتے ہیں کہ آسانی نہیں مشقت، سہولت نہیں دشواری انسان کو انسان بناتی ہے۔



اسکولنگ بمقابلہ تربیت

والدین کو اپنے بچوں میں اعلیٰ اخلاقی اقدار جیسے دوسروں کے ساتھ ایڈجسٹ ہونے کی خواہش، بردباری، امن سے محبت، سادہ زندگی، اعلیٰ سوچ وغیرہ پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ والدین کی سب سے زیادہ توجہ اپنے بچوں کی طرف ہوتی ہے۔ اُن کی آرزو ہوتی ہے کہ اُن کے اولاد ہونہار ہو، اُن کے بچے زندگی میں بڑی کامیابی اور اعلیٰ ایوارڈ حاصل کریں۔ اس خواہش کے پیش نظر وہ حتیٰ المقدور کوشش کرتے ہیں کہ اُن کے بچوں کا اعلیٰ اسکول میں داخلہ یقینی ہو۔ اور وہ اس کے لیے ہر قیمت دینے کو تیار ہوتے ہیں۔

اس رجحان کو نتائج کے حوالے سے پرکھنا بہت اہم ہے۔ کیونکہ جب ہم ان بڑے اسکولوں کے طلبہ کی کامیابیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ تو یہ حیران کن بات سامنے آتی ہے کہ ان اسکولوں سے تعلیم یافتہ بمشکل ایسے طالب علم ملتے ہیں جنہوں نے نوبل پرائز جیسا کوئی اعلیٰ ایوارڈ حاصل کیا ہو یا سائنس کے میدان میں کوئی کارہائے نمایاں انجام دیا ہے۔ ان نتائج کو جانچنے کے بعد یہ بات کھل کر سامنے آئی ہے کہ بچوں کے لیے اسکولنگ

سے بھی زیادہ تربیت اہم ہے۔ سوال یہ ہے کہ تربیت کیا ہے؟ یہاں تربیت سے مراد یہ نہیں ہے کہ بچوں کو کسی پیشے میں داخل کرنے کے لیے تیار کرنا۔ بلکہ اس کا مطلب ہے کہ والدین اپنی اولاد کو گھریلو طور پر تربیت دینے والے بنیں۔ والدین کو اپنے بچوں کو بے جالا ڈیپار کرنے کے بجائے اعلیٰ حکمت و دانائی سے آراستہ کرنا چاہیے۔ انھیں اپنے بچوں کی تعلیم کے متعلق انتہائی دانشمندی سے پلان بنانا چاہیے، جس میں سخت محنت اور جدوجہد کو سب سے زیادہ ترجیح حاصل ہو۔ انھیں اپنے بچوں میں مثبت سوچ کی نشوونما کرنی چاہیے تاکہ آنے والے دنوں میں وہ اپنی زندگی صحت مند خطوط پر استوار کریں۔ والدین کی بھرپور کوشش ہونی چاہیے کہ ان کے بچوں کا کیریئر اعلیٰ اخلاقی اقدار جیسے دوسروں کے ساتھ ایڈجسٹ ہونے کی خواہش، بردباری، امن سے محبت، سادہ زندگی، اور اعلیٰ سوچ سے مزین ہو۔ والدین کو اپنے بچوں کے ذہن میں ایسی اقدار راسخ کرنی چاہیے۔ جو ان کے لیے ہر صورت حال میں مفید ہوں۔ وہ اپنا محاسبہ کرنے کے فن سے شناسا ہوں۔ ان کی یہ عادت ہو کہ مصیبت کی گھڑی میں دوسروں کو مورد الزام ٹھہرانے کے بجائے اپنے قصور کا اعتراف کرتے ہوں۔

جب ہم انسانی تاریخ کے تجربات پر غور و فکر اور موجودہ صورت حال پر سوچ بچار کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ تربیت اسکولنگ سے زیادہ اہم ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر بی آر مہیدکار، ڈاکٹر راجیندر پرشاد، ڈاکٹر اے پی جے ابوالکلام اور کئی دوسرے افراد معمولی اسکولوں کے تعلیم یافتہ تھے۔ لیکن انھوں نے غیر معمولی کامیابیاں حاصل کیں۔ اس لیے غور طلب بات یہ ہے کہ والدین کا بچوں کی اسکولنگ پر ضرورت سے زیادہ زور اپنی ذمہ داری دوسروں کے ہاتھ میں دینے کے مترادف ہے۔ لیکن یہ اٹل قانون فطرت ہے بچوں کی تعلیم و تربیت والدین کے علاوہ کوئی دوسرا شخص تسلی بخش طریقہ سے کر ہی نہیں سکتا۔

☆☆

اعلیٰ دماغ کی تعریف

ہمیں ایسی فہم و فراست اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے جو اصل مسئلے اور معمولی معاملات میں فرق کر

سکے۔ اس صلاحیت کے بغیر آپ نہ اپنے لیے نہ اپنے معاشرے کے لیے کوئی قابل قدر کام کر سکتے ہیں۔

مشہور فرانسیسی فرانسوز ڈولاروشفو (Maximum and Memoirs 1680-1613)

کے مصنف نے ایک دفعہ کہا تھا۔ ”تنگ ذہن چھوٹی چھوٹی باتوں سے بہت پریشان ہو جاتے ہیں جب کہ اعلیٰ ذہن ہر چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ لیکن اُن سے پریشان نہیں ہوتے۔“

زندگی میں ہر طرح کے تجربات سے واسطہ پڑتا ہے۔ ہمیں ایسے جنگل میں رہنا پڑتا ہے جس میں چھوٹی بڑی ہر طرح کی اشیا آپس میں گڈمڈ ہوتی ہیں۔ اس لیے ہمیں چیزوں کے درمیان انتخاب کرنے کا فن آنا چاہیے۔ ہمارے اندر یہ صلاحیت ہو کہ ہم جانچ سکیں کہ کون سی چیز واقعی اہم ہے۔ اور کون سی چیز زندگی میں قطعاً اہمیت نہیں رکھتی ہے۔ اگر آپ ہر چیز کو سنجیدگی اور بغیر کسی امتیاز کے توجہ دیں گے۔ تو آپ کا انہماک متزلزل ہو جائے گا۔ اگر آپ ہر چیز کو بغیر اُس کی قدر و قیمت جانے مساوی اہمیت دیں گے۔ تو آپ اپنے وقت اور توانائی کو ضائع کر دیں گے۔ اور آپ کسی کام کو بھی مکمل نہ کر پائیں گے۔ ہمیں ایسی فہم و فراست اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے جو اصل مسئلے اور معمولی معاملات میں فرق کر سکے۔ اس صلاحیت کے بغیر آپ نہ اپنے لیے نہ اپنے معاشرے کے لیے کوئی قابل قدر کام کر سکتے ہیں۔

اگر آپ ایکسپریس ریل میں سفر کریں تو آپ دیکھیں گے یہ چھوٹے اسٹیشن پر ر کے بغیر آگے نکل جاتی ہے۔ اور صرف بڑے اسٹیشن پر اسٹاپ کرتی ہے۔ آپ بھی ایسا ہی کریں جیسے ایکسپریس ٹرین کرتی ہے۔ اس طرح آپ سبک رفتاری سے اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔ یہ ذہنیت آپ کو اس قابل بنا دے گی کہ آپ ایسے کام کریں گے جو آپ کے لیے اور معاشرے کے لیے قابل قدر ہوں گے۔



انسان کی محدودیت

حقیقت پسند منصوبہ بندی کے لیے ہر موقع کامیاب ہونے کا موقع ہے۔ جب کہ جذباتیت پر مبنی

پلاننگ کا تباہ کن ناکامی سے دوچار ہونا تقریباً یقینی ہے۔
 فرانس کا سابقہ شہنشاہ نپولین بونا پارٹ کا یہ مشہور قول ہے: ”ناممکن کا لفظ صرف
 احمقوں کی لغت میں ہے“۔ لیکن نپولین کی سوانح عمری خود اس قول کی تردید کرتی ہے۔ 1812
 میں نپولین نے چھ لاکھ فوج کے ساتھ روس پر چڑھائی کر دی۔ لیکن اُس کا روس کو فتح کرنے کا
 منصوبہ خاک میں مل گیا، کیونکہ وہ روس کے موسم سرما کی شدت کا اندازہ نہ لگا سکا جو کہ فرانسیسی فوج
 کے لیے قابل برداشت نہ تھا۔ اُس کے فوجیوں کی بھاری تعداد ہلاک ہو گئی۔ اور نپولین منصوبہ
 بری طرح ناکامی سے دوچار ہوا۔

عام اصول کے تحت نپولین کا قول درست ہے۔ تاہم انسان محدود صلاحیتوں کا حامل
 ہے۔ اس لیے جب کبھی آپ اپنے کسی ہدف کو حاصل کرنے کی منصوبہ بندی کریں۔ تو پُر عزم
 رہتے ہوئے چیزوں کے روشن پہلوں دیکھیں۔ لیکن عین اُسی وقت وہ عملی حقائق جو آپ کی
 پلاننگ کی تکمیل میں حائل ہوں اُن کو بھی ضرور پیش نظر رکھیں۔ کیونکہ ہمیں اپنے پلان محض
 خواہشات کی اساس پر نہیں بلکہ حقائق کی بنیاد پر تشکیل دینے چاہئیں۔ اس دنیا میں ہر منصوبہ قابل
 حصول ہے بشرطیکہ وہ منصوبہ کئی طور پر آپ کی آرزوں سے اخذ نہ کیا گیا ہے۔ اس لیے معاملات
 کے فائدے اور نقصان کا اچھی طرح جائزہ لینا چاہیے۔ اور اُن تمام رکاوٹوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے
 جو آپ کو اپنے منصوبے کی تکمیل کے دوران دور کرنی پڑیں۔

منصوبہ بندی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک حقیقت پسند اور دوسری جذباتی۔ حقیقت
 پسند منصوبہ بندی کے لیے ہر موقع کامیاب ہونے کا موقع ہے۔ جب کہ جذباتی پلاننگ کا تباہ کن
 ناکامی سے دوچار ہونا تقریباً یقینی ہے۔



لیکن یہ کرنا بہت مشکل ہے

منفی حالت میں رہنا اپنے آپ کو قتل کرنے کے مترادف ہے۔
 ایک دفعہ میری ملاقات ایک نوجوان سے ہوئی جو ایک بین الاقوامی کمپنی میں ملازم تھا۔

اُس نوجوان نے اپنے باس کی شکایت کی کہ اُس کے باس نے دیگر ملازمین کی پر موٹن کی، لیکن جب اُس کی باری آئی، تو اُس نے انکار کر دیا۔ میں نے اُنہیں مشورہ دیا کہ شکایت کرنے کے بجائے، اُنہیں اپنی کارکردگی کو بہتر بنانا چاہیے۔ نتیجتاً اُن کا باس اُن کے اچھے کام کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگا۔ اور وہ اُسے مستقبل میں وہ کچھ دے گا۔ جو حال میں اُس نے نہیں دیا۔ جواب میں اُس نے کہا، کہ آپ درست کہتے ہیں لیکن یہ کرنا بہت مشکل ہے۔

اسی طرح جو لوگ اپنے حقوق کے لیے لڑتے رہتے ہیں۔ جب اُن لوگوں کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ اُن کے لیے بہتر راستہ یہ ہے جس چیز کو وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اُس کے لیے کوشش اور جدوجہد کریں۔ کیونکہ مطالبات اور احتجاج اس مد میں کارگر نہیں ہیں۔ تو وہ بھی یہ ہی کہتے ہیں کہ آپ درست کہتے ہیں لیکن یہ کرنا بہت مشکل ہوگا۔

اگر کوئی منفی حالت میں رہتا ہے اور آپ اُس سے کہیں کہ منفی سوچ تو خودکشی کرنے کے مترادف ہوتی ہے۔ اس لیے اُسے چاہیے کہ ماضی کو بھول جائے، اور مستقبل میں رہنے کی کوشش کرے، تو وہ بھی یہ ہی کہے گا۔ آپ کی بات تو درست ہے لیکن یہ کرنا بہت مشکل ہے۔

”لیکن یہ کرنا بہت مشکل ہے“ یہ جملہ ایک غلط تصور پر مبنی ہے۔ حقیقت میں جس کام کو لوگ مشکل سمجھتے ہیں وہ صرف اُن کے انتخاب کا مسئلہ ہوتا ہے۔ ہماری دنیا ایسی جگہ ہے جہاں ہمیں لازمی طور پر دشوار چناؤ کرنا چاہیے۔ کیونکہ اسی ممکنہ راستہ سے آپ کے لیے کامیابی ممکن ہے۔ اس اصول کے خلاف چلنا حقیقت کے خلاف چلنا ہے۔ اور حقیقت کے برعکس چلنا کسی بھی انسان کے لیے قابل برداشت نہیں ہے۔

مزید مشکل کی اصطلاح ایک اضافی اصطلاح ہے۔ اگر آپ مسئلے کو حل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ تو کسی قسم کی مشکل محسوس نہیں کریں گے۔ دراصل کوئی مسئلہ اُس وقت مشکل بنتا ہے جب آپ کے اندر اُسے حل کرنے کی اہلیت نہ ہو۔ اس لیے یہ نہ کہیں کہ یہ مشکل ہے، بلکہ اپنے اندر ایسی حکمت و دانائی پیدا کریں جس کے سامنے مسائل چھوٹے ہو جائیں۔ یہ سارا معاملہ مینجمنٹ کا ہے۔ لہذا مسائل کو مینج (Manage) کرنے کو ہنر سیکھیں۔ جب آپ کو اس ہنر پر دسترس ہوگی تو آپ لازمی طور تمام مسائل کا موثر طور پر سامنا کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

مشکل کا تصور ہمارے سوچنے کے طریقے پر منحصر ہے۔ جب آپ سوچنے کے انداز کو تبدیل کریں گے۔ تو مشکل مشکل نہ رہے گی۔



طاقت جو پہاڑوں کو ہلا سکتی ہے۔

مضبوط قوت ارادی کے سامنے کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی،

نہ کوئی عادت نہ کوئی کمزوری اور نہ کوئی اور چیز

بھارتی ادکار رام کپور (پیدائش ۱۹۷۳) کا انٹرویو انڈین ٹائمز نے اُنٹیس مارچ ۲۰۱۵ کو شائع کیا۔ اپنے انٹرویو میں نے انھوں نے بتایا کہ انھوں نے اپنی بیس سالہ تمباکو نوشی ایک رات میں ترک کر دی۔ یعنی روزانہ کے چالیس سگریٹ پینے کی عادت انھوں نے یکدم چھوڑ دی۔ صرف اس لیے کہ اُن کی بیٹی نے اُن سے پوچھا تھا کہ ”دادا! کیا آپ مرنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ مجھے چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں“۔ رام کپور نے بتایا کہ جب سے میری بیٹی نے مجھ سے مذکورہ سوالات پوچھے ہیں، اُس وقت سے لے کر آج تک ایک سال تین مہینے ہو چکے ہیں میں نے سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا۔

رام کپور صاحب تمباکو نوشی کے عادی تھے اور عام حالات میں ممکن نہ تھا کہ وہ اس عادت کو ترک کرتے۔ لیکن اپنی پیاری بیٹی کے ایک جملے نے اُنھیں ہلا کر رکھ دیا۔ اور ایک مضبوط قوت ارادی اُن کے اندر پیدا ہو گئی۔ اور مضبوط قوت ارادی کے سامنے کوئی شے رکاوٹ نہیں بن سکتی، نہ کوئی عادت نہ کوئی کمزوری اور نہ کوئی اور چیز۔

اکثر لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنی عادات کو ترک نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر وہ کہتے ہیں کہ وہ غصہ کرنا نہیں چھوڑ سکتے۔ ذہنی دباؤ سے نجات حاصل کرنا اُن کے لیے ممکن نہیں ہے یا دوسروں سے بغض و نفرت کو ترک کرنا اُن کے لیے دشوار کام ہے۔ اور اس طرح کی دوسری ملتی جلتی باتیں کرتے ہیں۔

کسی شخص کے لیے ان تمام چیزوں کو ترک کرنا ناممکن نہیں ہے۔ اصل وجہ یہ ہے وہ

اپنے اندر مضبوط قوت ارادی پیدا کرنے کے لیے سنجیدہ نہیں ہے۔ اگر وہ مضبوط قوت ارادی پیدا کر لے۔ تو وہ بھی اپنی بری عادات سے اسی طرح چھٹکارا پاسکتا ہے جیسے رام کپور صاحب نے تمباکو نوشی سے چھٹکارا پائے۔

قوت ارادی کی دو اقسام ہیں۔ ایک کی اساس جذبات پر اور دوسری کی بنیاد عقل پر ہے۔ اکثر لوگ جذباتی لمحات میں متحرک ہو جاتے ہیں اور اپنی کسی عادت کو ترک کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ وہ اپنی کسی عادت کو جذبات کے بجائے عقل کی بنیاد پر ترک کریں۔ جیسے ایک شخص کو پہلے سوچنا چاہیے اور اپنے رویے کو عقل و دانش کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے۔ پھر اپنی عادت کو اس گہرے غور فکر کے نتیجے میں ترک کر دینا چاہیے۔

مثلاً لوگ اکثر دوسروں کی شکایت کرتے ہیں۔ اور شکایتی کلمہ میں رستے ہیں۔ جب کہ شکایت کرنے کی عادت جذبات کا نہیں بلکہ عقل کا مسئلہ ہے اس لیے اگر کوئی شخص اپنی اس عادت پر غور کرے، تو اُسے معلوم ہو جائے گا۔ شکایتی عادت کو اپنانے کا مطلب ہے معاشرے کا برار کن بننا۔ اچھا رکن وہ ہوتا ہے جو دوسروں کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ اس طرح کی خیر خواہانہ سوچ عقلی بنیاد پر غور فکر کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر ایک انسان اس طرح سوچے، تو وہ فوراً شکایت کلمہ کو ترک کر دے گا اور یقینی طور پر ایک مضبوط قوت ارادی کو پیدا کرے گا۔

ایک دفعہ میری ملاقات ایک شخص سے ہوئی، جس نے مجھے بتایا وہ اکثر دوسروں کے ساتھ غصہ سے پیش آیا کرتا تھا۔ ایک دن اُس نے سوچا کہ دوسروں کے ساتھ ناراض رہنے کی قیمت اُسے ادا کرنی پڑتی ہے کیونکہ وہ اپنے غصہ کی وجہ سے مسلسل ذہنی دباؤ اور ٹینشن میں رہتا ہے۔ جب اُس نے اس حقیقت کو جان لیا تو فوراً اپنے رویہ کو تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور غصہ کرنا چھوڑ دیا۔

یہ بہت عام سی بات ہے کہ جہاں لوگوں کا اپنا مفاد ہو وہاں وہ زبردست قوت ارادی کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن جب مفاد دوسروں لوگوں کا ہو، وہاں وہ ایسا نہیں کرتے۔ ایسے لوگ دو ہرے معیار میں زندگی اپناتے ہیں۔ اگر وہ عقل کو استعمال کریں، اور اپنی کمزوری کو پہچان لیں، پھر وہ یقیناً مستحکم قوت ارادی کا اظہار کریں گے اور اپنی غلط عادات ترک کر دیں گے۔

اکثر شادی کے بعد میاں بیوی کے درمیان رخنہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر اُن کی ازدواجی زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ اگر وہ دونوں اس بات کو سمجھیں کہ شادی کے بعد وہ اُس طرح خوش نہیں رہ سکتے جیسے شادی سے پہلے رہتے تھے کیونکہ اس سے پہلے اپنے خاندان میں اپنے خونی رشتوں (Blood Relation) کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ اب پہلے جیسا رشتہ نہیں ہے۔ اگر وہ اس کا ادراک کر لیں تو اپنے رویہ کو درست کرنے کے لیے اپنی قوت ارادی سے کام لیں گے۔ اس طرح وہ اپنی خوش و خرم ازدواجی زندگی کا اہتمام کریں گے۔ زبردست قوت ارادی پیدا کریں یقیناً آپ پہاڑ کو ہلا دینے کی صلاحیت حاصل کر لیں گے۔



جہاں چاہ وہاں راہ

مضبوط قوت ارادی آپ کو موقع دے گی کہ آپ اپنے تجربوں سے سیکھیں۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک مخلص شخص کے لیے تجربات ایک کامیاب استاد کی مانند ہوتے ہیں۔

کچھ سال پہلے میں نے چند دن وسطی افریقہ کے ملک ریوانڈا کے درالخلاہ کیرگالی میں گزارے۔ اس قیام کے دوران میری ملاقات ایک گجراتی انڈین سے ہوئی، جو یہاں تارکین وطن کی حیثیت سے قیام پذیر تھے اور شہر میں کپڑے کی دوکان کرتے تھے۔

ایک دن میں اُن کی دوکان پر گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ اپنے گاہکوں کے ساتھ قابل فہم انگلش بڑی روانی سے بول رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ انگریزی زبان کا بہت اچھا فہم رکھتے ہیں۔ اُن کے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ ان کی انگلش زبان بولنے کے پیچھے بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ کیونکہ جب یہ یہاں آئے تو یہ انگریزی زبان نہیں بول سکتے تھے۔ جب کہ ان کے گاہکوں کی ایک بڑی تعداد انگریزی بولنے والوں کی تھی۔ اس چیز نے انہیں انگریزی زبان بولنے کی کوشش کرنے پر اکسایا۔ ابتدائی دنوں میں ان کی انگلش میں غلطیوں کی بھرمار تھی۔ حتیٰ کے ایک دن کسی نے اُن سے کہا کہ جب تم درست انگلش نہیں بول سکتے، تو کیوں بولتے ہو۔ تو گجراتی انڈین نے مسکراتے ہوئے کہا کہ میں غلط انگلش اس لیے بولتا ہوں کہ درست انگلش بولنی آ

جائے۔

پھر اُن کی مسلسل کوشش رنگ لائی، اور دو سال کے اندر اندر انہوں نے اپنے گاہکوں کے ساتھ درست انگلش بولنا شروع کر دی۔ جب میری اُن سے ملاقات ہوئی، تو اُس وقت انہیں انگلش زبان پر مکمل مہارت تھی جو کہ ایک دکاندار کے لیے بہت اچھی بات ہے۔

یہ کہانی قدیم کہاوت 'جہاں چاہ وہاں راہ کی تصدیق کرتی ہے'۔ کہ اگر آپ کچھ حاصل کرنے کے لیے مضبوط قوت ارادی اپنے اندر پیدا کر لیتے ہیں، تو آپ جلد یا بدیر اپنا ہدف حاصل کر لیں گے۔ کیونکہ مضبوط قوت ارادی بذات خود ایک درس گاہ ہے۔ یہ آپ کو موقع دیتی ہے کہ آپ اپنے تجربوں سے سیکھیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک مخلص شخص کے لیے تجربات ایک کامیاب استاد کی مانند ہوتے ہیں۔

ہمیں انسانی ذہن کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ذہن میں اُن گنت کھڑکیاں ہیں۔ کچھ کھلی ہیں اور کچھ بند ہیں۔ اور بند کھڑکیوں کو کھولنے کے لیے ایسی صورت حال درکار ہے جو انسان کو انہیں کھولنے کے لیے مجبور کر دے۔ اس لیے اگر کسی کو تلخ تجربات پیش آتے ہیں، اور وہ انہیں سنجیدگی سے لیتا ہے۔ تو یہ خود بخود اُس کے دماغ کے بند دروازے کو کھولے دیں گے۔ یہ تجربات بعض اوقات معجزہ نما نتائج لے کر آتے ہیں۔ اور ایک شخص وہ کردار ادا کر سکتا ہے جو ان تجربات سے پہلے ناقابل تصور تھا۔ تقریباً اس اصول کا ہر طرح کی چھوٹی بڑی صورت حال پر اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ کوئی بھی انسان معجزہ دیکھا سکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے۔ کہ اُس کے اندر یہ صلاحیت ہونی چاہیے وہ پریشان کن لمحات کو اچھی صورت میں بدل دے۔

علم نفسیات میں ایک نظریہ ہے جس کو برین اسٹارمنگ (Brainstorming) کہا جاتا ہے۔ یہ اس طرح کے غیر معمولی واقعات کی وضاحت کرتا ہے۔ نفسیات کے مطالعے کے مطابق جب انسان کو مشکل اور پریشان کن صورت حال پیش آتی ہے، تو ذہن میں ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ یہ طوفان دماغ کے خوابیدہ خلیوں (Cells) کو بیدار کر دیتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان وہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے، جس کی وہ عام حالات میں تکمیل نہیں کر سکتا۔ تاریخ میں بے شمار ایسی مثالیں موجود ہیں جو اس نظریہ کی تصدیق کرتی ہیں۔ ان میں

ایک مثال بھیم راؤ رام جی امبیڈکر (1891-1956) کی ہے۔ جو انتہائی غریب بے وقعت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنے آپ کو معاشرے میں دھنکارا ہوا پایا۔ اگرچہ یہ افسوس ناک صورت حال بہت شدید تھی لیکن انھوں نے اس پر قابو پانے کا فیصلہ کر لیا۔ سخت محنت کے بعد انھوں نے اپنی تعلیم کو کامیابی سے مکمل کیا۔ اور پھر بھارتی آئین کی تشکیل میں اعلیٰ دماغ کے روپ میں سامنے آئے۔ آزادی کے بعد انھیں آئین تشکیل دینے والی کمیٹی کا چیرمین مقرر کیا گیا

پریشان اور ناگوار صورت حال میں انسان کو کبھی بھی دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اُسے اپنے ساتھ دوسروں لوگوں کے غیر اخلاقی رویے نظر انداز کرنا چاہئیں۔ تاکہ اپنی صلاحیتیں آشکارہ ہو سکیں۔ اُسے یہ طرز عمل اپنانے کے بعد جلد معلوم ہو جائے گا۔ کہ وہ تو کامیابیوں کی معراج پر ہے۔

اگر قوت ارادی مضبوط ہے تو پھر یہ پوشیدہ صلاحیتیں باہر لاسکتی ہے۔ یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھیں کہ قوت ارادی اور خواہش میں فرق ہوتا ہے۔ غیر حقیقی خواہشات کے پیچھے کبھی نہ دوڑیں۔ اپنی حقیقت پسند قوت ارادی کی پیروی کریں۔ اس طرح آپ اپنا نام اعلیٰ ایوارڈ حاصل کرنے والوں کی فہرست میں لکھوانے کے حقدار ٹھہریں گے۔



دولت سے بھی زیادہ اہم

اگر آپ پُر مشقت ماحول میں پیدا ہوئے ہیں، تو یہ آپ کو تحریک دے گا اور آپ کو کام کرنے کی طرف راغب کرے گا

سات مئی 2012 کو بیرونی دورے سے واپس آتے ہوئے، دہلی انٹرنیٹ پر میں نے ویل چیئر استعمال کی۔ انٹرنیٹ سے باہر آتے ہوئے ایک لڑکے نے کوشش کی کہ وہ میری ویل چیئر چلانے میں مدد کرے۔ میرے ایک ساتھی نے اُس لڑکے کو کچھ رقم دینا چاہی۔ لڑکے نے رقم لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ مجھے پیسہ نہ دیں، مجھے اپنی دعاؤں (آشرواد) میں

شریک رکھیں۔ میں امتحان دے رہا ہوں، میری آپ سے درخواست ہے کہ دعا کریں کہ میں پاس ہو جاؤں۔ میں نے شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا، اور اُس کی کامیابی کی دعا کی۔

انرپورٹ پر جو کچھ لڑکے نے کہا وہ کوئی عام بات نہ تھی۔ بلکہ یہ ایک تخلیقی ذہنیت کی ترجمان تھی۔ یہ آسانی سے دولت کمانے کے مقابلے میں سخت محنت کرنے کا انتخاب تھا۔ یہ کسی سفارش کی بنیاد پر کچھ حاصل کرنے کے بجائے اپنی محنت کی اساس پر کچھ حاصل کرنے کا راستہ تھا۔

جب آپ اپنے اندر جینے کی کوشش کرتے ہیں، دراصل اُس وقت آپ اپنی ممکنہ قابلیتوں کو متحرک کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ یہاں ہر کوئی بے شمار پوشیدہ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوا ہے۔ لیکن ان صلاحیتوں کو آشکارہ صرف اور صرف محنت و مشقت سے سے کیا جاسکتا ہے۔ ہر شخص کے لیے اپنی زندگی میں کامیاب ہونے کی بہترین حکمت عملی یہ ہے کہ وہ کسی کی سفارش حاصل کرنے کے بجائے اپنی خواہیدہ صلاحیتیں جگائے۔

عام طور پر لوگ دوسروں کے بارے میں رشک سے کہتے ہیں کہ فلاں شخص منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوا ہے۔ لیکن یہ کہنا غلط ہے۔ کیونکہ خوش قسمت وہ آدمی ہوتا ہے جو منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہونے کے بجائے دل میں کچھ کرنے کا عزم لے کر پیدا ہوا اگر آپ پُر مشقت ماحول میں پیدا ہوئے ہیں، تو یہ آپ کو تحریک دے گا اور آپ کو کام کرنے کی طرف راغب کرے گا۔ دوسری طرف اگر آپ پر آسائش ماحول میں پیدا ہوئے ہیں۔ تو یہ آپ کے کام کرنے کی تحریک کچل دے گا۔ اور سچ یہ ہے کہ خارجی مدد سے داخلی طور پر کام کرنے کا عزم بہت اعلیٰ ہوتا ہے۔

ہر مدد اپنی نوعیت کے اعتبار سے محدود ہوتی ہے۔ کسی کی بھی امداد و سفارش کا دائرہ کار لامتناہی نہیں ہوتا ہے۔ لیکن جب آپ اپنی پوشیدہ صلاحیتیں نمایاں کرتے ہیں۔ تو ایسے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ کسی کی سفارش و امداد آپ کو عارضی نفع دے سکتی ہے۔ لیکن محنت و مشقت عظیم کامیابی کا واحد راستہ اور مستقل نافع ہے۔ تاریخ میں جتنی بھی عظیم کامیابیاں ہیں وہ سب سفارش کے بجائے سخت محنت کا نتیجہ ہیں۔

یہ بالکل درست کہا گیا ہے کہ 'آسانی نہیں کوشش، سہولت نہیں مشکل جو انسان بناتی

ہیں۔ سہولت دیکھنے میں اچھی لگتی ہے لیکن نتائج کے اعتبار سے مشکل بہتر ہے۔ جسمانی اور ذہنی صحت کے لیے جدوجہد کا انتخاب بہتر ہوتا ہے۔

سفارش کے ساتھ رہنا کا مطلب ہے کہ معاشرے میں ایک باتونی شخص بن کر رہنا۔ لیکن سخت محنت و مشقت کے ساتھ زندگی گزارنے کا مطلب ہے کہ معاشرے کو کچھ دینے والا بن کر رہنا۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ باتونی آدمی سے دینے والا بہتر ہوتا ہے۔

جب آپ اپنی محنت سے کچھ حاصل کرتے ہیں۔ یہ آپ کو خود اعتمادی کی شکل میں ایک قیمتی تحفہ دیتا ہے۔ کیونکہ پُر مشقت کام کے ساتھ ہمیشہ اعتماد ہوتا ہے۔ اور اعتماد ذہنی سکون دیتا ہے۔ اور ذہنی سکون سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔ ایک دفعہ پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا۔ اور کہا میں مفلس ہوں میرے ذریعہ معاش کے لیے مجھے کچھ رقم دیجیے۔ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا ”یہ تمہارے لیے بہتر نہ ہوگا۔ پھر آپ ﷺ نے باوقار زندگی کا فارمولا بتایا: ”اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ پھر آپ ﷺ نے اُسے چند چاندی کے سکے دیئے اور کہا کہ جنگل میں جاو اور لکڑیاں کاٹو اور انہیں بیچ کر اپنی روزگار کماؤ۔ اور دو مہینے کے بعد مجھ سے ملو“

اُس آدمی نے رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کے مطابق عمل کیا اور دو ماہ بعد وہ واپس رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ ”میں اپنے کام سے خوش ہوں اور اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کسی چیز کے لیے کسی کے سامنے سوال نہیں کروں گا۔“

پُر مشقت کام سے آپ دولت کما سکتے ہیں۔ لیکن دولت سے آپ سخت محنت نہیں خرید سکتے۔ زندگی کی بہترین حکمت عملی یہ ہے کہ کبھی کسی سے سفارش اور مدد کے طلب گار نہ ہوں بلکہ اپنی جدوجہد پر اعتماد کریں۔



تنقید خوش آسند عمل

تنقید کسی کام کا اختتام نہیں بلکہ ایک طریقہ عمل ہے۔ اس میں تعمیر

بحث (Discussion) شامل ہے اور ڈسکشن ذہنی ارتقاء کا باعث بنتا ہے اور یہ ذہنی ارتقاء ہے جو

کسی انسان کو اعلیٰ انسان (Super man) بناتا ہے۔
 تنقید بطور قانون ہر کوئی ناپسند کرتا ہے۔ کچھ لوگ تو اس انتہا پر پہنچ جاتے ہیں کہ وہ تنقید سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن یہ ایک غیر صحت مندر، حجام ہے۔ کیونکہ تنقید اور اختلاف رائے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے مثبت عناصر ہیں۔

ایک دفعہ میری ملاقات ایک امریکی اسکالر سے ہوئی، جس سے میں نے سوال پوچھا ”مغربی تہذیب و ثقافت کا سب سے اہم پہلو کون سا ہے۔“ انھوں نے جواب دیا ”اظہار رائے کی آزادی“۔ اپنے جواب کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ مغرب میں اختلاف رائے ہر فرد کا قابل احترام حق سمجھا جاتا ہے۔ قطع نظر اس کے وہ درست ہے یا غلط، اچھا ہے یا بُرا۔

سوال یہ ہے کہ تنقید کیا ہے؟ دراصل تنقید عقل و دانش کا تبادلہ ہے۔ جب آپ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کسی موضوع پر تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ اور اس دوران اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو قوی امکان ہے کہ آپ کے خیالات تنقید کی شکل اختیار کر لیں گے۔ مزید یہ کہ کسی بھی تنقیدی عمل میں دو جماعتیں (Parties) ہوتی ہیں۔ ایک تنقید کرتی ہے جب کہ دوسری تنقید کے نقائص کو نمایاں کرتی ہے پہلی جماعت مختلف نکتہ نظر پر کھل کر گفتگو کرتی ہے۔ جس سے دوسری پارٹی کو موقع ملتا ہے۔ کہ وہ زیر گفتگو موضوع کے کچھ نئے پہلو دریافت کرے، کچھ نئے زاویے سامنے لائے۔ اس لیے تنقید کا عمل دونوں جماعتوں کے لیے نفع بخش بن جاتا ہے۔

خیالات و علم کی کائنات بہت وسیع ہے۔ کسی بھی فرد واحد میں یہ استطاعت نہیں ہے جو اس کا احاطہ کر سکے۔ تنقید شعبہ علم کو وسیع و کشادہ کرنے کا موقع مہیا کرتی ہے یہ ایک قسم کا کچھ دینے اور لینے کا عمل ہے۔

آئینے کی مثال لیجیے۔ آئینہ بھی خالصتاً جسمانی لحاظ سے ایک تنقید نگار کی طرح ہوتا ہے۔ اگر آپ کے چہرے پر کوئی داغ ہو تو آئینہ فوراً آپ کی توجہ اُس داغ کی طرف مبذول کر دے گا۔ اور آپ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے آئینہ کی بات تسلیم کر لیں گے۔ تنقید نگار کے بارے میں بھی یہ بات بالکل درست ہے۔ وہ بھی ایک آئینہ دانش ہوتا ہے۔ جو آپ کے نکتہ نظر میں کسی نقائص کی

نشاندہی کرتا ہے۔ آپ کو اُس کی نشاندہی قبول کر لینا چاہیے۔ اگر آپ فوری طور پر اُسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو کم از کم تنقید نگار کے نکات کو اہمیت تو دینی چاہیے۔ جسمانی آئینہ ہو یا دانش کا آئینہ ہو جب یہ آپ کے کسی جسمانی نقص یا کج فہمی کو نمایاں کریں تو اس پر منفی رد عمل کا اظہار کسی طور مناسب نہیں ہے کیونکہ منفی رد عمل بے فائدہ عمل ہوتا ہے۔

تنقید کسی کام کا اختتام نہیں بلکہ ایک طریقہ عمل ہے۔ اس میں مذاکرات، تبادلہ خیال اور تعمیری بحث شامل ہے اور یہ ہی ذہنی ارتقاء کا باعث بنتے ہیں اور یہ ذہنی ارتقاء ہے جو کسی انسان کو اعلیٰ انسان (Super man) بناتا ہے۔ تنقید کے ذریعہ ہم اپنے سوالوں کے جواب تلاش کرتے ہوئے، عقل و دانش کے سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ تنقید دماغ کے بند دروازے کھولتی ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو کشادگی عطا کرتی ہے۔ اس لحاظ سے تنقید ہمیشہ اچھا عمل ہے۔ اس میں کسی قسم کی برائی نہیں ہے۔

تنقید فہم و فراست کو نئے اور مختلف خطوط سے روشناس کرواتی ہے اور اس کا نتیجہ نئے اور انوکھے انداز سے سوچنے کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ معاشرے کا صحت مند عنصر ہے۔ کسی نے بالکل سچ کہا ہے کہ جب سب یکساں سوچتے ہوں تو کوئی بھی غور و فکر نہیں کرتا ہے۔

تنقیدی سوچ ایک تعمیری فکر اور تخلیقی نقطہ نظر کا اظہار ہے۔ اور ذہنی ارتقاء کے لیے تخلیقی فکر و نظر واحد راستہ ہے۔ تخلیقی مفکر ہمیشہ نئی چیزیں دریافت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن تخلیقی سوچ کو بغیر تنقیدی سوچ کے ترقی نہیں دی جاسکتی ہے۔ لہذا آپ کو تنقید ٹھنڈے دماغ کے ساتھ قبول کرنی چاہیے۔ آپ کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ آپ کا تنقید نگار عقل و دانش کو فروغ دینے والا ہے۔

ہر مرد و عورت کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ اپنی خیالی دنیا میں رہتے ہیں۔ یہ رجحان آپ کی سوچ کی کنڈیشننگ کر دیتا ہے۔ جو کہ مثبت نوعیت کی نہیں ہوتی ہے۔ آپ کے تنقید نگار کے علاوہ کوئی بھی انسان آپ کی سوچ کو غیر مشروط (uncondition) نہیں کر سکتا۔ یہ تنقید نگار ہی ہے جو آپ کی فہم و فراست کے اُن منفی پہلوؤں کی نشاندہی کرتا ہے جو ابھی تک آپ

کی نظروں سے اوجھل تھے۔ لہذا ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ تنقید نگار کو خوش آمدید کہے۔ صرف تنقید نگار ہی ہے جو آپ کی شخصیت کے نقائص دور کر سکتا ہے۔ اس لیے ہمیشہ اُس کے شکر گزار رہیں۔ کہاوت ہے کہ آپ پر تنقید کرنے والا اُس شخص سے بہتر ہے جو آپ کی تعریف کرتا ہے۔ یہ کہاوت بالکل درست اور بامعنی ہے۔ جو انسان تنقید کی اہمیت کو دریافت کر لے گا وہ یقیناً اس کی تعریف کرے گا۔ اور تنقید نگار کی بات کو خوشی خوشی قبول کر لے گا۔ گویا کہ اُسے کسی تربیت گاہ میں نئی شکل دی جا رہی ہے۔

☆☆

دریافت کے کلچر میں رہنا

اگر آپ ذہنی طور پر بیدار شخص ہیں تو پھر اس بات کا قوی امکان ہے کہ آپ اپنے مشاہدے سے ہر شب و روز نئی سے نئی چیز کشید کریں گے

جاپانی کہاوت ہے کہ ہر روز کچھ نیا دریافت کرو، چاہے وہ سوئی میں دھاگہ ڈالنے کا نیا طریقہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس کہاوت کی بنیاد فطرت پر ہے۔ فطرت کے مطابق ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ذہن کو ترقی دے۔ ذہنی ارتقا ایک مسلسل عمل ہے جو دن رات چلتا رہتا ہے۔

کائنات حقائق دلچسپ نکات سے بھری ہوئی ہے۔ اگر آپ متحرک شخص ہیں اور پُراشتیاق ذہن اور طالب علمانہ احساس کے حامل ہیں، پھر اس بات کا قوی امکان ہے کہ ہر تجربہ اور مشاہدہ آپ کو نیا سبق سیکھائے گا۔ اگر آپ ہر لمحہ گہرا غور و فکر کریں، تو آپ نئے نظریات دریافت کرنے کے قابل ہو جائیں گے

دریافت ہمارے ذہن کے لیے ایک خوراک کی مانند ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے کھانے پینے کی اشیاء ہمارے جسم کی خوراک ہیں، ہم ناشتہ یا دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں، اسی طرح ہم اپنے جسم کے لیے توانائی کا اہتمام کرتے ہیں۔ اسی طرح ہماری ذہنی صحت کے لیے بھی علم اور مشاہدے کی ضرورت ہے۔

ہمیں ضرور اس حقیقت سے آگاہ رہنا ہے۔ کہ ہمیں ہر تجربے سے کچھ نہ کچھ نیا اخذ کرنا

ہے۔ اس بات کا مکمل انحصار ہمارے بیدار ذہن پر ہے۔ اگر آپ ذہنی طور پر بیدار شخص ہیں تو پھر اس بات کا قوی امکان ہے کہ آپ اپنے مشاہدے سے ہر شب و روز نئی سے نئی چیز کشید کریں گے۔

اپنی اس روزانہ کی دریافت کے بغیر آپ کا دماغ سست ہو جائے گا۔ اور آپ کند ذہن ہو جائیں گے۔ اور اس طرح آپ اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ ظاہری شکل میں آپ انسان ہی ہوں گے لیکن باطنی طور پر آپ انسان سے قدرے کم رہتے رہوں گے۔ تمام حیوانات کو فزیکل خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ دانشورانہ خوراک کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ اس کے برعکس انسان کی فطرت میں ہے کہ اُسے دانشورانہ حوصلہ افزائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہذا اس مقصد کے لیے اُسے ہر روز نئی چیز دریافت کرنی چاہیے۔ یہ عادت اُسے ایک تخلیقی آدمی بنا دے گی۔ اور صرف تخلیقی آدمی ہی زندگی میں بڑے کام کر سکتا ہے۔



صورت حال کا مالک

اپنے جذبات کو کنٹرول کریں، آپ ہر طرح کی صورت حال کو با آسانی سنبھال لیں گے۔ یہ بڑی کامیابی کے لیے بہترین فارمولا ہے۔

کسی بھی پیش آمدہ صورت حال کا مالک کون ہوتا ہے؟ مالک وہ ہوتا ہے جو ناپسندیدہ صورت حال کو پسندیدہ صورت حال میں بدل دے۔ اور یہ کرنا ہر ایک کے لیے ممکن ہے۔ بس انسان کو اپنے جذبات و احساسات کو کنٹرول کرنا، اور غیر متعصب ہو کر سوچنا ہوتا ہے۔

انیسویں صدی کی ایک عظیم بھارتی شخصیت سوامی ویکا نند تھیں ایک دفعہ اُن کے ایک دوست نے اُن کا کچھ اس طرح امتحان لیا، کہ اُنھیں اپنے گھر دعوت دی۔ ایسے کمرے میں بیٹھایا جہاں ایک میز پر منزل بہ منزل دس مقدس مذہبی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ عیسائیوں کی مقدس کتاب بائبل سب سے اُوپر تھی اور ہندو مذہب کی مقدس کتاب گیتا سب سے نیچے تھی۔ یقیناً کتابوں کو اس ترتیب سے رکھنا اپنے مہمان کو اشتعال دلانے کے لیے تھا۔ میزبان نے کتابوں کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، سوامی جی کچھ تبصرہ کیجیے۔ سوامی جی نے مسکراتے ہوئے کہا: ”بنیاد واقعی بہت اچھی ہے۔“

یہ واقعہ ایک اچھی مثال ہے جو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ صورت حال کا مالک کیسا بنا جاسکتا ہے۔ یہ ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم کسی بھی حالت میں مشتعل نہ ہوں۔ حتیٰ کہ اشتعال دلانے والی صورت حال میں بھی غصہ نہ کریں۔ جب آپ مشتعل ہو جاتے ہیں تو آپ کا دماغ مفلوج ہو جاتا ہے۔ اور موثر طریقے سے کام نہیں کرتا۔ نتیجتاً آپ خود کو حالات کے رحم و کرم پر پاتے ہیں۔ جب آپ اشتعال انگیز صورت حال کو اجازت نہیں دیتے کہ وہ آپ پر اثر انداز ہو۔ تب آپ کا دماغ اپنی پوری صلاحیتیں بروئے کار لاسکتا ہے۔ اور جب دماغ کو آزاد نہ طور پر کام کرنے دیا جائے تو یہ سپر کمپیوٹر کی مانند کام کرتا ہے۔ اور دشوار سے دشوار مسائل حل کر سکتا ہے۔

ہر مرد و عورت کی سب سے بڑی صلاحیت اُس کی ذہنی صلاحیت ہے۔ یہ ناقابل تصور حد تک کام کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ دراصل یہ ذہن ہی ہے جو پورے جسم کو کنٹرول کرتا ہے۔ اور جیسا کہ سائنسی ترقی کے ساتھ اس نے خلا کی وسعت کو بھی اپنی دسترس میں لے لیا ہے۔ دماغ کے ذریعہ انسان سپر مین (Superman) بن گیا ہے۔ اس ذہنی صلاحیت کے برعکس جذبات و احساسات انسان کے کمزور پہلو ہیں۔ جو انسان اپنے احساسات و جذبات پر غالب آجائے وہ پوری دنیا پر غالب آسکتا ہے۔ صورت حال کا مالک بننے کا یہ سادہ سا فارمولا ہے کہ اپنے جذبات کو کنٹرول کریں، آپ ہر طرح کی صورت حال کو با آسانی سنبھال لیں گے۔ یہ بڑی کامیابی کے لیے بہترین فارمولا ہے۔

انسانی شخصیت متناقض (Paradoxical) ہے۔ کیونکہ انسان عقل کے لحاظ سے دنیا کی سب سے طاقتور مخلوق ہے۔ لیکن جسمانی لحاظ سے یہ دیگر مخلوق سے کمزور تر ہے۔ وہ شخص جس کو اُس کا دماغ کنٹرول کرے وہ طاقتور ہے۔ اور جو اپنے جذبات کا شکار ہو جائے وہ کمزور ہے یہ آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے کہ آپ طاقتور بننے ہیں یا کمزور۔

لوگ عام طور پر دوسروں کی شکایت کرتے ہیں جب کہ کوئی بھی شخص آپ سے زیادہ طاقتور نہیں ہے۔ کیونکہ دوسرا کوئی بھی آدمی آپ کے لیے مسائل پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ آپ کی

اپنی حماقت یا جذباتی پن ہوتا ہے جو دوسروں کو شرارت کرنے کا موقع دیتا ہے۔ لہذا شکایت نہ کریں۔ ہمیشہ اپنے اندر جھانکیں، اپنا جائزہ لیں اور ہر وقت اپنی منصوبہ بندی کی از سر نو جانچ کے لیے تیار رہیں۔ پھر آپ کو کسی سے شکایت نہ ہوگی۔

ایک مختصر مگر جامع کہاوت ہے: ”دوسروں کو الزام نہ دو“ اس کے مطلب ہے ہر طرح کے معاملے میں آپ کو دوسروں کی غلطیوں پر انگشت نمائی نہیں کرنی چاہیے، بلکہ اپنی غلطیاں تلاش کرنی چاہئیں اور ان کا اعتراف کرنا چاہیے۔ یہ کامیاب زندگی کا سادہ ترین فارمولا ہے۔ یہ کبھی نہ کہیں کہ یہ صورت حال میرے حق میں ہے۔ اور یہ صورت حال میرے خلاف ہے۔ یہ صرف اور صرف آپ خود ہیں نہ کہ صورت حال جو آپ کے لیے روشن مستقبل کے دروازے کھول سکتی ہے۔ اس لیے صورت حال کو سنبھالنے کے فن میں مہارت حاصل کریں۔ جو لوگ صورت حال کو کنٹرول کر سکتے ہیں وہ لازمی طور پر اپنی قسمت کے خود مالک بنتے ہیں۔ تقریباً تمام عظیم آدمی ناموافق صورت حال میں پیدا ہوئے۔ لیکن انہوں نے صورت حال کو کنٹرول کیا، اور بڑی کامیابی حاصل کرنے والے بن گئے۔



رکھنا اور نہ رکھنا

جتنی زیادہ کام کرنے کی تحریک ہوگی اتنی زیادہ ترقی ہوگی۔
جتنی تحریک کم ہوگی ترقی بھی اتنی ہی کم ہوگی

یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص منہ میں سونے کا چچے لے کر پیدا ہوا۔ اور فلاں مفلوک الحالی میں پیدا ہوا۔ اس طرح لوگ عموماً وسائل رکھنے اور نہ رکھنے والے دو گروہوں میں منقسم ہوتے ہیں۔ لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس طرح کی تقسیم اصل صورت حال بتانے میں ناکام ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جب وہ پیدا ہوئے تو بالکل تہی دست تھے، لیکن جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے، تو وہ وسائل رکھنے والی جماعت کے ایک معزز رکن بن چکے تھے۔

اس کی ایک بڑی مثال ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام ہے۔ ڈاکٹر عبدالکلام اتنے غریب

خاندان میں پیدا ہوئے تھے کہ اُن کی اسکول فیس بھی ادا کرنی مشکل تھی۔ لیکن اپنی زندگی کے دوسرے حصہ میں وہ بھارت کے سب سے اعلیٰ منصب یعنی صدرات کے عہدے پر فائز تھے۔ اپنی جوانی میں وہ غیر معروف شخص تھے لیکن زندگی کے آخری حصے میں وہ بین الاقوامی پہچان کے حامل ہو گئے۔

اس کا مطلب ہے کہ لوگوں کی وسائل رکھنے اور نہ رکھنے کے حوالے سے درجہ بندی غلط ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ لوگوں کی درجہ بندی پوشیدہ صلاحیت (Potential) رکھنے والے اور حقیقی صلاحیت (Actual) رکھنے والے افراد کے حوالے سے کی جائے۔ جب ڈاکٹر عبدالکلام پیدا ہوئے تو اُن کا تعلق پوشیدہ صلاحیت رکھنے والے افراد سے تھا۔ لیکن بلا آخر حقیقی صلاحیت رکھنے والی جماعت کے رکن بن گئے۔

دراصل تمام مرد و عورت اعلیٰ پوشیدہ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ صلاحیتیں خوابیدہ حالت میں ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے ہر انسان پوشیدہ صلاحیت رکھنے والی جماعت کا رکن ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اپنی قابلیت کو تیز کرے اور اپنی زندگی کی درست منصوبہ بندی کرے۔ تو وہ لازمی طور پر حقیقی صلاحیت رکھنے والی جماعت کا رکن بن جائے گا۔

تمام بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کرنے والے، اپنی زندگی کے آغاز میں بڑی بڑی ناکامی کا سامنا کرنے والے تھے لیکن زندگی کے پچھلے حصے میں وہ بڑے کامیاب و کامران بن کر اُبھرے۔ اس لیے اگر آپ ظاہری طور پر غریب گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ تو ہرگز یہ کہیں کہ آپ کا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہے۔ بلکہ یہ کہیں کہ آپ کا تعلق پوشیدہ صلاحیت رکھنے والی جماعت سے ہے۔ فطرت نے کسی انسان کے ساتھ غیر مساویانہ سلوک نہیں کیا ہے بلکہ سب کو اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ لیکن یہ صلاحیتیں حقیقت کے روپ میں نہیں ہوتیں، بلکہ امکان کی صورت میں ہیں۔ اب یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ اس امکان کو حقیقت میں بدلیں۔ قسمت کو کوسنے نہ دیں، بلکہ اپنی صلاحیت کا کھوج لگائیں۔ آپ اپنا مقدر خود لکھ سکتے ہیں۔ مگر اس کے لیے صرف ایک شرط ہے کہ آپ اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو دریافت کر کے حقیقت میں بدلیں۔

”نہ رکھنا“ اُن لوگوں کے لیے منفی الفاظ ہیں جو مختلف نوعیت کی شخصیت کے ساتھ پیدا

ہوتے ہیں۔ ورنہ جو لوگ مفلسی میں جنم لیتے ہیں۔ اُن کے پاس اپنی زندگی کو بہتر خطوط پر استوار کرنے کے لیے زبردست تحریک موجود ہوتی ہے۔ اور یہ فطرت کے قانون کے عین مطابق ہے۔ اور یہ ہی وہ تحریک و ترغیب ہے جو ہر طرح کی ترقی کا باعث بنتی ہے۔ لہذا اس کا قدرتی فارمولہ یہ ہے۔ جتنی زیادہ تحریک ہوگی اتنی زیادہ ترقی ہوگی جتنی کم تحریک ہوگی اتنی کم ترقی ہوگی۔

وہ لوگ جن کی درجہ بندی وسائل نہ رکھنے والوں میں کی جاتی ہے۔ انہیں جدوجہد کرنی چاہیے۔ اس جدوجہد کے ذریعہ وہ ہر قسم کی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ ایک سروے کے مطابق جو لوگ براعظم ایشیا یا افریقہ کے غریب ممالک میں پیدا ہوئے، پھر بعد ازاں امریکہ ہجرت کر گئے وہ اب اوسط امریکن سے زیادہ کماتے ہیں۔ یہ اُن کی مشقت کا کرشمہ ہے۔ ماضی میں وہ غریب تھے لیکن اب وہ امیروں میں شمار ہوتے ہیں اور بہترین ماحول میں زندگی گزارتے ہیں۔ اس کی وجہ ماسوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ کام کرنا کارہجان رکھتے تھے۔ جب کہ امیر لوگ اس طرح کی ترغیب سے محروم ہیں۔ غریب افراد کو شوق اور رغبت سے کام کرنے کے رویہ پر دسترس حاصل ہے۔

اس پس منظر کو پیش نظر رکھ کر جب ہم غور کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے۔ وسائل نہ رکھنے والے وسائل رکھنے والوں سے زیادہ خوش قسمت ہیں۔ کیونکہ وسائل سے محروم افراد بہتر کام کرنے کی ترغیب رکھتے ہیں۔ انہیں زیادہ جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ دانشورانہ بیداری کا تجربہ کرتے ہیں۔ اور نتیجتاً ایک متحرک زندگی گزارتے ہیں۔ یہ لوگ تخلیقی سوچ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ یہ بہترین انسانی صفت عموماً وسائل رکھنے والی جماعت میں نہیں ہوتی ہے

فطرت کا قانون ہماری زندگی کا بہت اہم عنصر ہے۔ اور یہ ہی قانون ہے جو واقعات کے ظہور اور نتائج کا تعین کرتا ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ فطرت کے قانون کا جھکاؤ ظاہری طور پر نہ رکھنے والے جماعت کی طرف ہوتا ہے۔ اگر آپ لوگوں کو اُن کے مستقبل کے حوالے سے دیکھیں تو آپ کہہ سکتے ہیں۔ آج نہ رکھنے والے کل رکھنے والے ہوں گے۔ اور آج رکھنے والے کل نہ رکھنے والے جماعت سے ہوں گے۔



کنڈیشنڈ ذہنیت کی ڈی کنڈیشننگ

اپنی کنڈیشنڈ ذہنیت کو ڈی کنڈیشن کریں تو آپ ماضی کے مقابلے میں فوراً ایک نئے شخص کے روپ میں ظاہر ہوں گے۔

امریکی ماہر نفسیات بروڈوس جان واٹسن (1878-1958) نے طویل تجربات کے بعد دریافت کیا۔ کہ کنڈیشننگ زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ کنڈیشننگ سے مراد ہے کہ ہر انسان ایک خاص ماحول میں پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے ہر ایک ماحولیات کنڈیشننگ کے تابع ہے۔ اور اس میں کسی کو استثنا نہیں ہے۔ لہذا یہاں ہر کوئی مسٹر کنڈیشن یا مسز کنڈیشن ہے۔

پروفیسر واٹسن کا مشاہدہ بالکل درست ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ یہاں ہر کوئی کنڈیشننگ کا کیس ہے۔ لیکن پروفیسر واٹسن کا مشاہدہ آدھے سچ پر مبنی ہے۔ اُس نے کنڈیشننگ کا قانون تو دریافت کر لیا لیکن وہ ڈی کنڈیشننگ کا قانون دریافت کرنے میں ناکام ہو گیا۔ اُس کی تحقیق کے مطابق ہر انسان کنڈیشنڈ حالت میں رہنے پر مجبور ہے۔ یہ حالت ہر کسی کا مقدر ہے۔ اور اس کنڈیشننگ سے کسی کو فرار نہیں ہے۔ لیکن یہ یقینی طور پر غیر فطری بیان ہے۔ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ ہر کوئی کنڈیشننگ کے تابع ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر طرح کی کنڈیشننگ کو مکمل طور پر پلٹا یا (Reverse) جاسکتا ہے۔ کنڈیشننگ ایک سوچ کا مسئلہ ہے۔ اور اسے مخالف زاویہ سے غور و فکر کر کے بدلا جاسکتا ہے۔ دونوں طریقوں سے ماحول کے مطابق اور ماحول سے ہٹ کر سوچنا انسانی دماغ کے لیے ممکن ہے۔

جدید کمپیوٹر انسانی دماغ کا ایک مشینی ماڈل ہے۔ اور ہر کوئی جانتا ہے کہ کمپیوٹر ہر وہ چیز ڈیلیٹ کر سکتا ہے جو آپ ڈیلیٹ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ نے کچھ ڈیٹا کمپیوٹر میں فیڈ کیا ہے۔ بعد ازاں آپ اُسے ڈیلیٹ کرنا چاہتے ہیں۔ تو بڑی آسانی سے ڈیلیٹ کا بٹن دبا کر اُسے ختم کر سکتے ہیں۔ انسان دماغ نا قابل تصور حد تک مشینی کمپیوٹر کا ایک بڑا ماڈل ہے۔ اگر ایک چھوٹے ماڈل کا کمپیوٹر آسانی سے کسی بھی ڈیٹا کو ڈیلیٹ کر سکتا ہے۔ تو بڑے ماڈل کا کمپیوٹر یہ کام کیوں نہیں کر

سکتا۔ دماغ کی ڈی کنڈیشننگ بھی چھوٹا سے ٹچ بٹن رکھتی ہے۔ یہ ٹچ بٹن صرف ایک سادہ سے فقرے پر مبنی ہے ”میں غلط ہوں“ اس فقرے کو پورے اخلاص کے ساتھ کہیے۔ ”میں غلط ہوں“ اور اس طرح آپ ہر طرح کی کنڈیشننگ کو چند لمحات میں ڈیلیٹ کر سکتے ہیں۔

واٹسن بذات خود ایک ثبوت ہے کہ ماحولیاتی کنڈیشننگ کو کسی بھی انسان کی زندگی کے دوسرے حصے میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ واٹسن نے پہلے اپنے آپ کو دانستہ یا نادانستہ طور پر ڈی کنڈیشننگ کیا۔ اس کے بعد وہ کنڈیشننگ کا مسئلہ دریافت کرنے میں کامیاب ہوا۔ لہذا اگر یہ ڈی کنڈیشننگ واٹسن کے لیے ممکن ہے تو دوسروں کے لیے کیوں نہیں ہے؟ ڈی کنڈیشننگ کی اہمیت کیا ہے؟ اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ ذہنی ارتقا کا واحد راستہ ہے۔ اس حقیقت کو قبول عام حاصل ہے کہ شخصیت کی تعمیر میں تعلیم ایک اہم ذریعہ ہے۔ لیکن عین اُس وقت جب انسان تعلیم حاصل کر رہا ہو۔ اُسے چاہیے کہ وہ اپنی ذہنیت کی ڈی کنڈیشننگ کرے۔ ورنہ وہ تعلیم کے ثمرات سے پوری طرح بہرہ مند نہیں ہو سکتا۔

میں ایک ایسے طالب علم کو جانتا ہوں، جس کا تعلق اقلیت سے ہے۔ اور اُس کے دماغ میں امتیازی سلوک کا خناس سما یا ہوا ہے۔ ایک دفعہ انھوں نے مجھے سے کہا، کہ جب تک اقلیتوں کے لیے سیٹوں کا کوٹہ مخصوص نہ ہوگا۔ اُس وقت تک اس ملک میں انھیں اچھی نوکری ملنا محال ہے۔ میں نے کہا ایسی بات نہیں ہے دراصل آپ اس وقت معاملات کو امتیازی سلوک کے زاویہ نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ آپ ذرا پیچھے ہٹ کر اپنی سوچ میں ترمیم کریں اور معاملات کو قابلیت اور میرٹ کے زاویہ سے دیکھیں۔ میں نے انھیں وہ مشہور کہاوت یاد دلانی کہ چوٹی پر ہمیشہ جگہ ہوتی ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ اگر آپ درمیانے درجے کے طالب علم ہیں تو پھر شاید آپ کو اپنے ملک میں ہی نہیں بلکہ دنیا میں کہیں بھی اس قسم کے امتیازی سلوک کا سامنا ہو سکتا۔ لیکن اگر آپ اپنی کوششیں تیز کر دیں، اور اپنے ادارے کے چوٹی کے طالب علموں میں شامل ہو جائیں۔ پھر آپ یقینی طور پر اپنی من پسند نوکری حاصل کر لیں گے۔ میں نے کہا کہ امتیازی سلوک کی ایک حد ہوتی ہے آپ اُس حد کو اپنی محنت اور لگن سے عبور کر سکتے ہیں۔

اُس طالب علم نے میرے مشورے کو مان لیا۔ اور دوبارہ غور و فکر شروع کر دیا۔ اور اپنی

محنت و جدوجہد میں اضافہ کر دیا۔ نتیجتاً اُس طالب علم کا رزلٹ حیران کن آیا۔ اُس نے اعلیٰ درجے کے نمبر حاصل کیے۔ اور یقیناً اُسے کسی ادارے کی جانب سے نوکری کی اچھی پیشکش موصول ہوگئی ہوگی۔ وہ لوگ جو صرف خارجی عناصر کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ وہ لازمی طور پر اپنی صلاحیتوں کو ضائع کرتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اپنی ذات کو دریافت کر لیتے ہیں۔ وہ امتیازی سلوک کے آسیب سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔ اور ہر طرح کے چیلنج کو پورا کر سکتے ہیں۔

اپنی کنڈیشنڈ ذہنیت کو ڈی کنڈیشن کریں تو آپ ماضی کے مقابلے میں فوراً ایک نئے شخص کے روپ میں جلوہ گر ہوں گے۔



بغیر استحقاق کے حقوق حاصل

کرنے کے لیے سرگرم ہونا

ہمیشہ ایسی سرگرمی میں مصروف ہونا بہتر ہوتا ہے جو فرض شناسی کی اہمیت کو اجاگر کرے۔ پھر آپ کو کسی سے شکایت نہ ہوگی۔

مشہور ٹینس کی چیمپین مارٹینا نیورا تیلوا 1956 میں کیمونسٹ ملک چیکوسلواکیہ میں پیدا ہوئی۔ وہ امریکن نظریات کی حامی تھیں، اس لیے چیکوسلواکیہ انتظامیہ نے 1975 میں مارٹینا کی شہریت ختم کر دی۔ 1981 میں انھیں امریکہ کی شہریت مل گئی۔ مارٹینا نے ٹینس میں بہت محنت کی اور بہت سے مقابلے جیت کر ٹینس کی مشہور و معروف کھلاڑی بن گئیں۔

چیکوسلواکیہ کی شہریت مارٹینا کا حق ہونے کے باوجود ختم کر دی گئی تھی لیکن انھوں نے اس پر نہ ہی احتجاج کیا نہ ہی اپنے حق کے لیے کوئی سرگرمی دیکھائی بلکہ انھوں نے اپنی ساری توجہ اپنے کھیل پر دی۔ اور ٹینس چیمپین بن گئیں۔ اس چیز نے چیک گورنمنٹ کی سوچ کو تبدیل کر دیا۔ نیرا تیلوا جو کہ پہلے چیک گورنمنٹ کی ذمہ داری سنبھالی جاتی تھی۔ بعد ازاں وہ اُس کا اثاثہ بن گئی۔ چیک گورنمنٹ نے 1908 میں مارٹینا کی شہریت بحال کر دی۔

اس طرح کی صورت حال میں لوگ عموماً احتجاج کرتے ہیں۔ اپنے مطالبات پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک مصدقہ معاملہ ہے کہ ایسے موقعوں پر شاذ و نادر ہی کوئی مثبت بات کرتا ہے۔ اس کے برعکس مارتینا نے کوئی احتجاجی تحریک نہیں چلائی۔ بلکہ انھوں نے اپنے ٹیلنٹ کے بل بوتے پر اپنے حقوق بحال کروائے۔

یہ دنیا چیلنج کی دنیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ احتجاجی تحریک چلانا اور شکایت کا طوفان کھڑا کرنا بالکل غیر متعلقہ ہے۔ چیلنج کو پورا کرنے کے لیے صرف ایک ہی چیز موثر ہو سکتی ہے وہ ہے اپنی مہارت کو ثابت کرنا۔ زندگی میں کامیاب ہونے کا یہ ہی راز ہے۔ کبھی بھی اپنے حقوق کے لیے احتجاج کا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیشہ ایسی سرگرمی میں مصروف ہونا بہتر ہے جو فرض شناسی کی اہمیت کو اجاگر کرے۔ پھر آپ کو کسی سے شکایت نہ ہوگی۔



ترقی کاراز

کسی بھی چیز میں کامیابی کے لیے خارجی حالات کا آپ کے حق میں ہونا اہم نہیں ہے۔ بلکہ داخلی طور پر کام کرنے کی تحریک کا ہونا ضروری ہے۔

اخبار انڈین ٹائمز میں دنیا کے ایک سوا میر ترین افراد کی سروے رپورٹ شائع ہوئی۔ جس کے مطابق ان سوا افراد میں سے اکثریت نے اپنا معاشی استحکام ورثے میں حاصل نہیں کیا تھا۔ ان میں سے 73% افراد اپنی محنت کے بل پر امیر ہوئے تھے۔ 18% افراد نے کسی بھی کالج سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ 36% افراد غریب والدین کی اولاد تھے۔ (۱۱ اگست ۲۰۱۳) سوال ہے کہ یہ افراد غریب گھرانوں میں پیدا ہوئے اور ان میں بیشتر نے روایتی تعلیم بھی حاصل نہیں کی۔ انھیں نہ تو کسی سرکاری یا غیر سرکاری تنظیم کی مدد حاصل تھی۔ پھر کیسے یہ اتنے دولت مند بن گئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا دولت مند ہونا ان کی اپنی محنت کی وجہ سے ہے۔ یہ رپورٹ اس بنیادی اصول کی وضاحت کرتی ہے، کہ وسائل سے محرومیت (Deprivation) کا صرف منفی پہلو نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مثبت پہلو بھی ہے یہ انسان کو کچھ کر

گزرنے کا عزم و حوصلہ اور اپنی احساس محرومی پر غالب آنے کی تحریک بھی دیتی ہے۔ جس کو فطرت کا قانون خود نافذ کرتا ہے۔ ایک شخص جو یہ احساس کرتا ہے کہ وہ وسائل سے محروم ہے اُس کا یہ احساس اُس کے اندر یہ خواہش اور طاقت پیدا کرتا ہے کہ جس چیز سے وہ محروم ہے اُسے حاصل کرنے کے لیے بھرپور کوشش کرے۔ یہ داخلی تحریک اُسے اُس وقت تک متحرک رکھتی ہے جب تک وہ اپنے ہدف تک نہیں پہنچ جاتا۔ اُس کا احساس محرومی اُس کے اندر زبردست جدوجہد کرنے کی تحریک پیدا کرتا ہے۔

کسی بھی شعبے میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے خارجی ماحول کا حق میں ہونا نہیں، بلکہ داخلی تحریک اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ پرسکون خارجی ماحول انسان کو مطمئن اور مست بنا دیتا ہے۔ جب کہ ناموافق خارجی ماحول انسان کے اندر عدم اطمینان پیدا کرتا ہے۔ اور یہ عدم اطمینان ہی ہے جو بدلے میں انسان کو کچھ ایسی جدوجہد کرنے کی ترغیب دے سکتا ہے کہ وہ چیزوں کو اپنے حق میں کر لے۔



آسان راستہ ناپید ہے

کیونٹی میں طرف داری کا رجحان افراد کی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتا ہے۔ لیکن جب کوئی کمیونٹی کسی چیلنج کا سامنا کرتا ہے۔ تو یہ اُس کے لیے ایک متحرک عنصر ثابت ہوتا ہے۔

سولہ دسمبر 2013 بھارتی سپر اسٹار کرکٹر سچن ٹنڈولکر کی زندگی میں ایک خاص دن تھا۔ یہی وہ دن تھا جب اُن کے چوبیس سالہ کرکٹ کے دور کا اختتام ہوا تھا۔ اس عرصہ میں وہ بھارت کے ایک سپر مین بن کر سامنے آئے تھے۔ اپنی ایک مختصر تقریر میں اُنھوں نے اپنی کامیابیوں کا سہرا اپنے مرحوم والد رمیش ٹنڈولکر کے سر باندھا۔ اُنھوں نے بتایا گیارہ سال کی عمر میں جب اُنھوں نے کرکٹ کھیلنا ہی شروع کی تھی تو اُن کے والد نے اُنھیں ایک نصیحت کی:

”اپنے خوابوں کو حقیقت کا روپ دو، لیکن آسان راستہ (Short Cut) اختیار نہ کرو“

سچن نے اس نصیحت پر عمل کیا اور اس نصیحت نے اُن کے لیے کامیابیوں کی راہ ہموار کی

یہ شارٹ کٹ اپنانے سے کیا مراد ہے۔ اس کا مطلب ہے مختصر راستے یا بائی پاس سے سفر کرنا تاکہ منزل مقصود کا فاصلہ کم ہو جائے۔ اس طرح نارٹل راستہ سے بچتے ہوئے، ایک شخص اپنی منزل کے راستے پر کم وقت سفر کرتا ہے۔ لیکن جب انسانی زندگی کا با مقصد سفر ہو، تو یہ راستہ شاذ و نادر ہی اچھا راستہ ثابت ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر آپ ایک طالب علم ہیں۔ اور بغیر گریجویٹیشن کیے ماسٹر ڈگری کا امتحان دینا چاہتے ہیں۔ یا آپ غریب ہیں لیکن بغیر محنت کے ارب پتی بننا چاہتے ہیں۔ یا آپ اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز کرتے ہیں۔ اور بغیر مطلوبہ فیلڈ ورک کیے آپ سیاسی نظام کے سب سے اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کے خواہاں ہیں۔ تو آپ کی کوئی خواہش پوری نہیں ہوگی کیونکہ اس طرح کے شارٹ کٹس آپ کو حقیقی زندگی میں کہیں نہیں ملیں گے۔ ایسی صورتوں میں شارٹ کٹس لیتے ہوئے اپنے اہداف حاصل کرنے کی منصوبہ بندی کرنا ایک احمقانہ حرکت ہے اور یہ کہیں بھی قابل عمل نہیں ہے۔

اس فارمولے کا اطلاق صرف فرد واحد پر نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ ایک برادری یا قوم کی زندگی کے لیے بھی سچ ہے۔ بھارت میں مسلمان طبقے کے راہنما کہتے ہیں کہ مسلمان فلاں فلاں وجہ سے پسماندہ قوم بن چکے ہیں۔ اور انھیں ترقی دینے کا واحد راستہ یہ ہے کہ ان کا ملازمتوں میں علیحدہ سے کوئی مخصوص کیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو مسلمان مسلسل پسماندہ رہیں گے۔

اس قسم کا مطالبہ درحقیقت شارٹ کٹ کا مطالبہ ہے۔ لیکن فطرت کے قانون کے مطابق یہ مطالبہ قابل عمل نہیں ہے۔ کسی بھی قسم کی حمایت کسی برادری کو سرخرو نہیں کر سکتی۔ اپنے ارکان کو با اختیار بنانے کا واحد راستہ یہ ہے کہ انھیں اس طرح با صلاحیت بنائے جائے کہ وہ پیش آنے والے چیلنجز کا سامنا کر سکیں۔ زندگی کی بنیاد مقابلے اور چیلنجز پر ہے۔ کوئی بھی کمیونٹی بغیر مقابلے اور چیلنجز کا سامنے کیے خوشحال نہیں ہو سکتی ہے۔ اور اس معاملے میں کسی کے لیے استثنا نہیں ہے۔

کیونٹی میں طرف داری کا رجحان افراد کی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتا ہے۔ لیکن جب کوئی کمیونٹی کسی چیلنج کا سامنا کرتی ہے۔ تو یہ اس کے لیے ایک متحرک عنصر ثابت ہوتا ہے۔ شارٹ کٹ ایک

لفظ ہے اور ممکن ہے یہ ڈکٹری میں موجود ہو۔ لیکن شارٹ کٹ کی اصل زندگی کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں ہے۔



عبدالکلام۔۔۔ ایک فلاسفر سائنس دان

انکساری اختیار کریں، آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ زندگی میں ہر قسم کی اعلیٰ کامیابی حاصل کریں۔

بھارت کے سابقہ صدر ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام 7 جولائی 2015 کو تراسی سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ ساری زندگی انہوں نے دیانت داری سے گزاری۔ ان کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے دو الفاظ، دانش اور اخلاق بہت اہم ہیں۔ عقل و دانش کے لحاظ سے وہ ایک سائنسی مزاج کے حامل تھے۔ اور اخلاقی لحاظ سے وہ منکسر المزاج طبیعت رکھتے تھے۔

وہ جنوبی بھارت کے ایک غریب خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان کے لیے ان کی اسکول فیس کا بوجھ بھی محال تھا لیکن انہوں نے سخت محنت کی، اور ساتھ ساتھ اپنی تعلیم بھی جاری رکھی۔ نتیجتاً ان کا شمار ملک کے سب سے زیادہ قابل احترام ایرو اسپیس سائنس دانوں میں ہونے لگا۔

ڈاکٹر عبدالکلام ان لوگوں میں سے نہ تھے جن کے بارے کہا جاتا ہے کہ وہ منہ میں سونے کا چچھ لے کر پیدا ہوئے۔ تاہم وہ اپنے دل میں کام کرنے کا جذبہ لے کر ضرور پیدا ہوئے اور یہی جذبہ ان کی اعلیٰ کامیابی کا باعث تھا۔ اس جذبے نے ان کی مدد کی اور بھارت کے سب سے اعلیٰ عہدے یعنی صدر رات کے منصب پر فائز ہوئے۔ ڈاکٹر عبدالکلام کی زندگی بڑا اہم سبق دیتی ہے۔ کہ لوگوں کی درجہ بندی وسائل رکھنے اور نہ رکھنے والے کے حساب سے کی جاتی ہے جو کہ غیر حقیقی ہے۔ درست درجہ بندی یہ ہے کہ لوگ پوشیدہ صلاحیت رکھتے ہیں یا حقیقی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو نہ رکھنے والے گروپ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اپنی ممکنہ صلاحیتوں کو حقیقت میں بدل سکتے ہیں۔ اس طرح وہ وسائل رکھنے والوں کے درجے میں داخل ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر عبدالکلام نے ایک دفعہ کہا تھا:

”اگر کسی ملک کو کرپشن سے پاک ہونا، اور اعلیٰ دماغ کی قوم بننا ہے۔ تو میں بڑے گہرے احساس کے ساتھ کہوں گا کہ سماج کے تین کلیدی ارکان ہیں جو سماج کو ممتاز کر سکتے ہیں۔ وہ تین ارکان والد، والدہ اور استاد ہیں۔“

اُن کا یہ تجربہ قومی تعمیر کے حوالے سے بالکل درست ہے۔ کیونکہ ایک شخص اپنی شخصیت کو اپنے ابتدائی دور میں تشکیل دیتا ہے جب وہ اپنے والدین اور اساتذہ کے زیر نگرانی ہوتا ہے۔ اگر سماج کے یہ تین بنیادی ارکان بچے کو صالح انسان بنانے کا عزم کر لیں۔ پھر ایک نسل کے دورانہ میں بھارت کی مکمل صورت حال زبردست تبدیلی سے گزرے گی۔

ڈاکٹر عبدالکلام نے کہا کہ نوجوانوں کو میرا خاص طور پر یہ پیغام ہے:

”اُن میں مختلف انداز سے سوچنے کی، کوئی چیز ایجاد کرنے کی، نادیدہ راستوں پر چلنے کی، ناممکن کو ممکن بنانے کی، مشکلات کو تسخیر کرنے اور کامیاب ہونے کی جرات ہونی چاہیے۔ یہ بہت اعلیٰ صفات ہیں ان کے اوپر ضرور عمل کرنا چاہیے۔“

اگر ہم ان صفات کو ایک لفظ میں بیان کریں، تو یہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ نوجوانوں کو اعلیٰ مقاصد کو اپنا ہدف بنانا چاہیے۔ انہیں اپنے اعلیٰ مقاصد کے لیے جدوجہد کے علاوہ کوئی دوسری چیز قبول نہیں کرنی چاہیے۔ اس طرح کرنے سے وہ نہ صرف کامیابی کے عظیم درجے پر پہنچ جائیں گے۔ بلکہ وہ سماج کی تعمیری خطوط پر اصلاح کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر عبدالکلام کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ انتہائی مصروفیات کے باوجود وہ تقریباً ہر روز کچھ نہ کچھ لکھنے کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ یہ بہت ہی تخلیقی عادت ہے اگر ایک شخص اپنے آپ کو دفتری معمولات تک محدود کر لے، تو وہ آہستہ آہستہ عقلی جمود کا شکار ہو جائے گا۔ تاہم اگر کوئی شخص اپنے کام کے ساتھ ساتھ، لکھنے اور پڑھنے کے لیے بھی وقت نکال لے۔ تو اُس کے ذہنی ارتقا کا سفر بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہے گا۔

ایک موقع پر ڈاکٹر عبدالکلام نے کہا: ”بھارت کے پاس دنیا کے لیے ایک پیغام ہے کہ مذہب کو زبردست روحانی قوت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔“ یہ بات بغیر کسی تردد کے حقیقت

پر مبنی ہے۔ کیونکہ بھارت روایتی طور پر اعلیٰ روحانی اقدار کا حامل ملک ہے۔ اگر بھارت روحانیت میں ترقی کرتا ہے تو یقینی طور پر پوری دنیا کے لیے یہ روحانیت کا مینار بن جائے گا۔

جب ڈاکٹر عبدالکلام بھارت کے صدر تھے تو ایک دفعہ کسی صحافی نے انٹرویو شروع کرتے ہوئے انہیں ”جناب عالی“ (Your Excellency) کہہ کر مخاطب کیا تو ڈاکٹر عبدالکلام نے کہا کہ مجھے صرف کلام کہیے۔ ڈاکٹر عبدالکلام کی شخصیت کی روح یہ ہی انکساری تھی۔ وہ انتہائی منکسر المزاج آدمی تھے۔ انہوں نے دوسروں کو جو پیغام دیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ منکسر المزاج بن کر رہو، اس طرح آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ زندگی میں ہر قسم کی اعلیٰ کامیابی حاصل کریں۔



وقت ایک خزانہ ہے

آپ اپنی زندگی کو اچھے طریقہ سے منظم کریں تاکہ آپ وقت کو فائدہ مند استعمال کر سکیں جو کہ آپ کو مختص کیا گیا ہے۔

وقت ہماری سب سے بڑی دولت ہے۔ ہم سب کو اس دولت سے نوازا گیا ہے۔ لیکن ہم میں سے چند ایک ہیں جو اس کا درست استعمال کرتے ہیں۔ کسی نے بالکل درست کہا ہے کہ گمشدہ دولت دوبارہ حاصل کی جاسکتی ہے لیکن گیا وقت ہاتھ نہیں آتا ہے۔ لہذا اپنے وقت کو دانشمندی کے ساتھ استعمال کریں۔

وقت کو ضائع کرنا نادانی کے زمرے میں آتا ہے۔ اگر آپ اپنے وقت کو غیر مفید کاموں میں ضائع کرتے ہیں تو درحقیقت آپ اپنی زندگی ضائع کرتے ہیں۔ آپ کو اپنا وقت ان چیزوں کے لیے استعمال کرنا چاہیے جو آپ کو حقیقی معنوں میں فائدہ دیں۔ وقت ایک خارجی چیز ہے۔ اس کا تعین کیلنڈر کے مطابق ہوتا ہے۔ لیکن وقت کا مناسب استعمال ایسی چیز ہے جو کہ انسان کی اپنی خوبی پر منحصر ہے۔

آپ اپنی زندگی کو اچھے طریقہ سے منظم کریں تاکہ آپ اُس وقت کو فائدہ مند سے

استعمال کر سکیں جو کہ آپ کو مختص کیا گیا ہے۔ ہم سب کے پاس اس دنیا میں محدود وقت ہے۔ اُس کے بعد ہمارا وقت ختم ہو جائے گا۔ اور ہم گزرے وقت کو کبھی واپس نہیں لاسکتے۔ اس لیے ہم کو واضح طور پر وقت کے مناسب اور غیر مناسب استعمال کے بارے میں جانکاری ہونی چاہیے۔ جیسے ہم ممنوعہ اشیا سے دور رہنا چاہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح ہمیں وقت کے ضائع کرنے سے دور رہنا چاہیے۔

وقت کو غلط استعمال کرنے کے حوالے سے آپ کی تشویش آپ کو اس بات میں مدد کرے گی کہ آپ وقت کو وہاں استعمال کریں گے جہاں کرنا چاہیے



خود اعتمادی اچھی ہے

احساس برتری بُری صفت ہے

جن افراد میں انکساری کی صفت نہیں ہوتی، اُن کے کردار میں

ضرورت سے زیادہ اعتماد ایک عام نقص ہے۔

انکساری کی صفت آپ کو حقیقت پسند بناتی ہے۔ منکسر المزاج شخص جانتا ہے کہ وہ اتنا

اہم نہیں ہے جتنا اپنے آپ کو سمجھتا ہے۔

اعتماد ایک اچھی چیز ہے لیکن احساس برتری ایک بُری صفت ہے۔ اعتماد مرد و عورت

دونوں کے لیے بہت اہم اثاثہ ہے۔ لیکن جب کوئی شخص اپنے بارے میں خوش فہمی کا شکار ہو جاتا

ہے۔ تو وہ ایسا خطرہ مول لیتا ہے جنہیں کامیابی سے سر کرنا اُس کے بس میں نہیں ہوتا ہے۔ یہ

طرز عمل قوانین فطرت کے خلاف جنگ کرنے کے مترادف ہے۔

ایک شخص ضرورت سے زیادہ پُر اعتماد کیوں ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ ہے کہ وہ اپنی

صلاحیتوں کے بارے میں ضرورت سے زیادہ تخمینہ لگا بیٹھتا ہے۔ بعض اوقات لوگ اپنی

صلاحیتوں کے بارے میں بہت زیادہ خوش فہم ہو جاتے ہیں۔ اور ایسی صورت حال میں کود پڑتے

ہیں جو ان کے کنٹرول سے باہر ہوتی ہے۔

اس کی تاریخی مثال فرانس کے سابقہ شہنشاہ نپولین بونا پارٹ کا غلط فیصلہ ہے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ناممکن کا لفظ صرف احمقوں کی ڈکٹنری میں پایا جاتا ہے۔ یہ اپنے بارے میں کھلی خوش فہمی تھی۔ جس نے 1812 کے موسم سرما میں اُسے روس پر حملہ کرنے کے لیے اُکسایا۔ روس کی فوج اُس وقت اتنی مضبوط نہ تھی۔ تاہم اُسے فرانسیسی فوج پر ایک فوقیت حاصل تھی کہ وہ موسم سرما کی شدت برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ جب کہ اس علاقے کی شدید سردی فرانسیسی فوج کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔ ناقابل برداشت سردی اُوپر سے شدید ژالہ باری کے باعث فرانسیسی سپاہی ماسکو میں داخل ہونے سے پہلے ہی موت کے منہ میں داخل ہو گئے۔

جرمنی کے آمر حکمران ایڈلف ہٹلر کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ کامیابی تو اُس کا مقدر ہے۔ نتیجتاً وہ اپنے آپ کو ناقابل تسخیر سمجھتا تھا۔ 1941 اپنے اس جنون کے دھوکے میں آکر، اُس نے روس پر حملہ کر دیا۔ اور اس حملہ کے دوران اُس کی فوج ژالہ باری کے طوفان میں گھر کر استالین کے مقام پر تباہ ہو گئی۔ ضرورت سے زیادہ اعتماد انسان کو بد قسمتی کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ اور یہ اعتماد فرد واحد اور قوم دونوں کے لئے مہلک ہو سکتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی بھی اتنا طاقتور نہیں ہے جو اس کے بُرے نتائج کا سامنا کر سکے۔

زندگی خدائی اسکیم کے مطابق، کوئی بھی کامیابی دو خوبیوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اولاً ذاتی منصوبہ بندی دوئم خارجی حالات کی سازگاری۔ کامیابی میں ذاتی منصوبہ بندی کا حصہ پچاس فیصد سے کم ہوتا ہے۔ جب کہ بیرونی حالات و ماحول کا حصہ پچاس فیصد سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کی وجہ ضرورت سے زیادہ اعتماد (Over-confidence) غیر پائیدار ہوتا ہے۔ لوگ اپنی منصوبہ بندی کو اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن اثر انداز ہونے والے بیرونی عناصر کو عموماً نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ مستقبل ہونے والی ترقی دیکھنے کی اہلیت نہیں رکھتے، وہ اپنی غیر حقیقی سوچوں میں خوش رہتے ہیں۔ جو بلا خرمہلک ثابت ہوتی ہے۔ اکثر وہ لوگ ناکامی کا خطرہ مول لیتے ہیں جو اس قسم کی سوچوں میں منہمک رہتے ہیں۔

میں ایک ایسے تعلیم یافتہ شخص کو جانتا ہوں جو کہ پہلا پہل ایک اچھی سرکاری نوکری کر

رہا تھا، بعد ازاں اُسے سیاست میں حصہ لینے کا شوق چڑایا، جس کے نتیجے میں اُس نے سرکاری نوکری سے استعفیٰ دے دیا، اور سیاست کے میدان میں اتر گیا۔
یہ سیاسی مہم اُس کی پہنچ سے باہر تھی لہذا وہ الیکشن ہار گیا۔ نتیجتاً ایک طرف اُس نے گورنمنٹ نوکری سے ہاتھ دھولے دوسری طرف اسمبلی کی سیٹ بھی ہاتھ نہ آئی۔
اب سوال یہ ہے کہ انسان خوش فہمی (Over-Confidence) کے نقص کو کیسے دور کر سکتا ہے۔

اس کا گلیہ بہت سادہ ہے۔ کہ جب بھی آپ کوئی فیصلہ کرنے لگیں تو تجربہ کار لوگوں سے متعلقہ معاملے میں معروضی تبادلہ خیال کریں۔ اور جب یہ ثابت ہو جائے کہ آپ غلط سمت میں جا رہے ہیں تو حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیں۔
جن افراد میں انکساری کی صفت نہیں ہے۔ اُن کے کردار میں اخلاقی نقص غرور (Over-Confidence) عام ہوتا ہے۔ انکساری کی صفت آپ کو حقیقت پسند بناتی ہے۔ منکسر المزاج شخص یہ جانتا ہے کہ وہ اتنا اہم نہیں ہے جتنا اپنے آپ کو سمجھتا ہے۔ عام طور پر اس قسم کے لوگ بڑی احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے صورت حال کے اُن تمام پہلوؤں کا بنظر غائر جائزہ لیتے ہیں۔ جس میں انھیں کام کرنا ہے۔ اور وہ اس بات کا بھی جائزہ لیتے ہیں کہ اُن کے اقدام میں خطرات کس حد تک ہے۔ اُن کی یہ حقیقت پسندانہ رسائی انھیں اس بات کے لیے تیار کرتی ہے کہ وہ اپنی خامیوں کا جائزہ لیں۔ یہ لائحہ عمل بطور ایک منتظم کے اُن کی زندگی میں کردار ادا کرتا ہے۔ اور انھیں ناگوار صورت حال سے روکتا ہے۔

خوش فہمی (Over-Confidence) کے شکار لوگ اپنی سوچوں میں گم رہتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو جانتے ہیں لیکن دوسرے کی زندگی سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ وہ اپنے خول میں بند ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں کے تجربوں سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں۔ اور نہ ہی وہ اپنے اندر جھانکنے کا رجحان رکھتے ہیں۔ اور یہ خامی اُن کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو متاثر کر سکتی ہے۔

نوجوان شخص قانون کو اور عمر رسیدہ آدمی استثنائاً کو دیکھتا ہے۔ معمولی سی تبدیلی کے ساتھ ہم کہہ سکتے ہیں۔ خوش فہم شخص (over-confident) قانون دیکھتا ہے جب کہ خود اعتماد شخص استثنائاً دیکھتا ہے۔ خوش فہمی کے شکار افراد دوسروں کے مقابلے میں زیادہ خطرہ مول لیتے ہیں۔ اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ وہ اس خطرے کو اچھا گمان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، بغیر خطرے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ لیکن خطرات مول لیتے ہوئے ہمیں بڑے حساب سے چلنا چاہیے۔ ورنہ یہ تباہی کا باعث ہو سکتا ہے۔



اختلاف رائے

اختلاف رائے انتہائی مفید عمل ہے۔ جو کسی موضوع کے نئے پہلوؤں کو نہ صرف سامنے لاتا ہے۔ بلکہ اُس کے پوشیدہ زاویوں کو بھی نمایاں کرتا ہے۔

ایک دفعہ میں ایک مغربی اسکالر سے ملا، اور میں نے اُن سے سوال کیا کہ آپ کے خیال میں مغرب کی مختلف شعبوں میں ترقی کا راز کیا ہے۔ اُنھوں نے جواب دیا اس ترقی کا راز اختلاف رائے کی آزادی ہے۔ جو کہ مغرب میں ہر کسی کا مقدس حق سمجھتا ہے۔ بغیر کسی شک و شبہ کے جو کچھ اُنھوں نے کہا وہ بالکل سچ ہے۔ ترقی کا یہ راز صرف مغرب کے ساتھ وابستہ نہیں ہے بلکہ یہ تو قانون فطرت ہے۔

عام طور پر اختلاف رائے تنقید کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ مثال کے طور پر جب کسی موضوع پر دانشورانہ تنقید ہو تو اس کا تجزیہ ہونا چاہیے۔ اور جس جس پہلو پر اختلاف رائے موجود ہے اُس کا مزید مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ تنقید نگار کو معاملات پر کھلے تبادلہ خیال کی سہولت میسر ہونی چاہیے۔ ایسا ماحول ہونا چاہیے کہ مختلف نکتہ نظر کے حامل افراد اکٹھے ہو کر، اخلاص کے ساتھ متعلقہ موضوع پر اپنی اپنی معلومات کا اظہار کریں اور دوسرے کی رائے کے بارے میں اپنے زاویہ نظر کو سامنے لائیں۔ اس طرح کا کھلا تبادلہ خیال ذہنی ارتقا کے لیے لازم ہے۔

جیسے کہ ہم سب جانتے ہیں کہ علم لامحدود ہے۔ یہ بات مذہب اور سیکولر دونوں

معاملات کے لیے درست ہے۔ بلا تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ اختلاف رائے ایک رحمت ہے۔ تاہم اختلاف رائے کے اظہار کے لیے ایک شرط ہے۔ کہ وہ لوگ جو ایک دوسرے کے ساتھ اختلاف کریں انھیں ایسا تسلیم شدہ حقائق کی بنیاد پر کرنا چاہیے۔ اور دوسروں پر الزام تراشی سے دور رہنا چاہیے۔

اختلاف رائے انتہائی مفید عمل ہے۔ جو کسی موضوع کے نئے پہلوؤں کو نہ صرف سامنے لاتا ہے۔ بلکہ اُس کے پوشیدہ زاویوں کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ یہ تخلیقی سوچ کو فروغ دینے میں مدد کرتا ہے۔ اور لوگوں کو یہ موقع بھی دیتا ہے کہ وہ دوسروں کی عقل و دانش کی شراکت سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ اُن سے فائدہ اٹھائیں۔



کوئی دروازہ بند نہیں ہے

کامیابی قسمت کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ جدوجہد کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان تقدیر کا پابند ہے لیکن یہ پابندی قسمت کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ پیدائشی خوبیوں کے حوالے سے ہے۔

بھارت کے مشہور کارٹونسٹ مرحوم آر کے لکشمین (پیدائش ۱۹۲۱) نے ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کر کے جے جے اسکول آف آرٹ بمبئی داخلے کے لیے درخواست دی، اس اُمید کے ساتھ وہ اپنی دلچسپی کے موضوع ڈرائنگ اور پینٹنگ پر پوری توجہ دیں گے۔ لیکن اسکول کے ڈین نے انھیں لکھا کہ آپ کی ڈرائنگ میں اُس ٹیلنٹ کی کمی ہے کہ جس کی بنیاد پر آپ کا داخلہ بطور ایک طالب علم کے ہمارے ادارے میں کیا جائے۔ اور داخلہ دینے سے انکار کر دیا۔

یہ لکشمین کے لیے انتہائی ناگوار تجربہ تھا۔ لیکن وہ دل برداشتہ نہ ہوا۔ انھوں نے دوبارہ کوشش کرنے کا فیصلہ کیا، اور آخر کار بیچلر آف آرٹ کی سند میسور یونیورسٹی سے حاصل کی۔ پھر انھوں نے بطور کارٹونسٹ اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز کیا۔ بعد ازاں وہ دی ٹائمز آف انڈیا سے منسلک ہو گئے۔ اُن کی کامیابی کا دور پچاس سالوں پر محیط ہے۔

یہ مثال ایک بڑا سبق سکھاتی ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ ایک انسان ایک اچھے ٹیلنٹ کے ساتھ پیدا ہو سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اُس کا ٹیلنٹ اُس کے ابتدائی سالوں میں نمایاں ہو جائے۔ لہذا انسان کو اس قول کو اختیار کرنا چاہیے 'کوشش، کوشش اور پھر کوشش'۔ اس طرح یہ عین ممکن ہے کہ انسان وہ عہدہ حاصل کر لے جو کہ دوسروں کی رائے میں اُس کے لیے جوانی میں ناقابل تصور تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام مرد و عورت زبردست پوشیدہ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ صلاحیتیں مستور حالت میں رہتی ہیں۔ انسان صرف اپنی سنجیدہ جدوجہد سے انہیں آشکارہ کر سکتا ہے۔ یہ قانون قدرت ہے۔ اور انسان یہ سوچنے کے بجائے کہ لوگ اُس کے بارے میں کیا کہتے ہیں، قانون قدرت پر بھروسہ کرے۔ تقریباً جتنے بھی بڑے بڑے کارنامے کرنے والے ہیں لوگوں نے شروع میں اُن کی صلاحیتوں کا غلط اندازہ لگایا۔ حتیٰ کہ اپنے غلاموں کی صلاحیتوں کا اندازہ لگانے میں ٹھوکریں کھائیں۔

کئی ایسی مثالیں ہیں جن میں ایک آدمی کو اُس کی ابتدائی عمر میں رد کر دیا گیا لیکن اُس نے ہمت نہ ہاری، اپنی جدوجہد جاری رکھی، حتیٰ کہ وہ کامیابی کی چوٹی پر پہنچا۔ اس میں بہت سے لوگ ہیں جو اس طریقے سے رد کیے گئے۔ تاہم ان لوگوں میں فرق یہ ہے کہ کچھ نے کامیابی سے اپنی ممکنہ صلاحیتوں کو آشکارہ کر لیا۔ اور بڑی کامیابی حاصل کرنے والے بن کر ابھرے۔ جب کہ دوسرے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی صلاحیتوں کو نہ پہچانا نتیجتاً انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

کامیابی اور شکست انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ ہر کوئی یہاں پیداؤشی طور پر کامیاب ہے حتیٰ کہ وہ بھی جن کو معذور کہا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ ذرہ مختلف قسم کی قابلیت رکھتے ہیں۔ کامیابی قسمت کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ جدوجہد کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان تقدیر کا پابند ہے لیکن یہ پابندی قسمت کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ پیداؤشی خوبیوں کے حوالے سے ہے ہر کوئی یہاں مختلف خوبیوں کے ساتھ پیدا ہوا ہے۔ یہ انسان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اُن خوبیوں کو دریافت کرے جن سے خدا نے اُسے نوازا ہے۔ جب وہ انہیں دریافت کر لے گا، تو وہ کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن اگر وہ انہیں دریافت کرنے میں ناکام ہو گیا، تو وہ ماسوائے شکست کے اور کسی

چیز کی توقع نہیں کر سکتا۔

یہ حقیقت ہے کہ یہاں ناکامی سے زیادہ کامیابی کے مواقع ہیں۔ اور کسی بھی قسم کے شکستہ حالات کامیابی کے موقعوں کو ضائع نہیں کر سکتے۔ ہر ناکامی زیادہ کامیابی کے مواقع مہیا کرنے کی باعث بنتی ہے۔ زندگی کی اس حقیقت کو دریافت کریں۔ تو آپ کبھی بھی دل برداشتہ نہ ہوں گے۔ آپ کبھی نہیں محسوس کریں گے کہ آپ ایک بندگلی میں آگئے ہیں جہاں آگے جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ قانون فطرت کے مطابق ہر ڈوبتی شام ایک خاموش پیغام دے کر جاتی ہے کہ بہت جلد نیا سورج طلوع ہوگا۔ یہ حقیقت صرف فزیکل دنیا کے لیے ہی سچ نہیں ہے بلکہ یہ انسانی زندگی کے لیے بھی سچ ہے۔

کامیابی پچاس فیصد اپنی محنت کا ثمر ہوتی ہے جب کہ پچاس فیصد اپنے ممکنہ صلاحیتوں کو بروکار لانے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جب بلاخر آپ اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح جان لیتے ہیں۔ پھر آپ کامیابی کے راستے پر چل نکلتے ہیں۔ بند دروازے کی اصطلاح اصل زندگی میں نہیں، بلکہ صرف ڈکشنری میں مل سکتی ہے۔ کامیابی اور ناکامی انسان کی اپنے شعور و آگہی کا حاصل ہوتی ہے۔

☆☆

قانونی حقوق سے بھی زیادہ

خود کا بااختیار بنانے کا انتخاب کریں۔ آپ جو دوسروں سے توقع کر سکتے ہیں یقیناً اُس سے کہیں زیادہ آپ حاصل کریں گے۔

1920 کی دہائی میں بھارت کے مشہور ریاضیاتی طبیعیات دان ستندر ناتھ بوس (1894-1974) اپنے کو اٹم میکینکس پر کام کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ وہ ایک سخت محنت کرنے والے طالب علم کی حیثیت سے مشہور تھے۔

اُن کے طالب علمی کے واقعات میں سے ایک واقعہ ہمارے لیس ایک بڑا اہم سبق رکھتا ہے جب وہ کلکتہ کی جامعہ میں ایم ایس سی کر رہے تھے، اُنھوں نے ایک دفعہ ریاضی کے امتحان

میں بہت اعلیٰ کارکردگی دکھائی۔ جس کے صلہ میں اُن کو سو (100) میں سے ایک سو دس (110) نمبر دیئے گئے انھیں جو اضافی دس نمبر دیئے گئے اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے ایک پیچیدہ سوال کو ایک سے زیادہ طریقوں سے حل کیا تھا۔ ہمارے لیے انتہائی اہم سبق اس واقعہ میں پوشیدہ ہے۔ کہ اگر کوئی شخص اپنی قابلیت و مہارت کو ثابت کرتا ہے۔ تو اُسے جو صلہ ملتا گا وہ عام صلہ کے مقابلے میں زیادہ ہوگا۔ اس لیے دنیا میں شکایت اور احتجاج کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ تمام لوگ جو اپنے حقوق حاصل کرنے کی مہم رائٹ ایکٹوزم میں سرگرم ہیں وہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ رائٹ ایکٹوزم کے بجائے مواقع ایکٹوزم میں سرگرم ہونا اُن کے لیے بہتر انتخاب ہے۔ انھیں چاہیے کہ لوگوں کو بتائیں۔ کہ اپنے حقوق کے لیے صدا احتجاج بلند کرنے کے بجائے بہتر سے بہتر کام کرنے کی کوشش کریں۔ نتیجتاً آپ یقینی طور پر اُس سے زیادہ حاصل کریں گے جتنا آپ کا استحقاق تھا۔

تمام مرد و عورت خدائی تحائف یعنی پوشیدہ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ آپ ان تحائف کو دریافت کریں اور انھیں استعمال کریں اور اپنی مستور استعداد کو حقیقت میں بدل دیں۔ آپ اعلیٰ کامیابیاں حاصل کرنے والے بن کر ابھریں گے۔ آپ اپنے مستقبل کو اپنی محنت و ریاضت سے خود تشکیل دے سکتے ہیں۔ اپنے آپ کو معاشرے سے کچھ لینے والا رکن بنانے کے بجائے کچھ دینے والا رکن بنئے

اپنے حقوق کے لیے سوال کرنا بھیک مانگنے کے مترادف ہے۔ جب آپ اتنی زبردست چھپی قابلیت کے مالک ہیں۔ تو پھر آپ بھیک مانگنے کا انتخاب کیوں کرتے ہیں۔ بہت سی نام نہاد باختیار (Empowerment) بنانے کی تحریکیں ہیں جیسے مسلم ایمپاورمنٹ، وین ایمپاورمنٹ، اکنامکس ایمپاورمنٹ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن سب سے اعلیٰ ایمپاورمنٹ اصل میں سیلف ایمپاورمنٹ ہے۔

خود کو باختیار بنانے کا انتخاب کریں۔ آپ جو دوسروں سے ملنے کی توقع کرتے ہیں یقیناً اُس سے کہیں زیادہ آپ حاصل کریں گے۔ ہر شخص اعلیٰ انسان (Superman) بن سکتا ہے بشرطیکہ وہ قانون فطرت کو دریافت کرے اور اپنی زندگی پر اُسے نافذ کرنے کی بہترین کوشش

کرنے۔



اپنی ذات کا مطالعہ

ایک شخص کے لیے اپنے آپ کو دریافت کرنے کا قدرتی راستہ اپنی ذات کا مطالعہ ہے۔ جب وہ اس طریقہ سے اپنے آپ کو دریافت کر لیتا ہے۔ تو پھر اُس کو کسی دوسری طرف توجہ مبذول نہیں کرنی چاہیے۔

ہر کوئی امتیازی خصوصیات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ یہ خصوصیات اُس کو امکانی صورت میں دی گئی ہوتی ہیں۔ یہ ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ ان امکانی خصوصیات کو دریافت کرے اور دانشمندانہ منصوبہ بندی سے انہیں حقیقت میں بدل دے۔ ہر ایک سے معاشرے میں بہادرانہ کردار مطلوب ہوتا ہے۔ لیکن کوئی بھی شخص یہ کردار اُس وقت ادا کر سکتا ہے جب وہ اپنی بے نظیر صلاحیت دریافت کر لے اور با مقصد پلاننگ سے اس کے اظہار کی کوشش کرے۔

جہاں انسان کو بے مثال خوبیوں سے نوازا گیا ہے وہاں اُسے ایک بے مثال دماغ بھی دیا گیا ہے اگر وہ اپنی ذات کا مطالعہ کرے اور اپنے دماغ کو با مقصد طریقے سے استعمال کرتے ہوئے اپنی خاص خوبی کو دریافت کر لے۔ تو پھر وہ یقینی طور پر معاشرے میں اپنا خاص کردار ادا کرنے کا اہل ہو جائے گا جو کہ اُس کے لیے مخصوص ہے۔

یہ کام کرنے کے لیے، انسان کو تعصب، اضطراب، جوابی رد عمل کی سوچ سے بچنا پڑتا ہے اُسے احساس برتری یا کمتری، اپنے بارے میں زیادہ یا کم اندازہ لگانا، خارجی عناصر کو اجازت دینا کہ وہ دماغ کی کنڈیشننگ کرے جیسے تمام منہی عوامل کو اپنے آپ سے روکنا پڑتا ہے۔ جو شخص بھی مذکور منہی سرگرمیوں سے اپنے آپ کو بچالے گا۔ وہ سچ مچ اپنی مختص شدہ خوبی کو دریافت کر لے گا۔ اور اپنے وقت کا ہیرو بن کر سامنے آئے گا۔ ان داخلیوں سرگرمیوں سے قطع نظر، انسان کے پاس خارجی دنیا میں معاونت کرنے والا عنصر بھی ہوتا ہے۔ یہ معاونت کرنے والا عنصر میرٹ بیسڈ (marit-based) معاشرہ ہوتا ہے۔ میرٹ بیسڈ معاشرے میں، فطری عمل شروع ہوتا

ہے۔ جس کو ہم آٹو بیگ چینلریشن کا عمل کہہ سکتے ہیں۔ جب انسان زندگی کا سفر شروع کرتا ہے۔ اُس کے سامنے کئی راستے کھلے ہوتے ہیں۔ وہ کوئی پیشہ اختیار کر سکتا ہے، لیکن جلد ہی اُسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس میں اتنا کامیاب نہیں ہے پھر وہ کوئی دوسرا انتخاب کرتا ہے۔ جب وہ یہاں بھی پہلے جیسے تجربے سے گزرتا ہے، پھر وہ اپنا پیشہ تبدیل کرے گا۔ حتیٰ کے اپنا انتخاب اُس وقت تک تبدیل کرتا رہے گا جب تک وہ یہ نہ محسوس کرے کہ وہ اس نئے پیشہ میں کامیاب ہے۔ اور جس کے لیے معاشرہ اُسے وہ کچھ دے گا جس کا وہ حق دار ہے۔ پھر وہ اپنے کردار کے ساتھ منسلک ہو جائے گا۔ اور اپنی توانائیاں اس کے لیے وقف کر دے گا حتیٰ کہ وہ ایک ہیرو بن کر ابھرے گا۔ اس لحاظ سے معاشرہ ہر انسان کے لیے حمایت کرنے والا عنصر بن جاتا ہے۔ اور ہر انسان کی توانائیوں کو اُس راستے پر لگاتا ہے جس کے لیے وہ پیدا ہوا ہے۔

مددگار عناصر کے مناسب طور پر کام کرنے کے لیے شرط یہ ہے۔ کہ معاشرے میں کسی کی ناجائز حمایت یا ناجائز تحفظ فراہم نہ کیا جائے۔ بلکہ ایک مقابلے کا ماحول ہو۔ انسان کو یہ بات واضح طور پر باور ہونی چاہیے کہ وہ میرٹ کے بغیر کوئی عہدہ حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ وہ طریقہ ہے جس کے لیے میں نے آٹو بیگ چینلریشن کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یہ ایک خود کار عمل کی شکل ہے۔

ہر انسان اس خواہش کے ساتھ پیدا ہوتا ہے کہ وہ معاشرے میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو۔ عدم اطمینان ہر انسانی شخصیت میں پیدائشی طور پر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے، جب ایک شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے منتخب کردہ پیشہ وار نہ راستے میں کامیاب نہیں ہے۔ تو اُس کی عدم اطمینان والی فطرت اُسے دوسرے انتخاب کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ یہ قدرتی طریقہ کار انسان کو اُس کردار کی طرف لے جاتا ہے جس کے لیے وہ پیدا ہوا ہے۔ اگر اس عمل کو مسلسل درست سمت میں جاری رہنے کی اجازت دی جائے۔ پھر ہر آدمی بطور ایک ہیرو کے نمودار ہوگا اور یہ اجتماعی سطح پر بڑی اعلیٰ سماجی ترقی کا ذریعہ بن جائے گا۔

ہیرو جیسی شخصیت کی تعمیر کرنے، اور بہتر معاشرے کو تشکیل دینے کے لیے فطرت کے راستے کی پیروی کرنی بہت ضروری ہے۔ فرد واحد کے لیے، اپنے آپ کو دریافت کرنے کا قدرتی

راستہ اپنی ذات کا مطالعہ ہے۔ جب وہ اس طریقہ سے اپنے آپ کو دریافت کر لیتا ہے۔ تو پھر اُسے کسی دوسری طرف توجہ مبذول نہیں کرنی چاہیے۔ اور اس معاملے میں اُسے کوئی عذر نہیں تراشنا چاہیے۔ اس کے لیے اُس کو ہر قسم کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اُسے کسی شخص کو اجازت نہیں دینی چاہیے کہ وہ اُسے احکامات جاری کرے۔ بلکہ بغیر کسی قسم کی لچک کے، اُس کا اپنی شخصیت کی دریافت کے عمل کو پورے جذبے کے ساتھ جاری رکھنا چاہیے۔

دوسری ذمہ داری نظام (System) کی ہے یہ نظام کا فرض ہے۔ کہ معاشرے کو میرٹ کی بنیاد پر آگے بڑھنے کے لیے راہ ہموار کرے۔ اور معاشرے کو صرف میرٹ کی بنیاد پر تمام مواقع ہر کسی کے لیے کھول دینے چاہئیں۔

☆☆

جنریشن گیپ

اگر موجودہ نسل اپنی جدید ذہنیت کی وجہ سے سینئر نسل کے نصاب سے منہ موڑ لیتی ہے تو اس کے ذمہ دار سینئر نسل بھی ہے کہ اُس میں یہ اہلیت نہیں ہے کہ وہ اپنے نصاب کو ایسی زبان میں نئی نسل تک پہنچا سکے جو اُن کے لیے قابل فہم ہو۔ اور جدید ذہنیت اُس کو قبول کرے۔

سرکاری نوکری کے قوانین میں ایک شق ہے جس کو بریک ان سروس کہا جاتا ہے۔ اگر ایک سرکاری ملازم بغیر چھٹی لیے ڈیوٹی سے ایک یا ایک سے زیادہ دن غیر حاضر رہے تو جتنے دن وہ غیر حاضر رہا اتنے دن اُس کی سروس میں وقفہ (Break) آجاتا ہے۔ جتنے دن وہ غیر حاضر رہا اتنے دن اُس کی کل سروس میں سے منہا کر دیے جاتے ہیں۔

اسی طرح اس قانون کا اطلاق کسی بھی شخص پر ہو سکتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص کاروبار شروع کرتا ہے پھر اُسے ترک کر کے کسی دوسرے کاروبار میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ پھر اسے بھی چھوڑ چھاڑ کر کسی تیسرے کاروبار میں قسمت آزمائی کرتا ہے۔ یہ اس طرز عمل کو ہم بریک ان ہسٹری کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ ماہر نفسیات ایسے لوگوں کے بارے میں گراس ہوپر مائنڈ (Grasshopper mind) کی اصطلاح استعمال کہتے ہیں۔ یعنی وہ اپنی توجہ ایک نکتہ

پر مرکوز کرنے کے صلاحیت نہیں رکھتے ہیں اُن کی توجہ غیر متوقع طور پر ایک جگہ سے دوسری جگہ بدکتی رہتی ہے جو لوگ اپنی تاریخ کو یوں پارہ پارہ کرتے ہیں۔ وہ زندگی میں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ آپ کی تاریخ آپ کا سب سے بڑا اثاثہ ہے۔ اور بریک ان سروس یا بریک ان ہسٹری آپ کو اپنے قیمتی اثاثے سے محروم کر دیتی ہے۔

ایک اور بریک بھی ہے جس کا چرچا ساری دنیا میں بریک ان جنریشن یا جنریشن گیپ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ گذشتہ صدیوں میں یہ عام طریقہ کار تھا کہ پہلی پیڑی (Senior Generation) اپنی اگلی نسل کو اپنے تجربات سے مستفید کیا کرتی تھی۔ یہ بہت صحت مند اور سبق آموز طریقہ کار تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آج نوجوان نسل تعلیم سے آراستہ ہے لیکن ناتجربہ کاری کی وجہ سے وہ بہت آسانی سے بہک جاتی ہے۔ ماضی میں والدین یا خاندان کے بڑے بوڑھے گھر میں موجود ہوتے تھے گو کہ اب بھی ہیں۔ یہ بزرگ نئی نسل کو اپنے تجربات کے بارے بتایا کرتے تھے۔ تاکہ وہ زندگی میں سیدھے راستے پر چلیں۔ لیکن آج دور جدید اور غیر فطری نظریہ آزادی (Freedom) کی وجہ سے نئی نسل بزرگوں کے مشورے ماننے سے ہچکچا رہی ہے۔

اُن کے اندر یہ رویہ پنپ چکا ہے کہ ”ہم سب کچھ جانتے ہیں اور ہم اپنی قسمت کے خود مالک ہیں ہمیں علیحدہ کھڑا ہونا چاہیے“۔ ساری دنیا میں، نئی نسل کے متوازن ذہنی ارتقا کی راہ میں، اس قسم کی نفسیات ایک رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گئی ہے نئی نسل پرانی نسل کے تجربات سے بغیر مستفید ہوئے زندگی کی دوڑ میں شریک ہو رہی ہے۔ یہ تجربات ہیں جو آپ کو پختگی اور سنجیدگی دیتے ہیں۔ اس صورت حال میں تمام نئی نسل غیر پختہ اور غیر سنجیدہ ہے۔ اور نتیجہ تباہ کن ہے۔ مثال کے طور پر ہم شادی کے ادارے کو لیتے ہیں۔ عصر حاضر میں یہ ادارہ بہت کمزور ہو گیا ہے۔ شادی کے بعد میاں بیوی یا تو ٹینشن میں رہتے ہیں یا علاحدگی اختیار کر کے شادی کا بندھن توڑ دیتے ہیں۔

زمانہ حاضر میں شادی کا ادارہ اتنا کمزور کیوں ہو گیا ہے؟ جبکہ ماضی میں یہ بہت مضبوط تھا۔ اس کی وجہ بہت سادہ سی ہے۔ کہ گذشتہ زمانے میں شادی ایک ایڈجسٹمنٹ کا معاملہ تھا جبکہ نئی

نسل شادی کی اس اہمیت سے انکاری ہے۔ گذشتہ نسلوں کے تجربات سے مستفید نہ ہونے کا یہ نتیجہ ہے کہ نئی نسل شادی کی افادیت کے حوالے سے کچھ نہیں جانتی ماسوائے محبت (Love)۔ اور یہ حقیقت ہے کہ سماجی زندگی میں جذبات کے مقابلے میں ایڈجسٹمنٹ اہمیت رکھتی ہے۔

اگر جنریشن گیپ نہ ہوتا، تو نئی نسل کی شادیاں بھی اسی طرح کامیاب ہوتیں جیسے پرانی نسلوں کی ہوئیں ہیں۔ آج کل کے دور میں بطور ایک قانون اس مسئلہ میں بہت زیادہ استثناء نہیں ہے۔ اس رجحان نے جدید معاشرے کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ مندرجہ بالا مثال اس کے تباہ کن نتائج کی طرف دھکیلتی ہے۔

جنریشن گیپ ہماری دنیا کا ایک بہت سنجیدہ مسئلہ ہے۔ لیکن اس کے لیے صرف نئی نسل کو ہی مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ اس جنریشن گیپ کی پرانی نسل بھی ذمہ دار ہے۔ دونوں نسلیں نصف نصف قابل مواخذہ ہیں۔ اس میں شک نہیں ہے کہ عمر رسیدہ لوگ کے پاس تجربات ہیں۔ لیکن ان میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اپنے تجربات اُس زبان میں بیان کریں جو نئی نسل کے لیے قابل فہم ہوں۔ پھر یہ بات سامنے آتی ہے دونوں نسلوں کے درمیان اصل مسئلہ جنریشن گیپ کا نہیں بلکہ زبان کے گیپ کا ہے۔

پرانی لوگ صرف روایتی اندازے گفتگو جانتے ہیں۔ جب کہ نئی نسل جس گفت و شنید سے واقف ہے اُن کے خیال میں وہ زیادہ منطقی ہے۔ بزرگ نسل کے لوگ بغیر استدلال کے اپنے مشورے من پسند طریقے سے دیتے ہیں۔ وہ صرف یہ کہہ کر وہی زبان جانتے ہیں۔ جب کہ عصر حاضر کی نسل صرف وہ زبان سمجھتی ہے جس میں استدلال کی قوت ہے۔ لہذا اگر نئی نسل اپنی جدید ذہنیت کی بنیاد پر اپنے سینئر کے تجربات سے فائدہ اٹھانے میں ناکام ہوئی، تو سینئر بھی اس خلا کے ذمہ دار ہیں۔ کیونکہ انھوں نے بھی وہ صلاحیت اپنے اندر پیدا نہیں کی، جس کی بنا پر وہ اپنے نصائح زیادہ قابل فہم زبان میں نئی نسل کو منتقل کرتے، اور نئی نسل زیادہ توجہ سے انھیں قبول کرتی۔ تو اس جنریشن گیپ کی دونوں نسلیں ذمہ دار ہیں۔



جہالت کوئی عذر نہیں ہے

کبھی بھی ناقابل حصول چیز کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو۔ آپ کو سب سے پہلے صورت حال کا جائزہ لینا چاہیے۔ تمام معاملہ کو استدلال کی کسوٹی پر جانچیں۔ پھر اپنی پوزیشن اور ساتھ ساتھ دوسروں کے موقف سامنے رکھتے ہوئے بہترین لائحہ عمل تیار کریں

قول ہے کہ قانون کو توڑنے کے لیے قانونوں سے لاعلمی کا عذر قابل قبول نہیں ہے (Ignorance of law is no excuse)۔ ظاہری طور یہ قول صرف قانونی معاملات سے متعلق ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ ایک عام قانون ہے۔ جس کا اطلاق ہر طرح کی صورت حال پر ہوتا ہے۔ ریاستی پالیسی بنانے سے لے کر ریل میں اپنی سیٹ مخصوص کروانے تک سب اس قول کے زمرے میں آتے ہیں۔

مثال کے طور پر آپ کسی کمپنی میں نوکری کرتے ہیں کسی نہ کسی بنا پر آپ کا اپنے باس (Boss) کے ساتھ کوئی سنجیدہ تنازعہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور وہ آپ کے خلاف کوئی سخت کارروائی کرتا ہے۔ اس صورت حال میں آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ کو اندازہ نہ تھا کہ باس میری بات کو اتنی سنجیدگی سے لیں گے۔ جب آپ کمپنی میں کام کرتے ہیں تو آپ کو یہ اصول معلوم ہونا چاہیے ”باس ہمیشہ درست ہوتا ہے (Boss is always right)۔“

اگر آپ کوئی کاروبار کر رہے ہیں۔ اور آپ کا اپنے گاہکوں کے ساتھ رویہ بہت ناروا ہے اور اس کے نتیجے میں آپ کا کاروبار ٹھپ ہو جاتا ہے۔ پھر آپ یہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ مجھے علم نہ تھا کہ میرا رویہ میرے گاہکوں کو ناگوار کر رہا ہے۔ آپ کو شروع ہی سے سمجھنا چاہیے تھا کہ کاروبار میں کامیابی کے لیے کسٹمر فرینڈلی (Customers friendly) رویہ لازمی ہے۔

یہ بات سیاسی سرگرمیوں کے لیے بھی سچ ہے۔ اگر آپ ایک جمہوری ملک کے صدر ہیں۔ تو پھر آپ رائے عامہ یا حزب اختلاف کے موقف کھلی طور پر رد نہیں کر سکتے۔ اگر آپ کوئی پالیسی اپناتے ہیں اور وہ پوزیشن کی بھرپور مخالفت کی وجہ سے ناکام ہو جاتی ہے۔ تو آپ اپنے مخالفین سے شکایت کناں نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ بہر حال آپ جمہوری دور میں رہ رہے ہیں۔ حتیٰ کہ

اگر آپ ملک کے صدر بھی ہیں پھر بھی آپ کے پس مطلق العنان اختیارات نہیں ہیں۔ آپ کو زمینی حقائق کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ آپ کو پیشگی جاننا پڑتا ہے کہ سیاست ممکنات کا فن ہے۔ یہ اصول بہت عام ہے۔ اس لیے زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسے ایک فرد واحد کے لیے درست ہے اسی طرح یہ معاشرتی اور سیاسی معاملات کے لیے بھی درست ہے۔ یقیناً اگر آپ کو اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ تو آپ اپنے نظریات اپنانے کے حوالے سے با اختیار ہیں۔ لیکن جب آپ کچھ ایسا کرنا چاہتے ہیں۔ جس کے اثرات سیاسی یا سماجی زندگی پر مرتب ہوں، تو پھر آپ کو عملی (Practical) بننا پڑے گا۔

کبھی بھی ناقابل حصول چیز کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ آپ کو سب سے پہلے صورت حال کا جائزہ لینا چاہیے۔ تمام معاملہ کو استدلال کی کسوٹی پر جانچیں۔ پھر اپنی پوزیشن اور ساتھ ساتھ دوسروں کے موقف سامنے رکھتے ہوئے بہترین لائحہ عمل تیار کریں، اور تمام صورت حال کا جائزہ لے کر منصوبہ بندی کریں۔ ایک چینی کہاوت ہے کہ آپ کو اپنا سفر وہاں سے شروع کرنا چاہیے۔ جہاں سے ہر قدم آگے کی طرف اٹھے۔

☆☆

اپنی غلطی کو نفع بخش غلطی بنائیں

ایک غلطی اُس وقت نفع بخش غلطی بنتی ہے جب وہ آپ کو ذہنی بیداری دے۔ یہ ذہنی بیداری آپ کو یہ صلاحیت دیتی ہے کہ آپ اپنی زندگی کا پلان از سر نو ترتیب دیں۔ نفع بخش غلطی انسان کو سپر مین (Superman) بنا دیتی ہے۔

انگریز شاعر الیگزینڈر پوپ (1688-1744) اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں۔ کہ غلطی کرنا انسان کا خاصا ہے اور معاف کر دینے اللہ کا خاصا ہے۔ اُن کی نظم کا یہ مصرعہ اب ایک کہاوت کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر کوئی غلطی کرتا ہے۔ کیونکہ یہ انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ تاہم غلطیاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ اولاً عام غلطی ثانیاً نفع بخش غلطی۔ پہلی قسم کی غلطی سے آپ کچھ حاصل نہیں کرتے ہیں۔ لیکن نفع بخش غلطی آپ کو بہت سی چیزیں دے جاتی ہے۔ کیونکہ

نفع بخش غلطی شروع میں ایک غلطی لگتی ہے۔ لیکن آخر میں یہ فائدہ مند تجربہ بن جاتی ہے۔
جب کوئی غلطی کرتا ہے تو اُس کے دو طرح کے رد عمل ہو سکتے ہیں۔ پہلا رد عمل تو یہ ہے
کہ وہ اپنی غلطی پر پچھتاوا محسوس کرے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو کوئی پچھتاوے گا وہ ہر غلطی
کے بعد دل برداشتہ ہوتا جائے گا۔ وہ ذہنی دباؤ کا شکار ہوگا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حوصلہ چھوڑ کر مزید
کچھ نہ کرنے کے قابل ہی نہ رہے۔

یہ غلطی کرنے کا منفی پہلو ہے۔ لیکن غلطی کا ایک مثبت رخ بھی ہے۔ کہ آپ اپنا محاسبہ
کرنے اور اپنی صلاحیتوں کا ازسرنو جائزہ لینے کی حوصلہ افزائی کریں۔ جب آپ خود اپنا محاسبہ
کریں گے اور اپنی صلاحیتوں کی جانچ پرکھ کرتے رہیں گے، تو آپ کی یہ غلطیاں نہ صرف فائدہ
بخش بن جائیں گی۔ بلکہ آپ کے دماغ کو متحرک کرنے کی پابند بھی ہوں گی۔ یہ دماغ میں نئے
خیالات کا طوفان (Brainstroming) برپا کر دیں گی۔ اور آپ کے اندر قدرت کی ودیعت
کردہ صلاحیت بن کر نمودار ہوں گی۔ یہ آپ کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کی تفکیری عمل
(Thinking Process) کو تیز کریں گی۔ اور آپ کی صلاحیتوں کے بارے میں بہتر تعین
نو اور چیزوں کا تجزیہ کرنے کی قابلیت میں اضافے کا باعث بن سکتی ہے۔ ایک غلطی اُس وقت نفع
بخش غلطی بنتی ہے جب وہ آپ کو ذہنی بیداری دے۔ یہ ذہنی بیداری آپ کو اپنی زندگی کا پلان
ازسرنو ترتیب دینے کی صلاحیت دیتی ہے۔ اس لیے نفع بخش غلطی انسان کو سپر
مین (Superman) بنا دیتی ہے۔

فطرت کا انسان کے لیے سب سے بڑا تحفہ ذہن ہے۔ دوسرے الفاظ میں ذہن
فطرت کا سب بڑا معجزہ ہے۔ جرمن ماہر نفسیات دان الفریڈ ایڈلر نے ایک دفعہ کہا تھا: ”انسان کی
حیرت انگیز صلاحیتوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ منفی کو مثبت میں بدلنے کی طاقت رکھتا ہے۔“ اب
سوال یہ ہے کہ یہ معجزہ کیسے ظہور پذیر ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایک شخص غلطی کرتا ہے
اور اپنے آپ کو منفی سوچ کا شکار ہونے سے محفوظ رکھتا ہے۔ پھر قدرتی طور پر معجزانہ واقعہ رونما ہوتا
ہے۔ جس کی وجہ قانون فطرت کے تحت ازسرنو تفکیری عمل انسان کے اندر شروع ہو جاتا ہے۔ اور
وہ تجزیہ کرتا ہے کہ اُس کے ساتھ کیا واقعہ ہوا۔ وہ یہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے کہ اُس نے کہاں غلطی کی

تھی۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ اپنی دوسری کوشش میں کیسے وہ چیز حاصل کرے جو وہ پہلی کوشش میں حاصل نہ کر سکا۔ اس طریقے سے انسان کے ذہن میں از سر نو فکری عمل شروع ہوتا ہے، جو کہ اُس کے ذہنی ارتقا کا باعث بنتا ہے۔ اس طرح یہ عمل اُس کی غلطی کو نفع بخش غلطی بنا دیتا ہے۔

غیر دانشمندانہ فیصلے کے نتیجے میں غلطی ایک بھول چوک یا خرابی ہے۔ اگر آپ مثبت ذہن ہیں، تو آپ کی غلطی آپ کو یہ معلوم کرنے کی تحریک دے گی کہ آپ کہاں غلط ہیں۔ اس طرح سے غور فکر کرنا آپ کے لیے ممکنات کی نئی راہیں کھول دے گا۔ اس طرح بلا واسطہ طور پر آپ کی غلطی آپ کی زندگی میں نئی کامیابیوں کی بلندیاں سر کرنے کا ذریعہ بن جائے گی۔

غلطی کو نفع بخش غلطی میں تبدیل کرنے کی شرط یہ ہے کہ انسان کے لیے غلطی فل اسٹاپ نہ بنے، بلکہ انسان غلطی کو ما (،) کی طرح لے۔ اگر انسان دس دفعہ غلطی کرتا ہے تو اُسے ہر غلطی کے بعد ایک کو مالگا دینا چاہیے لیکن کبھی بھی فل اسٹاپ نہیں لگانا چاہیے۔ حتیٰ کہ غلطی نفع بخش غلطی میں تبدیل ہو جائے۔

یاد رکھیں اس دنیا میں غلطی کا حجم محدود ہے۔ لیکن کامیابیوں کا حجم لامحدود ہے۔ کوئی بھی غلطی آپ کی کامیابیوں کا دروازہ بند نہیں کر سکتی، بشرطیکہ آپ اپنی سوچوں کو مثبت خطوط پر قائم رکھیں۔



دوسرا انتخاب ہمیشہ وہاں موجود رہتا ہے

اگر آپ پہلی کوشش میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ تو اس ناکامی کو اختتام نہ سمجھیں۔ بلکہ یہ آپ کے لیے اشارہ ہے کہ ابھی ایک اور بہترین موقع آپ کا منتظر ہے۔

نریندر دامودار داس مودی سولہواں جنرل الیکشن جیت کر بھارت کے وزیر اعظم بنے۔ الیکشن مہم کے دوران ذرائع ابلاغ میں ایسے واقعات رپورٹ کیے گئے۔ جیسا کہ پانچ مئی ۲۰۱۴ ایٹھی میں ایک الیکشن ریلی کے دوران مودی صاحب نے کہا:

”لوگ کہتے ہیں کہ مودی ہار جائے گا تو کہاں جائے گا۔ تم فکر مت کرو۔ میری چائے بنانے کی

کتیلی تیار ہے“

وزیراعظم کی گفتگو کا یہ پہلو بھارت کی طاقت کا اظہار ہے۔ جہاں ایک شہری معمولی سی شروعات سے بلند ترین عہدے پر پہنچ سکتا ہے۔

دوسرے پہلو اس کا یہ ہے۔ کہ ابتدائی طور پر ممکن ہے مندرجہ بالا بیان بڑا مضحکہ خیز لگے۔ لیکن وسیع تناظر میں ہم اس سے زندگی کے لیے ایک دانشمندانہ فارمولا اخذ کر سکتے ہیں۔ اور وہ فارمولا یہ ہے کہ اگر آپ سے پہلا موقع ضائع ہو گیا، تو اُس کی فکر میں وقت ضائع نہ کریں، فوراً دوسرے موقع کی تلاش میں مصروف ہو جائیں۔ زندگی مواقع سے بھری ہوئی ہے۔ اگر آپ پہلی کوشش میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ تو اس ناکامی کو اختتام نہ سمجھیں۔ بلکہ یہ آپ کے لیے اشارہ ہے کہ ابھی ایک اور بہترین موقع آپ کا منتظر ہے

سابقہ بھارتی وزیراعظم جواہر لال نہرو نے اپنی قانون کی ڈگری ٹرنٹی کالج کیمبرج سے حاصل کی۔ اور 1912 میں انھوں نے اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز اپنے والد موتی لال نہرو کے ساتھ مل کر آلہ آباد سے کیا۔ جو کہ ایک کامیاب وکیل تھے لیکن کچھ عرصے کے بعد انھوں نے سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ قانون کے بھارتی طالب علم سے پوچھا گیا، قانون کی تعلیم مکمل کر کے کیا کرو گے۔ اُس نے جواب دیا۔ چل گئی تو موتی لال نہ چلی تو جواہر لال۔

یہی دانشمندانہ فارمولا ہے۔ جس کا اطلاق سیاسی اور غیر سیاسی زندگی کے دونوں دائروں میں ہوتا ہے۔ اس فارمولے کا مطلب ہے۔ کہ پہلے موقع کھونے کے بعد بھی کامیابی حاصل کرنے کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ قانون فطرت ہمیشہ آپ کے ساتھ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، ایک غیر سیاسی زندگی میں اگر آپ کے ہاتھ سے کوئی نوکری چلی جاتی ہے۔ تو ایک اور نوکری کے لیے دوسرے موقع موجود ہے۔ سیاسی زندگی میں، اگر آپ کو اسمبلی میں اکثریت نہیں ملتی، تو آپ کے لیے حزب اختلاف کا صحت مند کردار ادا کرنے کا موقع موجود ہے۔

زندگی غیر یقینی صورت حال سے بھری ہوئی ہے۔ پھر کیا کریں؟ یہ ممکن نہیں ہے کہ

جدوجہد کرنے والے ایک شخص کا نتیجہ ہمیشہ اُس کی توقعات کے مطابق ہو۔ اس طرح کی صورت حال میں بہترین حکمت عملی ایڈجسٹمنٹ ہے۔ اس فارمولے کے کئی فائدے ہیں۔ ایک طرف یہ آپ کو غیر ضروری ذہنی دباؤ سے بچائے گا۔ دوسری طرف آپ کو دانشمند بنائے گا کہ آپ اپنا وقت درست استعمال کریں اور آپ کو موقع دے گا۔ کہ اپنی زندگی کا پلان دوبارہ ترتیب دیں۔ یہ آپ کو غیر متزلزل اُمید دے گا۔ یہ آپ کو مار دینے والی نفسیات شکایات اور احتجاج سے محفوظ رکھے گا۔ ایک دفعہ مجھے ایک وادی میں جانا ہوا وہاں میں نے چھوٹی چھوٹی ندیاں دیکھیں جو کہ پہاڑ کی چوٹی سے نیچے اتر رہی تھیں۔ میں نے ان ندیوں کے راستے کا جائزہ لیا کہ ندیوں کا پانی اُس وقت تک چلتا رہتا ہے جب تک کوئی چٹان راستے میں نہیں آتی۔ جب کوئی چٹان اُس کے راستے میں حائل ہوتی ہے تو وہ آگے بہنے کے لیے اُس کو توڑنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ چٹان کے دائیں یا بائیں سے راستہ بنا کر نکل جاتا ہے۔ اور بغیر کسی رکاوٹ کے اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ اس واقعہ میں بڑا اہم سبق پوشیدہ ہے۔ یہ ہمیں سیکھاتا ہے کہ اگر پہلا موقع قابل عمل نہیں ہے تو فطرت دوسرے موقع کا انتخاب کر لیتی ہے جب آپ پہلے موقع میں ناکام ہو جائیں، تو فوراً اپنی توانائیاں دوسرے موقع کی تلاش میں صرف کریں۔ فطرت اور تاریخ دونوں ایک سبق دیتی ہیں اگر آپ پہلے موقع میں ناکام ہو گئے ہیں۔ تو دوسرے موجود موقع کو استعمال کرنے کی کوشش کریں۔



ناکامی کامیابی سے زیادہ اہم ہے

اس کے برعکس ناکامی کا پیغام بالکل اُلٹ ہے۔ یہ آپ کو بتاتی ہے کہ تم ابھی تک اپنی منزل پر نہیں پہنچے ہو۔ اس لیے تمہیں دوبارہ پہلے سے زیادہ کوشش کرنی چاہیے امریکہ کے رئیس کاروباری اور مائیکروسافٹ کمپنی کے شریک بانی بل گیٹس (پیدائش ۱۹۵۵) نے ایک دفعہ کہا تھا، ”میں امتحان میں چند مضامین میں فیل ہوا، جب کہ میرا دوست تمام مضامین میں پاس ہو گیا۔ اب وہ مائیکروسافٹ کمپنی میں انجینئر ہے اور میں کمپنی کا مالک ہوں۔ فائور بس ادارے کی فہرست کے مطابق بل گیٹس مسلسل دنیا کا امیر ترین آدمی ہے۔“

دو اشخاص کے درمیان یہ فرق کیوں واقع ہوا جب کہ دونوں ایک ہی پیشہ وارانہ راستے پر گامزن تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ بل گیٹس کے دوست نے اپنی ابتدائی کامیابی کے بعد خیال کیا کہ وہ اپنی حتمی منزل پر پہنچ گیا۔ لہذا اُس کی جدوجہد وہاں دم توڑ گئیں جہاں اُن کو نوکری مل گئی۔ اور اُنھوں نے عام زندگی گزارنی شروع کر دی۔

بل گیٹس کی ناکامی نے اُسے اپنا کام زیادہ سے زیادہ مکمل کرنے کی ترغیب دی تاکہ وہ اُسے حاصل کر لے جیسے یونیورسٹی میں حاصل کرنے میں ناکام ہوا ہے۔ یہ ہی وہ رویہ تھا جس نے اُنھیں کامیاب کیا اور بلاخر بل گیٹس نے کاروبار کی دنیا میں اپنا لوہا منوایا۔

تاریخ میں اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں۔ جو ہمیں اُن لوگوں کے بارے میں بتاتی ہیں جنہوں نے اپنے ابتدائی سالوں میں ناکامی کا سامنا کیا، لیکن آخری عمر کے آخری حصے میں بڑے کامیاب ہوئے۔

زندگی میں کامیابی اور ناکامی اضافی چیزیں ہیں۔ کامیابی کا پیغام ہے: ”آپ نے وہ کچھ حاصل کر لیا ہے جو آپ حاصل کرنا چاہتے تھے“ اس طرح کی سوچ نہ صرف دماغ کو مفلوج کر دیتی ہے۔ بلکہ یہ عقلی جمود کا باعث بھی بنتی ہے۔ اس پیغام کا مطلب ہے کہ سخت مشقت کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ لہذا اب آپ چیزوں کو سہل لیں۔ اس کے برعکس ناکامی کا پیغام بالکل الٹ ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ تم ابھی تک اپنی منزل پر نہیں پہنچے ہو، لہذا دوبارہ تمہیں پہلے سے بھی زیادہ کوشش کرنی چاہیے



ناکامی زندگی کا آخری لفظ نہیں ہے

بدھان چندرارائے (1882-1962) بہت ہی قابل طبیب اور مشہور حریت پسند تھے آزادی کے بعد وہ مغربی بنگال کے دوسرے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ اور اُنھیں عموماً مغربی بنگال کا عظیم آرکیٹیکچر خیال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اُنھوں نے ریاست میں پانچ مشہور شہروں کی بنیاد رکھی۔

تاہم اُن کی زندگی کا ابتدائی دور اُن کے لیے حوصلہ افزا نہ تھا۔ کلکتہ سے گریجویشن کرنے کے بعد، وہ صرف بارہ سو روپیہ کے ساتھ اس نیت سے برطانیہ چلے گئے کہ وہ وہاں اپنی مزید تعلیم کے لیے سینٹ بارٹولومیو ہسپتال کالج میں داخلہ لیں گے۔ لیکن وہاں کے ڈین نے ایشاء کے طالب علم کو اپنے کالج میں داخلہ دینے سے ہچکچاتے ہوئے اُن کی درخواست کو رد کر دیا۔ لیکن وہ دل برداشتہ نہ ہوئے۔ اُنھوں نے اپنے داخلے کے لیے بار بار درخواست دی۔ آخر کار بدھان کی تیس (۳۰) درخواستوں کے بعد ڈین نے اُنھیں کالج میں داخلہ دے دیا۔

تاریخ میں ایسے بہت سے افراد کی مثالیں موجود ہیں جو اپنے ابتدائی دور میں ناکام ہوئے لیکن اُنھوں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی، اور آخر کار کامیاب ہو گئے۔ کامیابی کے مواقع ناکامی کے امکانات سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ اس معاملے کو سامنے رکھتے ہوئے، کسی کو بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ انسان کو اُن تھک طریقہ سے اپنی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ حتیٰ کہ تیس دفعہ فیل ہونے کے بعد بھی، انسان کامیاب ہو سکتا ہے۔



دوسرا موقع ہمیشہ موجود ہوتا ہے

دوسرے موقع کا استعمال ممکنہ طور پر اُن نتائج سے بہتر نتائج دیتا ہے جو پہلے موقع کے استعمال سے مل سکتے ہیں۔

۱۷ ستمبر ۲۰۱۴ کو آسام پولیس کے سابقہ ڈائریکٹر جنرل شنکر باروانے اپنی لائسنس شدہ ریوالور سے اپنے آپ کو گولی مار کر خودکشی کر لی۔ اُن کی عمر تریسٹھ سال تھی۔ سی بی آئی شنکر باروا پر سارا دھماچیت فنڈ میں کئی کروڑ کے گھپلے کے الزام کی تفتیش کر رہی تھی۔ ذرائع بتاتے ہیں کہ اس اسکینڈل میں نام آنے کے بعد شنکر صاحب ذہنی دباؤ کا شکار ہو گئے۔

آسام کے وزیر اعلیٰ تارون گوگوئی نے باروا صاحب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ”وہ نیک اور قابل پولیس آفیسر تھے۔ اُنھوں نے اپنے فرائض کی ادائیگی انتہائی ایمانداری اور ثابت قدمی سے کی۔“ شاید باروا صاحب بذات خود بدعنوان شخص نہیں تھے۔ لیکن ایسے لگتا ہے

کہ وہ کسی دباؤ کی وجہ سے اس اسکیڈنڈل میں ملوث ہو گئے۔

باروا صاحب کی طرف سے اس قسم شمولیت یقیناً ایک غلطی تھی، لیکن دوسری غلطی جو انہوں نے کی وہ مکمل طور پر قابل گریز تھی۔ اصل میں وہ اپنے معاملے میں دوبارہ غور فکر کرنے اور مستقبل کے لیے از سر نو اپنا لائحہ عمل بنانے میں ناکام ہو گئے۔ یہ فطرت کا قانون ہے کہ اگر کسی صورت حال میں، انسان پہلا موقع کھودیتا ہے، تو دوسرا موقع اُس کے لیے ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ لیکن باروا صاحب کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ اُن کی پہلی غلطی اس طرح آسیب بن کر اُن پر چھا گئی کہ وہ اُس کے علاوہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔

اُن کا کیس عدالت میں جاسکتا تھا وہاں وہ قانونی جنگ جیت سکتے تھے۔ بہت سی ایسی مثالیں ہیں جس میں ایک آدمی کو عدالت کا سامنا کرنا پڑا، اور بلا خروہ عدالتی کارروائی کے بعد باعزت طریقے سے بری ہو گیا۔ اور اُس نے دوبارہ اپنی معمول کی زندگی شروع کر دی۔ اگر باروا صاحب قانونی جنگ ہار جاتے اور عدالت اُن کو قید کی سزا دے دیتی پھر بھی وہ اپنا مستقبل محفوظ رکھتے تھے۔ وہ ’کرپشن کو کیسے ختم کیا جائے‘ کے عنوان سے کتاب لکھ سکتے تھے۔ کیونکہ یہ بغیر کسی شک کے درست ہے کہ وہ اس مسئلے سے متعلق کئی تجربات رکھتے تھے۔ وہ اس موضوع پر لکھنے کے حوالے سے بڑے قابل شخص تھے اور اُن کی تصنیف شدہ کتاب بہترین کہنے والی کتاب بن سکتی تھی۔

بھارتی سماج میں کرپشن ایک بہت ہی سنجیدہ مسئلہ ہے ہر کوئی اس کو قومی سطح پر ایک گندگی خیال کرتا ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اس کو کیسے ختم کیا جائے۔ اگر باروا صاحب اپنے آپ کو ذہنی دباؤ سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتے، تو وہ یقینی طور پر کرپشن پر بہت ہی قیمتی کتاب لکھ سکتے تھے جو ایسے لائحہ عمل کو پیش کرتی جس سے بھارت میں کرپشن کا خاتمہ ہو جاتا۔ اگر باروا صاحب کھلے دماغ کے ساتھ اس مقصد کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتے، اور کرپشن کے موضوع پر ایک انقلابی کتاب لکھتے۔ تو وہ یقینی طور پر اس بات کے مستحق تھے کہ انہیں ’جدید بھارت کا نجات دہندہ‘ کا خطاب دیا جاتا۔

ہماری دنیا مواقع (Oppertunities) سے بھرپور ہے۔ اگر کوئی پہلے موقع سے

فائدہ اٹھانے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ تو ہمیشہ دوسرا موقع منتظر ہوتا ہے۔ اس کا استعمال کرنا انسان کو مایوسی کا شکار ہونے سے بچائے گا۔ اور اُسے اپنی زندگی کی منصوبہ بندی از سر نو کرنے کا موقع دے گا۔ وہ بہت جلد دریافت کر لے گا، کہ دوسرے موقع کا استعمال مکمل طور پر اُن نتائج سے بہتر نتائج دیتا ہے جو پہلے موقع کے استعمال سے مل سکتے ہیں۔



ناکامی سے کامیابی کی طرف

تقریباً سب اعلیٰ کامیابیاں حاصل کرنے والے پہلے پہل بڑی بڑی ناکامیاں دیکھنے والے تھے۔ کامیابی ہمیشہ اُن کو ملتی ہے جو واقعی کامیابی کے متلاشی ہوتے ہیں

موہن داس کرم چند گاندھی (1869-1948) گجرات میں پیدا ہوئے اور وہاں پر اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کر کے قانون کی تعلیم کے لیے لندن چلے گئے۔ 1891 میں لندن سے واپس آ کر، انھوں نے بمبئی ہائی کورٹ میں اپنی وکالت شروع کی۔ اُن کا پہلا کیس بالکل سادہ تھا جس کے لیے انھیں تیس روپے فیس دی گئی جب یہ بائیس سالہ نوجوان پیرسٹر عدالت کے سامنے کھڑا ہوا، تاکہ اپنے موکل کے حق میں دلائل دے۔ تو اُس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اُس کا سر چکرا گیا اور منہ خشک ہو گیا۔ وہ مکمل طور پر پشیمان سا ہو گیا اور اُسی حالت میں جلدی سے کمرہ عدالت سے باہر نکل گیا۔ بعد ازاں انھوں نے اس عدالت میں کسی مقدمے کی پیروی نہیں کی۔

1893 میں، گاندھی جی نے جنوبی افریقہ کی انڈین فرم کے ساتھ بطور اُن کے قانونی نمائندے کے پریٹوریا شہر میں کام کرنے کا ایک سالہ معاہدہ کیا۔ 1915 میں گاندھی جی جنوبی افریقہ سے واپس بھارت آ گئے۔ 1919 میں چوری چورا سانحہ نے انھیں یہ موقع دیا کہ وہ بھارتی سیاست میں قائدانہ کردار ادا کریں۔ بعد ازاں وہ بھارت کے عظیم ترین لیڈر بن کر سامنے آئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ٹیگور نے آپ کو مہاتما کا خطاب دیا۔

مندرجہ بالا واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ ناکامی کا مطلب شکست نہیں ہوتا ہے۔ ناکامی اچھی چیز کے لیے بنیاد بن سکتی ہے۔ بشرطیکہ متعلقہ شخص ہمت نہ ہارے اور بعد ازاں اپنا لائحہ عمل دوبارہ

ترتیب دے۔ یہ فطرت کا قانون ہے کہ کامیابی کے مواقع ناکامی کے امکانات سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ کوئی بھی ناکامی آپ کو کامیابی کی تلاش سے نہیں روک سکتی۔ شرط صرف یہ ہے کہ آپ اپنی مثبت سوچ برقرار رکھیں۔ اگر آپ کا پہلا منصوبہ ناکام ہو گیا، تو ایک لحاظ سے یہ آپ کے لیے اچھی خبر ہے۔ کیونکہ قانون فطرت کے مطابق، آپ کی ناکامی کا تجربہ آپ کے دماغ کو متحرک کرے گا، اور نئی کھڑکیاں کھولے گا جو اب تک بند تھیں۔ آپ کی ناکامی آپ کو ہمیں دے گی کہ آپ کام کو زیادہ موثر طریقے سے کریں۔ اور ایک بھرپور کامیابی حاصل کریں۔ اس طرح ناکامی ایک پوشیدہ نعمت ہے۔

بڑی کامیابی کا سفر اکثر بڑی ناکامی سے شروع ہوتا ہے۔ تاریخ کے تمام ادوار میں لوگوں کی ایک کثیر تعداد ہے جو آغاز میں ناکامی کا منہ دیکھنے کے باوجود، ہیر و بن کر سامنے آئے۔ صرف ناکامی نے انہیں اس قابل کیا کہ وہ اپنی زندگی کا دوبارہ پلان بنائیں۔ پھر کامیابیوں کی نئی بلندیوں کو چھویں۔ تقریباً تمام عظیم کامیابیاں حاصل کرنے والے شروع میں بڑی ناکامی سے گزرے ہیں۔ کامیابی ہمیشہ ان لوگوں کے پاس آتی ہے جو اس کے سچے متلاشی ہوتے ہیں۔ اپنے آپ کو سچا متلاشی بنائیں پھر آپ یقینی طور پر اپنی منزل مقصود پالیں گے۔



روشن مستقبل آپ کا منتظر ہے

ناکامی کے اثرات کامیابی سے زیادہ ہوتے ہیں۔

انڈین امریکن بائیو کیمسٹ ہرگو بند کھرا نا (1922-2011) مغربی پنجاب کے شہر رائے پور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے بی ایس سی اور ایم ایس سی کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی لاہور سے حاصل کی۔ پھر انھوں نے 1945 میں مائیکسٹریونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی۔ تین سال بعد 1948 میں جب وہ بھارت واپس آئے تو انھوں نے دلی یونیورسٹی میں لیکچرار کی آسامی کے لیے درخواست دی۔ لیکن یہ درخواست رد کر دی گئی۔ درخواست کی نامنظوری نے انہیں بہت افسردہ کیا۔ انہیں اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ تاہم وہ اپنے شعبے میں مزید تحقیق کے لیے بر

طانیہ واپس چلے گئے۔ اُن کی محنت ثمر آور ہوئی۔ اور 1968 میں اُنھوں نے ڈی این اے سے متعلق اپنی بہت ہی اہم دریافت پر نوبل پرائز وصول کیا۔

تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں جس میں کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باصلاحیت افراد کو اُن عہدوں کے لیے رد کر دیا گیا جن کے لیے وہ بہترین علمی قابلیت رکھتے تھے۔ لیکن بلاخر یہ لوگ ایک طویل جدوجہد کے بعد ایک عظیم کامیابی حاصل کرنے والے بن کر سامنے آئے۔ یہ واقعات ہم کو فطرت کے بہت اہم راز سے آشنا کرتے ہیں کہ ناکامی کامیابی سے زیادہ اثر رکھتی ہے۔ جب آپ ایک دفعہ کامیاب ہو جاتے ہیں تو آپ مطمئن ہو جاتے ہیں اور چیزوں کو سہل لیتے ہیں۔ تاہم اگر آپ کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے تو یہ ناکامی آپ کو عام حالات کے مقابلے میں زیادہ محنت کی ترغیب دیتی ہے۔ اور اس طرح آپ کے وہ صلاحیتیں سامنے آتی ہیں جو عام حالات میں سوئی رہتی ہیں۔ اس لیے ناکامی عظیم کامیابی کے لیے راہ ہموار کر سکتی ہے۔



خدائی رحمتوں میں کوئی امتیاز نہیں ہے

کثرت انسانی شخصیت کی اچھی خوبیوں کو ختم کر دیتی ہے۔ جبکہ قلت شخصیت کی ترقی کے لیے بوسٹر (Booster) ثابت ہوتی ہے۔

ہمارے ہاں اکثر یہ مجاورہ بولا جاتا ہے کہ فلاں شخص تو منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوا۔ یہ مجاورہ حقیقت کا غلط تصور پیش کرتا ہے۔ اس سے ایسا لگتا ہے جیسے انسانی پیدائش سے متعلق خدائی اسکیم میں مساوات نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ کچھ لوگ خصوصی عنایات کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور کچھ اُن کے بغیر۔ یہ تصور بالکل غلط ہے۔

رحمت و عنایات کی بنیاد پیدائش پر نہیں بلکہ مواقع پر ہے۔ مواقع انسانی زندگی میں بہت اہم ہیں۔ جو کوئی موقع کا استعمال کرتا ہے وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور جو کوئی موقع کو ضائع کر دیتا ہے وہ ناکام ہو جاتا ہے۔ کیونکہ کامیابی انسان کی اپنی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ اُس کی پیدائش کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہاں ہر کوئی مساویانہ بنیاد پر پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے بہترین محاورہ یہ ہوگا۔ ہر کوئی منہ میں مواقع کا چچہ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ مال دولت عیش و آرام کے ماحول میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور زندگی میں وہ ہر طرح کی فوقیت رکھتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی بے حسی اور عدم مہارت کی وجہ سے زندگی میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو تنگی اور دشواری کے حالات میں پیدا ہوتے ہیں۔ اپنی صلاحیتوں کو سراہتے ہوئے عظیم کامیابیاں حاصل کرنے والے بن جاتے ہیں۔

حقیقت میں وہ لوگ جو کثرت مال کے ماحول میں پیدا ہوتے ہیں وہ محروم افراد بن سکتے ہیں۔ کیونکہ جہاں کثرت مال ہے وہاں سخت محنت کرنے اور سنجیدگی سے علم کی طرف متوجہ ہونے کی ترغیب نہیں ہوتی ہے۔ اور اس ترغیب کی عدم موجودگی میں، وہ آگے بڑھنے کی جدوجہد اور بہتر کام کرنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔ پھر جلد یا بدیر ایشیا برباد ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ بعض دفعہ تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ امیر آدمی جس نے اپنے کاروبار کو بہتر کرنے کی کوشش نہیں کی ہے ممکن ہے کہ وہ بلا خر غربت کے بھنور میں پھنس جائے۔

دوسری طرف وہ لوگ جو محرومی میں پیدا ہوئے ان کے لیے محرومی ہی ان کی زندگی کو تبدیل کرنے کے لیے زبردست محرک بن گئی

کثرت مال انسانی شخصیت کی اچھی خوبیوں کو ختم کر دیتی ہے۔ جبکہ قلت مال شخصیت کی ترقی کے لیے بوسٹر (Booster) ثابت ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ نتائج کے حوالے سے غربت کثرت مال سے زیادہ بڑی نعمت ہے۔ محروم شخص زیادہ انعام یافتہ ہے۔ یہی وہ سبق ہے جو ہمیں طویل تجربات سیکھاتے ہیں۔



خودکشی کوئی انتخاب نہیں ہے

ہمارے خالق نے ہمیں بیٹا رنجوبوں سے نوازا ہے۔ اب یہ ہر انسان سے مطلوب ہے کہ وہ ان خوبیوں کا اظہار کرے اور وہ کردار ادا کرے جو خدا نے اُس کے سپرد کیا ہے۔

ہرمن بیس (1877-1962) مشہور جرمن شاعر اور ناول نگار تھا۔ اپنے ابتدائی سالوں میں بیس کو اپنے والدین کے ساتھ لڑائی اور ناچاقی کا سامنا کرنا پڑا۔ 1892 میں جب وہ پندرہ سال کے تھے اس صورت حال کی وجہ سے اتنے مایوس ہوئے۔ کہ انہوں نے خودکشی کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کسی وجہ سے ان کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔

ایک تحقیق کے مطابق یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وہ لوگ جو خودکشی کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کی کوشش کامیاب نہیں ہوتی، وہ بڑے کام کرنے کی طرف زبردست تحریک رکھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ بعد ازاں ہیرو بن جاتے ہیں۔ بالکل ایسا ہی ہرمن بیس کے ساتھ ہوا۔ انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی اور بطور ایک مصنف اپنا سفر حیات شروع کیا۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد وہ ایک عظیم مصنف بن گئے۔ اور 1946 میں انھیں نوبل پرائز سے نوازا گیا۔

انسان اس دنیا میں صرف حادثاتی طور پر پیدا نہیں ہوا ہے۔ بلکہ یہ خدائی منصوبے کے مطابق پیدا ہوا ہے۔ ہمارے خالق نے ہمیں بیٹھا خوبوں سے نوازا ہے۔ اب یہ ہر انسان سے مطلوب ہے کہ وہ ان خوبیوں کا اظہار کرے اور وہ کردار ادا کرے جو خدا نے اُس کے سپرد کیا ہے۔ خالق کائنات کے اس تخلیقی پلان کے مطابق، ہر انسان کو پُر اُمید رہنا چاہیے۔ کوئی بھی بہانہ نا اُمیدی کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔

ہماری دنیا مواقع سے بھر پور ہے۔ اگر کوئی آدمی کچھ کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ تو اُسے اس ناکامی کو تاخیر کے طور پر لینا چاہیے۔ لیکن قطعاً اپنی ناکامی کو حتمی نہیں سمجھنا چاہیے۔ خراب صورت حال میں کسی بھی انسان کے لیے خودکشی کرنا کسی طور بھی دانشمندی نہیں ہے۔ بس انسان کو انتہائی قدم اٹھانے کے بجائے صرف انتظار کرنا چاہیے۔



منفی تجربات کا مثبت پہلو

اگر آپ ناگوار صورت حال کا شکار نہیں ہوتے ہیں۔ اور صرف ایک کام کرتے ہیں۔ وہ ہے کچھ نہ کرنا، بس فطرت کو اپنا کام کرنے دینا یہ آپ کے ذہن کے لیے ایک مثبت عنصر کے طور پر کام

کرے گی۔

تھامس الوائیڈسن (1847-1931) مشہور اور کثیر ایجادات کرنے والا شخص ہے۔
ایڈسن نے اپنی ایجادات سے جدید دور کو بہت متاثر کیا۔ ایک ہزار سے زائد چیزوں کی ایجادات
اُس کے نام سے رجسٹرڈ ہیں۔

لیکن ایڈسن کی زندگی کا ابتدائی دور بالکل مختلف صورت حال پیش کرتا ہے۔ چند ماہ کی
اسکولنگ کے بعد اُس کے ٹیچر نے اُسے کُند ذہن اور غیر متوازن کہا اور دعویٰ کیا کہ وہ اپنی تعلیم کو
جاری نہیں رکھ سکے گا۔

ان حوصلہ شکن حالات میں ایڈسن کو گھرانے کے علاوہ اُن کی والدہ کے پاس کوئی
چارانہ تھا۔ تاہم اُن کی والدہ نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ اپنے بیٹے کو خود گھر میں پڑھائیں گی۔ یہ ہی وہ
لمحات تھے جو ایڈسن کی زندگی میں ایک بڑا اثنا ثابت ہوئے۔ کیونکہ جب اسکول کے دروازے
اُن پر بند ہوئے، اُسی اثنا میں دوسرے دو اسکولوں کے دروازے اُن کے لیے کھل گئے۔ یعنی ایک
گھر کا اسکول دوسرا ذہنی اسکول۔ اس واقعہ کی وجہ سے، ایڈسن کا ذہن مزید متحرک ہو گیا اور اُس کو
یہ تحریک ملی کہ وہ اپنے لیے سیکھے۔ یہ مثال انسان میں موجود اُس معجزانہ عنصر کی نشاندہی کرتی ہے۔
جیسے فطرت کہتے ہیں اس سے ہم فطرت کا ایک اصول اخذ کرتے ہیں۔ کہ جب انسان کسی کو کچھ
دینے سے انکار کرتا ہے تو فطرت آگے بڑھ کر محروم شخص کے نقصان کی تلافی بڑے پیمانے پر کر
دیتی ہے۔

فطرت کے قانون کے مطابق، ہر منفی واقعہ میں کوئی نہ کوئی مثبت پہلو ضرور ہوتا ہے۔
شرط صرف یہ ہے کہ انسان منفی اور مایوسی کا شکار نہ ہو۔ زندگی ایسے ناخوشگوار واقعات کا مجموعہ
ہے۔ جن سے گریز ممکن نہیں ہے۔ لیکن منفی واقعات کوئی محض مصیبت نہیں ہیں۔ بلکہ یہ خدا کی
رحمت اور عقل دانش کے لیے چیلنج بھی ہیں۔ کسی بھی ناخوشگوار صورت حال میں جوانی رد عمل کے
بجائے بہتر ہے کہ انتظار کیا جائے۔ اگر آپ ناگوار صورت حال کا شکار نہیں ہوتے ہیں۔ اور
صرف ایک کام کرتے ہیں۔ وہ ہے کچھ نہ کرنا، بس فطرت کو اپنا کام کرنے دینا۔ یہ آپ کے ذہن
کے لیے ایک مثبت عنصر کے طور پر کام کرے گا۔ یہ آپ کی غور و فکر کی صلاحیت کو فروغ اور عقل و

دانش کی تجوری کو کھول دے گا۔

اگر آپ نے اپنے اندر ایک مضبوط شخصیت اور بیدار ذہن پیدا کر لیا۔ تو پھر ہر تلخ تجربہ آپ کے لیے ایک مثبت تجربہ بن جائے گا۔ آپ کے اندر خود بخود ہر ناگوار واقعہ کو خوشگوار موقع میں بدلنے کا ملکہ پیدا ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ قانون فطرت ہے جو سب سے بالا ہے۔ جب آپ کسی بھی ناخوشگوار تجربے پر بے ضرر رہنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ تو درحقیقت آپ قانون فطرت کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ آپ کا نجات دہندہ بن کر آئے۔ آپ کے نقصان کی تلافی کے لیے لائحہ عمل مرتب کرے۔

زندگی مواقع سے بھرپور ہے۔ یہاں کسی کی دی ہوئی چیز آپ سے کوئی واپس لے سکتا ہے۔ لیکن جو کچھ فطرت نے آپ کو دیا ہے وہ آپ سے کوئی نہیں لے سکتا۔ مثال کے طور پر کوئی شخص آپ کو نارنج دیتا ہے بعد ازاں وہ اسے واپس لے لیتا ہے۔ لیکن وہ خدائی نارنج یعنی سورج کو آپ سے نہیں لے سکتا۔ اس اصول سے واقفیت اُمید بہار لاتی ہے۔

جب آپ دوسروں کی طرف سے ناگوار صورت حال کا سامنا کریں تو اس کا واحد درست رد عمل یہ ہے کہ آپ خارجی ناخوشگوار واقعات کو بھول جائیں۔ اور اپنی داخلی قابلیت کو فروغ دینے کا فیصلہ کریں۔ بہت جلد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ نے کھونے سے زیادہ پالیا ہے۔

زندگی میں فل اسٹاپ نہیں بلکہ صرف کوما ہوتا ہے۔ کوئی بھی واقعہ آپ کی زندگی کی کتاب کا آخری باب نہیں ہے۔ ہر روز آپ لامحدود صلاحیت کی وجہ سے اس پوزیشن میں ہوتے ہیں کہ اپنی کتاب میں نئے باب کا اضافہ کریں۔ آپ کو کبھی اپنی دماغی صلاحیتوں پر شک نہیں کرنا چاہیے۔ یہ اپنی ذہانت پر شک ہوتا ہے جو کہ بندے کو مایوس کر دیتا ہے۔ اگر آپ ذہن کی صلاحیتوں کو دریافت کر لیں۔ تو یہ آپ کے لیے زبردست حوصلہ افزائی اور لامتناہی طاقت کا باعث ہوگا۔

آپ اپنے مستقبل کی طرف اُس مقام سے ایک نیا قدم اٹھائیں گے جس مقام پر آپ کی زندگی کا سفر ختم ہوا تھا۔



کامیابی کا پہلا اصول

وہ لوگ جو اپنی کمزوریوں کے باوجود دل برداشتہ نہیں ہوتے اور اپنی جدوجہد بھرپور طریقے سے جاری رکھتے ہیں۔ آخر میں وہی لوگ عظیم کامیابیاں پانے والے بن کر ابھرتے ہیں۔

برطانوی طبیعیات اور ریاضی دان سر اسحاق نیوٹن (1642-1727) اپنے حرکت کے قوانین کے حوالے سے مشہور ہیں۔ حرکت کا تیسرا قانون بتاتا ہے کہ ہر عمل کا مساوی رد عمل ہوتا ہے لیکن مخالف سمت میں۔ ایسے ہی ایک اور قانون بھی ہے جس کا ظہور خود نیوٹن کی زندگی میں ہوا۔ اُسے انسانی کامیابی کا پہلا اصول کہا جاسکتا ہے۔

نیوٹن کے والد اُس کی پیدائش سے تین ماہ پیشتر فوت ہو گئے تھے۔ اُس کی والدہ نے جلد ہی دوسری شادی کر لی۔ جس کے نتیجے میں نیوٹن والدین کی محبت سے محروم رہ گیا۔ نیوٹن کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے۔ ”اوائل عمری میں اسحاق نیوٹن کو تیبی کے دن گزارنے پڑے جس کی وجہ سے اُن کا بچپن خوشگوار نہ تھا۔“ ظاہری طور پر یہ نیوٹن کی زندگی میں ایک منفی پہلو تھا۔ لیکن حقیقت میں اس نے نیوٹن کی زندگی کو نفع بخش زندگی میں بدل دیا تھا۔

اپنے بچپن کے دوران، نیوٹن کے لیے خارجی دنیا کوئی کشش نہیں رکھتی تھی۔ لہذا اُس نے اپنی خیالی دنیا میں رہنا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے اُس کو غیر حاضر دماغ اور پراگندہ ذہن کہا جانے لگا۔ لیکن بعد ازاں پتا چلا کہ نیوٹن غیر حاضر دماغ ہونے کے بجائے ایک نکتہ پر توجہ مرکوز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اپنی اس دانشورانہ خوبی کی وجہ نیوٹن نے عظیم سائنسی قوانین دریافت کیے۔ بظاہر والدین کی شفقت و محبت سے محرومی ایک بہت بڑی کمی تھی، لیکن قانونِ فطرت کے مطابق یہ محرومی اُن کے لیے فائدہ مندی میں تبدیل ہو گئی۔ کیونکہ اُن کی یہ محرومی اُن کی ذہنی صلاحیت کو تیز کرنے کا باعث بنی۔ اسی کی وجہ سے وہ اپنے پوشیدہ ممکنہ صلاحیتوں کا ظاہر کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس طریقہ سے اُن کی دانشورانہ سرگرمیاں اچھی سمت میں مڑ گئیں۔

اس لحاظ سے اُن کی زندگی کا منفی پہلو مثبت ثابت ہوا۔

یہ کہانی صرف ایک آدمی کی نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ فطرت کی کہانی ہے۔ نیوٹن کی زندگی فطرت کے انتہائی اہم قانون کا مظہر ہے۔ یعنی انسان لامحدود ممکنہ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے ماسوائے بے حسی اور مایوسی کے کوئی بھی عنصر اُس کی کامیابی کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ اگر انسان مایوس اور بے حس نہ ہو، تو اُس کی اپنی حقیقی فطرت خود بخود اُس کی راہنمائی کا باعث بنے گی۔ اور ناقابل یقین عظمت و احترام سے منزل مقصود پر پہنچائے گی۔

تاریخ میں ایسے افراد کی بہت سے مثالیں ہیں جو آغاز میں ہر طرح کی مصیبت کا شکار ہوئے۔ لیکن وہ مشکلات دیکھ کر دل برداشتہ نہ ہوئے۔ نتیجتاً اُن کی فطرت نے اُن کی راہنمائی کی اور اُنھوں نے مسلسل اپنی توانائیوں اور صلاحیتوں کو اپنی اُس منزل مقصود کی طرف گامزن رکھا۔ جس منزل کا وہ اپنی سرگرمیوں کے آغاز میں تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

اکثر لوگوں کو زندگی میں ناخوشگوار صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر یتیمی کے دور سے گزارنا، کسی حادثہ کا شکار ہو جانا، کاروبار میں نقصان اٹھانا، تعلیمی کا ادھورا رہ جانا، وراثت میں کچھ ہاتھ نہ آنا، اچھی نوکری حاصل کرنے میں ناکام ہو جانا وغیرہ۔ لیکن وہ لوگ جو اپنی کمزوریوں کے باوجود دل برداشتہ نہیں ہوتے اور اپنی جدوجہد بھرپور طریقے سے جاری رکھتے ہیں۔ آخر میں وہی لوگ عظیم کامیابیاں پانے والے بن کر ابھرتے ہیں۔



سیب کا گرنا

فطرت ہمیشہ آپ کو سبق دینے، اور سیدھی سمت دیکھانے کی سعی کرتی ہے، اُس کی کوشش ہوتی ہے کہ آپ کی ممکنہ صلاحیتوں کو سامنے لائے۔ اس کی تگ و دو ہوتی ہے کہ آپ کے چاروں طرف جو مواقع موجود ہیں اُن سے آپ کو روشناس کرائے۔

اسحاق نیوٹن ایک عظیم انگریز طبیعیات اور ریاضی دان تھا کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ وہ

ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا ایک سیب اُس کے سر پر آ کر گرا۔ سیب کے نیچے گرنے کے عمل پر غور کرتے ہوئے، اُس نے قوت کشش ثقل کا قانون دریافت کیا۔

یہ ایسا ہے جیسے جھٹکا علاج (Shock Treatment) کا طریقہ ہوتا ہے جس کو فطرت نے تشکیل دیا ہو۔ اس واقعہ نے نیوٹن کی تدبر و فکر کی جھیل میں حرکت پیدا کر دی۔ جب سیب نیچے گرا تو اُس نے سوچنا شروع کیا کہ سیب نیچے کیوں گرا؟ اوپر کیوں نہ چلا گیا؟ یہ غور و فکر کشش ثقل کے قانون کی دریافت کا باعث بنا۔ یہ قانون اول دن سے موجود تھا۔ لیکن انسان اسے دریافت نہ کر سکا۔ پھر ایک طویل مدت کے بعد، فطرت نے انسان کے سر پر چوٹ لگائی، اور چوٹ کی زبان میں اُس نے کہا۔ ”اوانسان! قانون کو دریافت کر۔ جو آج تک نادر یافت شدہ ہے“ یہ ایسے ہی جیسے شاک ٹریٹمنٹ کا طریقہ ہوتا ہے۔ شاک ٹریٹمنٹ فطرت کا قانون ہے۔ شاک ٹریٹمنٹ کو ہم چیلنج بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہر انسان کسی نہ کسی طریقہ سے اس قسم کے چیلنج کا سامنا کرتا ہے۔ یہ شاک ٹریٹمنٹ ایک پوشیدہ نعمت ہے۔ کیونکہ یہ ہمیشہ متعلقہ شخص کی بہتری کے لیے کام کرتا ہے۔

اگر آپ اپنی نوکری، کاروبار یا خاندان میں مسائل کا سامنا کر رہے ہیں۔ تو کبھی بھی منفی رویہ نہ اپنائیں۔ اُس کو ایک مثبت واقعہ کی طرح لیں۔ اگر آپ متعلقہ واقعہ کو منفی لیں گے تو پھر آپ اس مہیا شدہ موقع سے فائدہ اٹھانے میں ناکام ہو جائیں گے لیکن اگر آپ مثبت رہتے ہیں، تو آپ پریشان ہونے کے بجائے چیلنج کی پشت پر جو پیغام ہے اُسے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ اور بہت جلد آپ دریافت کر لیں گے یہ چیلنج نہیں تھا بلکہ یہ تو کامیابی کا موقع تھا۔

شاک ٹریٹمنٹ فطرت کی زبان ہے۔ فطرت ہمیشہ آپ کو سبق دینے، اور سیدھی سمت دیکھانے کی سعی کرتی ہے، اُس کی کوشش ہوتی ہے کہ آپ کی ممکنہ صلاحیتوں کو سامنے لائے۔ اس کی تگ و دو ہوتی ہے کہ آپ کے چاروں طرف جو مواقع موجود ہیں اُن سے آپ کو روشناس کرائے۔ فطرت کی تنبیہات سے صرف نظر نہ کریں بلکہ ان کو سنجیدگی سے لیں، یہ آپ کو درست راہنمائی اور آپ کی ناکامی کو کامیابی میں بدل دیں گی۔

فطرت انسان کے لیے بہترین راہنما ہے۔ لیکن فطرت ہمیشہ چوٹ کی زبان یعنی چیلنج

کی زبان میں بات کرتی ہے۔ چیلنج کوئی حادثاتی واقعہ نہیں ہوتا ہے۔ چیلنج ہمیشہ فطرت کی طرف سے آتے ہیں۔ اس طرح فطرت آپ کے دماغ کو بیدار کرنے کو کوشش کرتی ہے۔ یہ تفکیری عمل کو از سر نو شروع کرنے کی سعی کرتی ہے۔

پہلے فطرت سادہ زبان میں نصیحت کرنے کو کوشش کرتی ہے۔ لیکن جب آپ اُس کی نصیحت پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔ تو پھر وہ شاک ٹریٹمنٹ کا طریقہ استعمال کرتی ہے۔ یہ ایسے آدمی کو بیدار کرنے کے مترادف ہے جو کہ عام آواز پر جاگنے کے لیے تیار نہ ہو۔ زندگی میں جتنے بھی چیلنج آتے ہیں سب مثبت چیلنج ہوتے ہیں۔ جب آپ کسی چیلنج کا سامنا کریں تو مثبت انداز سے کریں۔ اور چیلنج کے اندر پوشیدہ پیغام کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

کسی انسان کے سر پر سب کا گرنا عام سی بات ہے۔ ہر شخص کا یہ تجربہ ہوگا اگرچہ سب کی شکل میں نہ ہو کسی اور چیز کی صورت میں ہو۔ یہ تجربات حادثاتی نہیں ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ خدائی منصوبہ بندی کا حصہ ہوتے ہیں۔ یہ ایک ترغیب دینے والے کا کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر آپ کو بھی اس طرح کا کوئی تجربہ ہو تو اپنے دماغ کو مضطرب نہ ہونے دیں۔ بلکہ اُس کو ایک مثبت اشارہ سمجھیں، اور متعلقہ واقعہ کی پر پشت جو پیغام ہے اُس کو جاننے کی کوشش کریں۔ آپ بہت جلد جان لیں گے۔ یہ تجربہ تو بالکل اُسی طرح ہے جیسے سبب کرنے کا واقعہ۔ اس تجربے کا واحد مقصد آپ کو ہمیز لگانا ہے کہ آپ انسانی زندگی کے اہم قانون کو دریافت کریں۔

تاریخ میں ان گنت لوگ ہیں جو پہلی کوشش میں ناکام ہو گئے تھے۔ لیکن جب انہوں نے مسئلے پر نئے سرے سے غور کیا، تو نتیجتاً انہوں بڑی کامیابی حاصل کی۔

بعض اوقات لوگ غلط انتخاب کر لیتے ہیں۔ پھر فطرت انہیں سبب کے ساتھ چوٹ لگاتی ہے اور خاموش پیغام دیتی ہے۔ ”اچھے انتخاب کی کوشش کرو“ جو لوگ فطرت کی اس خاموش آواز کو سن لیتے ہیں۔ کامیاب انسان بن کر ابھرنا اُن کا مقدر بن جاتا ہے۔



شاک آبرو سے سبق حاصل کرنا

اپنی پرسنٹی ڈوپلنٹ کی چکی میں منفی تجربات کو پیش دیں اور یہ تجربات جو آپ کو سکھائیں اُن سے سبق حاصل کریں۔

اگر آپ سڑک کے ایک طرف کھڑے ہیں۔ تو جب کوئی کار پاس سے گزرتی ہے تو آپ مشاہدہ کرتے ہیں کہ کار کے پہیہ مسلسل اوپر نیچے سڑک کی سطح کے مطابق حرکت کرتے ہیں لیکن اگر آپ کار میں بیٹھیں ہیں تو آپ محسوس کریں گے کہ گویا کہ کار ہموار سطح پر چل رہی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہوا؟ یہ ایسے ممکن ہوا کہ کار میں شاک آبزور لگے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے جھٹکے پہیوں تک محدود رہتے ہیں کار میں سوار شخص تک نہیں پہنچتے۔

ایک روحانی آدمی کی تعمیر میں یہ شاک آبزور پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس طرح کا آدمی ناخوشگوار واقعات کا بغیر کسی جذباتی یا ذہنی پریشانی کے سامنا کر سکتا ہے۔ اس طرح کے آدمی کے لیے مسائل اور ناگوار صورت حال عام پیش آئیں گی۔ لیکن اپنے شاک آبزور کی وجہ سے اُس کا ذہن غیر متاثر رہے گا۔ اُس دنیا میں جس میں مستقلاً طرح طرح کے غیر پسندیدہ واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں، اُس میں وہ انتہائی تحمل سے رہ سکتا ہے۔

ہمارے سماج میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہے جیسے مختلف قسم کے منفی تجربات سے سابقہ نہ پیش آتا ہو۔ ظاہر ہے پھر یہ منفی تجربات شکایات کا موجب بنتے ہیں۔ اور جب دماغ میں شکایات کے انبار جمع ہو جائیں۔ تو وہاں روحانیت معدوم ہو جاتی ہے۔ روحانیت اور شکایت ساتھ ساتھ نہیں چل سکتیں۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔ ان منفی تجربات سے فرار ممکن نہیں ہے۔ پھر انسان کو کیا کرنا چاہیے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر آپ ایک روحانی آدمی بن کر زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنی دماغی بناوٹ میں شاک آبزور لگانے چاہئیں۔ ان شاک آبزور کی مدد سے، ہر معاشرتی ناہمواری کے جھٹکے جب آپ برداشت کریں گے تو آپ اپنی روحانیت کو محفوظ رکھ پائیں گے۔

آپ سماج میں رہنے کے پابند ہیں۔ اور جتنا آپ معاشرے کو تبدیل کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں اتنا ہی اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ سماجی قوانین ہم پر آزادانہ حیثیت میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ پھر کیا کرنا چاہیے؟ آپ کو ہر حال میں اپنے اُوپر مثبت

رہنے کی شرط عائد کر لینی ہے، چاہے آپ کو جتنے مرضی منفی تجربات پیش آئیں۔ مسلسل شکایت کا رجحان روحانیت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ لیکن شکایتی رجحان ہمارے معاشرے کا حصہ ہے۔ یقیناً معاشرہ میں شکایات کی بھرمار ہے۔ اور اگر یوں کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ معاشرہ ایک سچے سچے شکایات کا سمندر ہے۔ اور جیسے ایک چھلی اپنے قدرتی ماحول یعنی پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح انسان جس معاشرے سے تعلق رکھتا ہے اُس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لہذا بجائے معاشرے کو تبدیل کرنے کے اپنے آپ کو تبدیل کریں۔ اپنی پرسنٹی ڈولپمنٹ کی چکی میں منفی تجربات کو پیس دیں اور یہ تجربات جو آپ کو سکھائیں اُن سے سبق حاصل کریں۔

شکایات سے نمٹنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کو بطور ایک چیلنج لیں۔ جب آپ کسی پریشانی کو بطور چیلنج لیتے ہیں، تو آپ اُسے پورا کرنے کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہیں۔ آپ مسئلہ کو ختم کرنے کے بجائے اُس سے اچھی طرح نبرد آزما ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ لائحہ عمل بالکل ممکن ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک پرندہ آپ کی دیوار پر بیٹھا ہے اور آپ اُسے پھر مار کر اڑا دیتے ہیں تو وہ آپ کے گھر سے اُڑ کر کسی قریبی درخت پر بیٹھ جائے گا۔ اور پھر چھپا ہوا شروع کر دے گا۔ پرندہ ہمیشہ غیر شکایتی کلچر میں رہتا ہے۔ اگر یہ کلچر ایک پرندے کے لیے ممکن ہے تو انسان کے لیے کیوں نہیں ہے۔

ناخوشگوار تجربات کوئی برائی نہیں ہے۔ یہ آپ کو حقیقت پسندی سے سوچنے کی تحریک اور درست فیصلہ کرنے کی صلاحیت دیتے ہیں۔ یہ آپ کی تخلیقی صلاحیتوں کو فروغ دیتے ہیں اور اُن لوگوں کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کا رویہ اپنانے کا سبق دیتے ہیں جن کا رویہ آپ کے نکتہ نظر سے آپ کے حق میں صحیح نہیں ہے۔ یہ منفی صورت حال کا مثبت نتیجہ ہے۔

ان سب کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ دنیا کو کیسے دیکھتے ہیں۔ پریشانی اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب چیزوں کو غلط زاویہ نظر سے دیکھا جائے۔ اگر آپ اپنے نکتہ نظر کو ایڈجسٹ کر لیں تو بہت جلد آپ ہر چیز کو اپنے حق میں تبدیل ہوتا پائیں گے۔



دھچکا۔ ایک پوشیدہ نعمت

دھچکا ایک بڑا معلم ہے۔ یہ ایسے بے ساختہ تفکیری عمل (Brainstroming) کا اجراء کرتا ہے۔ کہ بالکل نئی ذہنیت منسکل ہوتی ہے جس کے نتیجے میں نئی انسانی شخصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔

الفریڈ نوبل (1833-1896) وہ پہلا شخص ہے جس نے ڈائنامائیٹ ایجاد کیا۔ اُنھوں نے اسلحہ کی نوے فیکڑیاں قائم کی تھیں۔ اور اسلحہ کی تجارت سے بڑی دولت کمائی۔ پھر ایک ایسا واقعہ ہوا، جس نے الفریڈ نوبل کی ساری زندگی کا لائحہ عمل تبدیل کر کے رکھ دیا۔

1888 میں اُن کے بھائی کا انتقال ہوا، لیکن اخبارات میں غلطی سے الفریڈ کی موت کی خبر شائع ہو گئی۔ ایک فرانسیسی اخبار نے اُن کا اعلان وفات اس سرخی کے ساتھ کیا: ”موت کا سوداگر انتقال کر گیا“ اخبارات میں چھپا تعزیت نامہ کہہ رہے تھے: ”وہ ایسے طریقے دریافت کر کے دولت مند ہوا تھا جو زیادہ سے زیادہ انسانوں کو ماضی کے مقابلے میں کم سے کم وقت میں موت کی نیند سلا دیں۔“ الفریڈ کو یہ پڑھ کر ایک دھچکا لگا۔ پھر اُس نے اپنی زندگی کے حوالے سے ایک مثبت فیصلہ کیا۔ 1895 میں سویڈش نارویجین کلب پیرس میں نوبل نے اپنی آخری وصیت لکھی اور بشمول نوبل پرائیز برائے امن پانچ نوبل انعام قائم کرنے کے لیے اپنی جائیداد کے ایک بڑے حصے کو علیحدہ کر دیا۔

دھچکا ایک بڑا معلم ہے۔ یہ ایسے بے ساختہ تفکیری عمل (Brainstroming) کا اجراء کرتا ہے۔ جس سے بالکل نئی ذہنیت منسکل ہوتی ہے جس کے نتیجے میں نئی انسانی شخصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ اگرچہ ایک شخص دھچکے سے پہلے ایک عام آدمی ہوتا ہے لیکن دھچکے کے بعد وہ آدمی سپر مین بن جاتا ہے۔

زندگی میں چھوٹے بڑے دھچکے عام سی بات ہے۔ تقریباً ہر شخص اس تجربہ سے گزرتا ہے۔ اور اکثریت اس دھچکے کو منفی عمل کے طور پر لیتی ہے۔ اس لیے اس سے سبق حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہے۔

تاہم یہ دھچکے اتفاقی نہیں ہوتے۔ اصل میں دھچکے فطرت کی زبان ہوتے ہیں۔ فطرت دھچکوں کی زبان میں بات کرتی ہے۔ اگر کوئی دھچکا لگنے کے بعد اپنے آپ کو منہ سوچ کا شکار ہونے سے بچالے۔ تو یہ بڑا تخلیقی تجربہ ثابت ہو سکتا ہے۔ دھچکے آپ کے دماغ کو متحرک اور آپ کی ممکنہ صلاحیتوں کو ظاہر کریں گے۔ یہ تخلیقی تکفیر عمل کو شروع کرتے ہیں۔ یہ آپ کے بہتر فیصلہ لینے میں مدد کرتے ہیں۔ یہ آپ کو غلط راہ سے درست راہ پر لاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ آپ کو حقیقت پسند بناتے ہیں۔

دھچکے انسانی زندگی میں ایک مثبت عنصر ہے بشرطیکہ انسان مثبت رد عمل کا اظہار کرے۔ ہر کوئی الفریڈ نوبل کی طرح اعلیٰ کردار ادا کر سکتا ہے۔ صرف ایک شرط ہے کہ دھچکوں کو اشتعال کا ذریعہ بنانے کے بجائے کچھ سیکھنے کا وسیلہ بنانا چاہیے تاریخ ایسے لوگوں سے بھری ہوئی ہے جنہوں نے دھچکے کھائے لیکن وہ مثبت ذہن رہے۔ لہذا دھچکے اُن کی زندگی کو بہتر کرنے کا باعث بنے اسی طرح کی ایک مثال مہاتما گاندھی جی کی ہے۔ جنہوں نے بیس سال جنوبی افریقہ

میں گزارے۔ جون 1893 میں، وہ ایک دورے پر پریٹوریا ٹرانسوال جاتے ہوئے پیٹرمارٹز برگ پہنچے۔ تو گاندھی جی ریل گاڑی کی فرسٹ کلاس بوگی میں بیٹھے تھے جس کی انہوں نے ٹکٹ خریدی تھی۔ ریلوے کے ملازمین نے گاندھی جی کو حکم دیا کہ وہ ریل کے اس ڈبے سے اتر جائیں، کیونکہ کالوں کو فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ گاندھی جی نے اُن کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے گاندھی جی کو شدید سردی کے موسم میں ریل سے دھکا دے کر اُتار دیا۔ اور اُن کا سامان اٹھا کر پلٹ فارم پر پھینک دیا۔

جو کچھ گاندھی جی کے ساتھ ہوا وہ تشدد کی ایک مثال ہے۔ لیکن انہوں نے امن کے لیے کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ہندوستان واپس آئے اور انہوں نے انہماکی بنیاد پر اپنی جدوجہد شروع کی۔ جو کہ جلد ہی عدم تشدد کی تحریک بن گئی۔ اور وہ عدم تشدد کے زبردست حامی بن گئے۔ قانون فطرت کے مطابق، زندگی کا سفر ہموار نہیں ہے۔ جھٹکوں اور دھچکوں کے درمیان کا سفر ہے۔ اس حقیقت کو قبول کرنے کے علاوہ انسان کے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔ فطرت کا راستہ جھٹکے اور چیلنجز کا راستہ ہے۔ جو کوئی اپنے آپ کو کامیاب بنانا چاہتا ہے۔ اُسے اس حقیقت کو

سمجھنا چاہیے۔ اور دلچسپیوں کی زندگی کو کامیابی کا ذریعہ بنانا چاہیے

☆☆

کون سا عمل انسان کو سپر مین بناتا ہے؟

جو انسان زندگی کے سفر میں ناگوار دلچسپیوں کا سامنا حوصلہ مندی سے کرے اور ان دلچسپیوں کو بطور ایک چیلنج قبول کرے، وہ اپنے دماغ کو متحرک پائے گا۔ اور دماغ کا متحرک ہونا اُس کی ممکنہ صلاحیتوں کو اجاگر کرے گا۔

28 جون 1946 کو ہندوستان کے عظیم رہنما مہاتما گاندھی جی نے دہلی میں منعقد ایک میٹنگ میں بتایا کہ وہ ہندوستان میں ضرور پیدا ہوئے لیکن اُن کی کردار سازی جنوبی افریقہ میں ہوئی (گاندھی اور جنوبی افریقہ، 1914-1948 ایڈیٹڈ بائی ای ایس راڈے اور گوپال کرشنا گاندھی)۔

اُن کا یہ بیان سچائی پر مبنی ہے لیکن یہ واقعہ کردار سازی کا صرف محل وقوع بتاتا ہے اُس کی اصل وجہ نہیں بتاتا۔ اس معجزے کے رونما ہونے میں جنوبی افریقہ کی سرزمین کا کمال نہ تھا بلکہ یہ فطرتی عمل کا نتیجہ تھا۔ تقریباً دنیا کے سارے عظیم انسانوں کو اسی فطرتی عمل نے تخلیق کیا۔ جب امریکن مشنری ڈاکٹر جان موٹ گاندھی جی سے اُن کے سواگرام آشرم وسطی ہندوستان میں ملے، تو اُنہوں نے گاندھی جی سے پوچھا، ”آپ کی زندگی میں سب سے زیادہ تخلیقی تجربہ کون سا ہے“ گاندھی جی جواب دیا، ”اس طرح کے تجربات تو بیشمار ہیں لیکن آپ کے سوال کے پیش نظر میں آپ کو ایک واقعہ بتاتا ہوں جس نے میری زندگی کا راہ عمل تبدیل کر کے رکھ دی“ پھر اُنہوں نے پیٹر مارٹن برگ میں واقع ہونے والا قصہ سنایا (گاندھی لکھاتہ، اُما شنکر جوتھی)۔

1893 میں گاندھی جی کو تاقانون سے وابستہ نوکری کے سلسلہ میں جنوبی افریقہ جانا پڑا۔ وہ صوبہ ٹرانسوال کے شہر سے پرٹوریا بذریعہ ریل جا رہے تھے اُن کی سیٹ فرسٹ کلاس بوگی میں تھی۔ جب وہ پیٹر مارٹن برگ پہنچے۔ ریلوے ملازمین نے گاندھی جی کو حکم دیا کہ فرسٹ کلاس

سے اتر کر دوسری بوگی میں بیٹھ جائیں۔ کیونکہ کالوں کو فرسٹ کلاس ڈبے میں سفر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ گاندھی جی انھیں اپنا ٹکٹ دیکھا یا، اور کہا میں تو فرسٹ کلاس کی ٹکٹ خرید کر بیٹھا ہوں۔ لیکن ریلوے انتظامیہ نے اُن کی ایک نہ مانی، اور کہا اگر آپ خود نہ اترے تو آپ کو زبردستی اتار دیا جائے گا۔ گاندھی جی نے اُن کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ نتیجتاً انھوں نے گاندھی جی کو شدید سردی کے موسم میں دھکے مار کر ریل سے نیچے اتار دیا، اور اُن کا سامان پلٹ فارم پر پھینک دیا۔

یہی وہ دماغ کو ہلا دینے والا واقعہ تھا جس نے اُن سے دنیا میں نسلی امتیاز کے خلاف جدوجہد کرنے کا فیصلہ کروایا۔

یہاں سے انھوں نے ایک با مقصد سفر حیات شروع کیا۔ 1920 میں انھوں نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز ہندوستان میں کیا۔ اُس وقت یہاں بھی جنوبی افریقہ کی طرح نسل پرست نوا آبادیاتی طاقت برسرِ اقتدار تھی۔ جب وہ جنوبی افریقہ گئے اُس وقت وہ صرف گاندھی تھے لیکن جب انھوں نے اپنے مشن کا آغاز ہندوستان میں کیا تو وہ مہاتما گاندھی بن گئے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بہت سے انسان دھکے کھا کر بڑے انسان بنتے ہیں۔ یہ قانون فطرت ہے۔ اور اسی قانون نے بہت سی عظیم تاریخی شخصیات کو جنم دیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جھٹکا علاج (Shock Treatment) انسانی کردار کی تشکیل میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ایک شرط بھی ہے کہ یہ قانون فطرت صرف اُن لوگوں کے معاملے میں نفع بخش ہے۔ جو ان جھٹکوں کو مثبت انداز میں لیتے ہیں۔ اگر انسان ان جھٹکوں کو منفی انداز میں لے، تو وہ مایوس ہو جاتا ہے۔ اور مایوسی منفی ذہنیت کی پرورش کرتی ہے۔ آخر نتیجہ یہ ہوگا انسان مایوسی میں زندگی گزارے گا اور مایوسی میں اپنے ہاتھوں خود موت کو گلے لگا لے گا۔

جو انسان زندگی کے سفر میں ناگوار دھچکوں کا سامنا حوصلہ مندی سے کرے اور ان دھچکو ں کو بطور ایک چیلنج کے قبول کرے، وہ اپنے دماغ کو متحرک پائے گا۔ اور دماغ کا متحرک ہونا اُس کی ممکنہ صلاحیتوں کو اجاگر کرے گا۔ اُسے جھٹکوں کا احساس ایک نئی طرح کی تحریک دے گا۔ جس

سے وہ بڑے موثر انداز سے ہر قسم کی صورت حال سے نمٹ لے گا۔ اور یہ عمل نئی تخلیقی شخصیت کی تشکیل کا باعث بنے گا۔

جو انسان اس طرح کے جھٹکوں اور صدمات پر مثبت رد عمل کا اظہار کرے، وہ اپنی زندگی میں عظیم جدوجہد کرنے کے لیے فعال ہو جائے گا۔ اگر وہ ان جھٹکوں سے پہلے صرف ایک عام آدمی تھا وہ جھٹکوں کے بعد خاص آدمی یعنی سپر مین بن جائے گا۔ شک ٹریٹمنٹ واضح طور پر کوئی پسندیدہ واقعہ نہیں ہوتا ہے۔ لیکن یہ ہی علاج ہوتا ہے جو اعلیٰ درجے کی تخلیقی صلاحیت پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ جو کہ انسانیت کو وسیع پیمانے پر فائدہ دیتی ہے۔



ہمارے پاس لچکدار رویے کی صلاحیت ہے

خاموش رہیے، اپنے دماغ کو خالی رکھیے، ذہن ایک لمحے میں ہر چیز کو پرسکون کر دے گا۔ اور آپ بہت جلد نارمل ہو جائیں گے

لچک پذیری فطرت کا قانون ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ بیماری سے صحتیابی اور بد قسمتی سے خوش قسمتی کی طرف جلد پلٹنے کی خوبی کے حامل ہونا۔ لچک ہر جگہ پائی جاتی ہے چاہے وہ مادی دنیا ہو یا نباتات، حیوانات اور انسان کی دنیا ہو۔ اور فزکس میں لچک سے مراد ایک ایسی صلاحیت جو جھکاؤ، پچکاؤ اور کھنچاؤ کے بعد دوبارہ اپنی اصل حالت میں آ جاتی ہے۔ یہ بات حیوانات اور نباتات کی دنیا کے لیے بھی درست ہے۔ کیونکہ ہر مخلوق مورٹی طور لچک پذیری کی صلاحیت رکھتی ہے۔

فطرت کے اس گراں قدر انعام میں انسان کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ راکفلر یونیورسٹی میں نیروائینڈ اوکریولوجی لیبارٹری کے سربراہ ڈاکٹر بروس میکون نے اس موضوع پر تحقیق کی اور یہ نتیجہ اخذ کیا: ”انسانی دماغ میں بے پناہ ابھرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ آپ اسے ایک موقع دیں، یہ اپنی تعمیر کی ہر ممکن کوشش کرے گا“

ہم چیلنج اور مقابلے کی دنیا میں رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہم ہر روز کسی نہ کسی ناخوشگوار

واقعہ کا سامنا کرتے ہیں۔ ہر دن ہمیں کوئی نہ کوئی ذہنی یا مادی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ یہ زندگی کا ایسا لاینفک جز ہے کہ اس مسئلے سے کسی انسان کو مفر نہیں ہے۔ اور حقیقت میں یہ مسائل فطرت کا جز ہیں۔ لیکن خوش آئند بات یہ ہے کہ فطرت ان مسائل کا حل بھی پیش کرتی ہے۔ اور وہ حل چک کی طاقت ہے۔

تین حرفی لفظ صبر وہ واحد خوبی ہے جو چک کی طاقت کو مطلوب ہے۔ جب آپ کو داخلی یا خارجی محاذ پر نقصان برداشت کرنا پڑے، تو آپ صابرانہ رویہ بر قائم رہیں۔ اور کچھ دیر کے لیے ذہن کو خالی کر دیں۔ یہی وہ بات ہے جو ڈاکٹر بروس میکون نے ان الفاظ میں کہی ہے کہ اگر آپ دماغ کو ایک موقع دیں۔ تو دماغ فوراً ایک زبردست توانائی خارج کرے گا اور یہ توانائی آپ کو کسی بھی ناگوار صورت حال سے نمٹنے میں مدد دے گی۔ مثال کے طور پر اشتعال انگیز حالات کو دماغ نہایت آسانی سے سنبھال لے گا۔ کسی مادی نقصان کی صورت میں یہ آپ کو بتائے گا کہ نئی منصوبہ بندی کیسے کرنی ہے۔ ذہنی دباؤ کی صورت میں یہ آپ کو بھول جانے والا فارمولہ یاد کرائے گا اور آپ اس کی ہدایت پر چند لمحات میں ذہنی دباؤ سے نجات حاصل کر لیں گے۔

چک کے اس فارمولہ کا اطلاق قومی مسائل پر بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی ایک مثال جاپان کی ہے۔ جاپان پہلا ملک ہے جو ایٹم بم کے مہلک اثرات کا شکار ہوا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اتحادی طاقتوں نے جاپان پر دو ایٹم گرا کر اس کو مکمل طور تباہ کر دیا۔ لیکن شعوری یا غیر شعوری طور پر جاپانی قائدین نے چک کا فارمولہ اختیار کیا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے قومی اہداف کی از سر نو پلاننگ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جس کے نتائج حیران کن تھے۔ کیونکہ صرف تیس سال کے بعد تباہ شدہ جاپان ایک معاشی سپر پاور بن کر دنیا کے نقشے پر ابھرا۔

چک کی حالیہ مثال امریکہ میں سمندری طوفان سینڈی کی ہے جس سے بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی۔ اس آفت کے دوران، ایک سو دس امریکی ہلاک ہوئے اور پچاس ارب ڈالر سے زائد کا نقصان ہوا لیکن ایک مہینے کے اندر اندر امریکہ میں ہر چیز نارمل ہو گئی۔ یہ معجزہ کیسے ہوا؟ اس کا جواب دوبارہ پھر وہی ہے۔ یہ چک کی پوشیدہ طاقت کی وجہ سے ہوا ہے۔ تحقیق بتاتی ہے کہ ہمارا دماغ بے شمار ممکنہ صلاحیتوں کا حامل ہے۔ بلکہ شاید لامحدود

صلاحتوں کا مالک ہے۔ اور ان ممکنہ صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی لچک کی طاقت کرتی ہے۔ عام حالات میں یہ صلاحیتیں خوابیدہ رہتی ہیں۔ لیکن جب کسی کو غیر معمولی کوئی واقعہ پیش آتا ہے۔ تو دماغ متحرک ہو جاتا ہے۔ اور اپنی پوشیدہ توانائی کو فراہم کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اور اگر اس کو موقع دیا جائے، یہ یقینی طور پر ہر طرح کے نقصان کا ازالہ کر دے گا۔ شرط صرف یہ ہے۔ کہ آپ اس کے فطری عمل میں حائل نہ ہوں یا اسے کسی غیر فطری طریقے سے روکنے کی کوشش نہ کریں۔

آپ کا اُس وقت خاموش رہنا جب آپ غصہ میں ہوں۔ چکدار رویہ کا یہ ایک سادہ سا اظہار ہے، خاموش رہیے، اپنے دماغ کو خالی رکھیے تو ذہن ایک لمحے میں ہر چیز کو پرسکون کر دے گا۔ اور آپ بہت جلد نارمل ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر آپ مشتعل ہوتے ہیں اور منفی ردعمل کا اظہار کرتے ہیں، تو پھر آپ کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ بہت جلد نفرت و کینہ میں بدل جائے گا۔ اور پھر بڑھتے بڑھتے تشدد کی شکل اختیار کر لے گا۔



یاد رکھیں ہر چیز عارضی ہے

پرامید رہنے سے مراد یہ ہے کہ انسان یقین رکھے کہ بلا آخر وہ خطرات میں محفوظ رہے گا۔

اور وقتی انتظار اپنی نوعیت کے لحاظ سے عارضی ثابت ہوگا۔

ارنسٹ شاکلیٹن (1874-1922) انٹارکٹیکا کی مہم کے حوالے سے بہت مشہور

ہے۔ اپنی تیسری مہم میں اُسے بہت خطرناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑا، جب اُس کا جہاز ڈوب گیا۔ وہ اور اُس کے گروپ کے ستائیس افراد برف میں پھنسے گئے۔ اور بغیر کسی متعین سمت کے وہ گہرے جنوبی سمندر میں بہہ جا رہے تھے۔ ظاہری طور پر اُنھیں اپنے زندہ بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ اُن کے چھ ماہ تیرتی برف پر بسر ہوئے۔ اس سے پہلے کہ انھیں بچایا جاتا، وہ مزید چار ماہ ایلیفینٹ جزیرے پر رہے۔ لیکن بلا آخر وہ بحفاظت اپنے گھر واپس آ گئے۔

اب سوال یہ ہے: یہ معجزہ کیسے رونما ہوا؟ الفریڈ لیننگ اپنی کتاب برداشت

(Endurance:) میں ارنسٹ شاکلیٹن کے ناقابل یقین بحری سفر کو اس طرح بیان کرتے

ہیں کہ پوری ٹیم کو اس بات پر یقین تھا کہ اُن کی موجودہ صورت حال عارضی ہے۔
 اس معجزانہ فارمولے کا اطلاق صرف شکلیٹن کے قافلہ پر ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کا
 اطلاق ہر انسان پر ہوتا ہے۔ یہاں ہر انسان زندگی میں خطرناک تجربات سے گزرتا ہے۔ لیکن اگر
 آپ یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہر صورت حال عارضی ہے اور یہ مشکل صرف چند دنوں کی طوالت پر
 مشتمل ہے۔ پھر آپ کے پاس بھی شکلیٹن گروپ کی کہانی دوہرانے کی صلاحیت ہے۔
 اس دنیا میں ہر اندھیری رات ایک عارضی مرحلہ اور مختصر دورانیہ ہوتا ہے اور یہ بات
 انسانی مشکلات کے لیے بھی درست ہے ہر انسانی مشکل نوعیت کے لحاظ عارضی اور ناپیدار ہوتی
 ہے۔ ہر پریشانی کا مقدر ہے کہ کچھ عرصے کے بعد ذائل ہو جائے۔ یہ فطرت کا قانون ہے کہ کسی
 مشکل یا پریشانی کو ہیئگی حاصل نہیں ہے۔ اس لیے یہ سادہ فارمولا ذہن نشین کر لیجیے۔ یہ سب کچھ
 عارضی ہے۔

اردو کے شاعر غالب نے ایک شعر میں کہا ہے:

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان
 ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

تاریخ اس فارمولے کی تصدیق کرتی ہے کہ پریشانیوں دن رات کی طرح آتیں ہیں
 اور چلی جاتیں ہیں۔ اس عالمگیر قانون کا اطلاق ہر انسان پر ہوتا ہے۔ پر امید رہنے سے مراد یہ
 ہے کہ انسان یقین رکھے کہ آخر کار وہ خطرات کے جنگل سے بحفاظت گزر جائے گا۔ اور وقتی
 انتظار اپنی نوعیت کے لحاظ سے عارضی ثابت ہوگا۔ آپ کے لیے بہت بڑی مصیبت جنم لے سکتی
 ہے اگر آپ کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ جائے یا امید کا چراغ بجھ جائے یا آپ مشکل
 صورت حال کو دائمی تصور کرنے لگیں۔

جب آپ پریشانیوں سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں تو آپ بہتر پوزیشن میں ہوتے ہیں
 کہ اپنی توانائیوں کو محفوظ رکھیں۔ اور مایوسی کا شکار ہونے سے بچیں۔ کیونکہ مایوسی ذہنی صلاحیتوں کو
 دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے۔

گھر، سماج، قومی اور بین الاقوامی سطح پر سنجیدہ مشکلات موجود ہیں۔ الغرض زندگی کے

ہر موڑ پر آپ کو کچھ مسائل ضرور ملیں گے۔ ان مسائل کو کامیابی سے حل کرنے کا سادہ فارمولہ یہ ہے کہ آپ سوچیں کہ ہر مشکل عارضی ہے ہر پریشانی کا دورانیہ لامحدود نہیں بلکہ محدود ہے۔ جس طرح ہر انسان کا مقدر بلا خرموت ہے اس طرح ہر انسانی مشکل کا مقدر بھی اُس کا ختم ہونا ہے۔ یہ مسائل پریشانیاں جلد یا بدیر گزر جائیں گی۔

حقیقت میں مشکلات کا احساس ایک دماغی کیفیت ہے۔ کیونکہ دماغ وہ جگہ ہے جہاں مشکلات جنم لیتی ہیں اور یہ ہی وہ مقام ہے، جس کو مشکلات کا جائے مدفن بنایا جاسکتا ہے۔ جب انسان مشکلات کا سامنا کرتا ہے تو وہ عام طور پر بہت اہم حقیقت فراموش کر دیتا ہے۔ کہ وہ دماغ کی صورت میں خود مسائل حل کرنے والی مشین رکھتا ہے۔ انسانی دماغ کی صلاحیتیں ہر چیز سے زیادہ ہیں حتیٰ کہ مشکلات سے بھی چاہے وہ کتنی بھی بڑی کیوں نہ ہوں۔ لہذا کسی بھی مشکل صورت حال میں پریشانی پر نظر رکھنے کے بجائے اپنی دماغی صلاحیتوں کو مہینر لگائیں۔ نتیجتاً آپ بہت جلد دیکھ لیں گے کہ مشکل پہلے نفیساتی سطح، پھر فزیکل طور پر غائب ہوگی۔

مزید مشکلات کا ایک اُثباتی پہلو بھی ہے۔ یہ آپ کی پوشیدہ صلاحیتوں کو باہر لاتا ہے: یہ مصیبت کے بجائے رحمت ہے۔ کیوں کہ یہ مشکل ہی تھی جس نے عام شاکلیٹین کو ہیرو شاکلیٹین بنا دیا۔



اقلیت نئی تہذیب کی بانی

مثبت قیادت اپنے لوگوں کی صحیح سمت کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ تاکہ وہ شکایت در شکایت کرنے کے بجائے جو درست ہے اُس کے لیے جدوجہد کریں۔

برطانوی تاریخ دان آرنلڈ ٹائن بی (1889-1975) اپنے بارہ جلدوں پر مشتمل کام ”تاریخ کا مطالعہ“ کی وجہ سے مشہور ہیں۔ جو 1934 سے لیے 1961 کے درمیان شائع ہوا۔ انھوں نے اپنی اس تحقیق میں پوری انسانی تاریخ کی چھبیس تہذیبوں کے عروج و زوال کا جائزہ لیا۔ اور تہذیبوں کی نشوونما اور انتشار کے حوالے سے نظریہ پیش کیا۔ اُن کے تجزیے کے

مطابق تاریخ (History) فطرت کے قانون کے زیر اثر ہے اس قانون کی بنیاد جس طریقہ کار پر ہے اُس کے لیے وہ ”چیلنج اور رد عمل“ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے نظریہ کے مطابق تمام عظیم تہذیبیں اقلیتی گروپوں نے تخلیق کیں ہیں۔

اقلیت ہمیشہ تاریخی حقائق کے زیر اثر آتی ہے۔ جو اقلیت میں کام کرنے کا جذبہ پیدا کرتے ہیں یہ جذبہ اقلیت کی صلاحیتوں میں بے پناہ اضافہ کا سبب بنتا ہے اور بلاخر وہ اقلیت اپنے ملک یا اپنے علاقہ کا سب سے زیادہ تخلیقی طبقہ بن جاتا ہے۔ تمام تہذیبیں اقلیتوں کی اسی جدوجہد اور کوششوں کا نقطہ عروج ہیں۔

صرف فطرت کا قانون اقلیت میں تخلیقی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ بلکہ یہ قانون ایک سمجھدار قیادت کا تقاضا بھی کرتا ہے۔ یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ اقلیت ہمیشہ اکثریت کے زبردباؤ ہوتی ہے۔ لیکن یہ تو ایک قدرتی امر ہے اس میں کسی کو استثنا نہیں ہے۔ تاہم یہ اکثریت اور اقلیت کے مابین بہت ہی نازک صورت حال ہوتی ہے۔ ایسے ہی موقع پر اقلیت کی قیادت کا امتحان ہوتا ہے۔ اگر اقلیتی قیادت اکثریت کے دباؤ کو بطور منفی تجربے کے لے لے اور شکایت اور احتجاج کے راستے پر چل پڑے تو نتیجتاً اقلیتی طبقہ تباہ ہو جائے گا۔ کیونکہ احتجاجی اور شکایتی قیادت اپنے لوگوں میں منفی کردار ادا کرتی ہے۔ عربی کے ایک شعر میں اس نوعیت کی قیادت کے بارے میں کہا گیا ہے۔ ’کہ جب کسی قوم کا قائد کو ابن جائے تو وہ یقینی طور پر اپنی قوم کی تباہی کا باعث بنے گا‘

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ جب اقلیت اکثریت کے دباؤ میں ہو، اور مسائل کے گرداب میں پھنس جائے۔ تب اُن کی قیادت مثبت کردار ادا کرے۔ تب یہ ہی اقلیتی قوم کے قائدین اپنی قوم کو بتاتے ہیں۔ یہ صورت حال جس کا آپ سامنا کر رہے ہیں یہ مسئلہ نہیں بلکہ چیلنج ہے جس کو آپ نے قبول کرنا ہے اور اسے پورا کرنے کے لیے قوم کو اپنی ساری توانیاں صرف کر دینی چاہئیں۔ اس طرح کی مثبت قیادت اپنے لوگوں کی صحیح سمت کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ تاکہ وہ شکایت در شکایت کرنے کے بجائے درست لائحہ عمل کے لیے جدوجہد کریں۔ اسی قسم کی مثبت ذہن قیادت لوگوں کو صحت مند کردار ادا کرنے کے کی طرف راغب کرتی ہے۔ اور نئی

تہذیب کو ترقی کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔
 اس قانون کا مطلب ہے کہ اقلیت ہمیشہ افادی پہلو رکھتی ہے جس کے ذریعہ وہ
 اکثریت پر غالب آسکتی ہے۔ ہر اقلیت ممکنہ طور پر اس پوزیشن میں ہوتی ہے کہ وہ دنیا کو نئی
 تہذیب کا تحفہ دے۔



کمزور اور طاقتور دونوں کی بقا

مسابقت چیلنجز تخلیق کرتی ہے اور چیلنجز جدوجہد کو تیز کرتے ہیں
 اس طرح یہ چیلنجز کامیابیوں کے نئی بلندیوں کو چھوتے ہیں۔

ایک طرف جدید صنعت انسانیت کے لیے رحمت ہے۔ تو دوسری طرف یہ خراب اور
 غیر مناسب صورت حال کا باعث بھی ہے۔ اس میں بڑے سرمائے دار بازار کے اجارہ دار بن
 بیٹھے ہیں۔ جبکہ چھوٹے کاروبار کرنے والے لوگ محروم طبقہ میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ صورت حال
 معیشت میں ایک نئے قول کو جنم دیتی ہے کہ مقابلہ یا موت۔

انگریز مفکر ہربرٹ سپنسر (1820-1903) نے اس کی وضاحت ایک نظریے کے
 ذریعہ کی ہے جس کے لیے انہوں نے سوشل ڈارونیزم کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اُن کے
 نظریہ کے مطابق معاشرہ بھی ایک جاندار جسم کی طرح ہوتا ہے۔ جیسے جاندار جسم قدرتی طریقہ کار
 سے نشوونما پاتے ہیں۔ اس طرح انسانی معاشرہ قانون بقا اصلح کی بنیاد پر نشوونما پاتا اور اپنی
 پیچیدگیوں میں اضافہ کرتا ہے۔ کامیاب اقوام کا زندگی کی جدوجہد میں تحفظ اسی قانون بقا اصلح
 (Survival to the fittest) کی اساس پر ہے۔ جس کا ڈارون نے بیالوجیکل مسئلے پر
 اطلاق کیا ہے۔ اور سپنسر نے سماجی اکناک مسئلہ پر اس کا اطلاق کیا ہے۔

سائنس میں ڈارون نظریہ ابھی تک ایک متنازع نظریہ ہے۔ اس موقع پر میں اس کے
 بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ البتہ سوشل ڈارونیزم کے بارے میں چند جملے کہنا ضرور پسند کروں گا۔
 یہ حقیقت ہے کہ سوشل اکناک زندگی میں مقابلہ ہے۔ لیکن یہ مقابلہ کوئی مصیبت نہیں ہے۔

مقابلے کے دوران ممکن ہے ایک طبقہ عارضی طور پر مراعات یافتہ بن کر سامنے آئے۔ اور دوسرا گروہ اس کے مقابلہ میں محروم ہو۔

تاہم یہ صورت حال نتائج کے حوالے سے مثبت ثابت ہوتی ہے۔ جلد یا بدیر فطرت کے قانون کے مطابق محروم (Deprived) طبقہ میں ایک نئی روح ہوتی ہے۔ جو اس طبقہ کو موجودہ صورت حال کے منفی پہلوؤں پر غالب آنے کے لیے انقلابی کردار ادا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ اگر محروم طبقہ پہلے غیر تخلیقی گروہ پر مشتمل تھا لیکن اب وہ حالات کے دباؤ کے زیر اثر ایک تخلیقی گروہ بن کا ابھرے گا۔

یہ ذہن میں رکھ کر، ایک آدمی پورے وثوق سے کہہ سکتا ہے۔ کہ 'مقابلہ یا موت' ایک غلط محاورہ ہے۔ معیشت میں نشیب و فراز تسلسل سے آتے رہتے ہیں۔ مقابلہ صرف سرمایہ سے متعلق نہیں ہے۔ یہ فطرت سے متعلق ہے جو کہ لازمی طور پر مقابلے کو فروغ دیتی ہے۔ مسابقت چیلنجز تخلیق کرتی ہے اور چیلنجز جدوجہد کو تیز کرتے ہیں اس طرح یہ چیلنجز کامیابیوں کی نئی بلندیوں کو چھوتے ہیں۔۔ اس پس منظر میں بہترین قول مقابلہ یا موت کے بجائے مقابلہ کرو، اور آگے نکل جاؤ۔

لہذا قانون فطرت کی پیروی کرتے ہوئے، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صرف طاقتور کی نہیں بلکہ دونوں کی بقا کا بہترین فارمولا 'مقابلہ کرو، اور آگے نکل جاؤ' ہے۔



آخر میں ہمیشہ روشنی ہوتی ہے

ناکامی آپ کو اپنے مقصد کے حصول کا مزید شائق بنا دیتی ہے۔ یہ فکر انگیز (Brainstorming) اور ذہنی ارتقا کا بہترین ذریعہ ہے۔

ایک کہاوت ہے کہ سرنگ کے اختتام پر ہمیشہ روشنی ہوتی ہے۔ اگر آپ سرنگ میں داخل ہوں تو سب سے پہلے آپ ہر طرف اندھیرا محسوس کریں گے، تاہم اگر آپ چلتے جائیں تو کچھ دیر کے بعد آپ اپنے آگے ایک روشنی کا دائرہ پائیں گے۔ اور جب سرنگ کے آخر میں پہنچیں

گے تو آپ اپنے آپ کو روشن دن اور کھلی ہوا میں پائیں گے۔
 سرنگ فزیکل دنیا کی ایک مثال ہے۔ اس مثال کا اطلاق انسانی دنیا پر بھی ہوتا ہے۔
 جس میں زندگی ایک ایسا سفر ہے جس میں شاذ شاذ ہی ہموار راستہ آتا ہے۔ اس سفر میں جگہ جگہ
 پریشائیاں، ناپسندیدہ صورت حال اور کبھی کبھی تاریک اندھیرا ہوتا ہے۔ لیکن اگر آپ اُمید اور
 حوصلہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ تو وہ لمحہ ضرور آئے گا جب آپ سرنگ کے اختتام پر روشنی تک
 جا پہنچیں گے۔ کسی بھی مطلوبہ منزل کے سفر میں یہ رکاوٹیں کیوں ہیں۔ سمجھیں یہ مشکلات آپ
 کے تجربے میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ اپنے مقصد کے حصول میں سنجیدگی، آپ کی تخلیقی
 صلاحیتوں کو وسعت دیتی ہیں۔ اس طرح مشکلات آپ کی استقامت کو تقویت دیتی ہیں۔ اور
 زندگی کی اعلیٰ اقدار آپ کے ذہن نشین کراتیں ہیں۔ بغیر مشکل سفر کا تجربہ حاصل کیے، آپ کبھی
 بھی اعلیٰ خوبیوں کی آبیاری نہیں کر سکتے۔ یہ سب آپ کی بہتری کے لیے ہے۔ اسکاٹش مصنف
 سمونل سائل نے درست کہا ہے: ’ہم کامیابی کے مقابلے میں ناکامی سے زیادہ دانائی کا سبق لیتے
 ہیں۔‘

اس کے پیچھے کیا وجہ ہے۔ وجہ یہ ہے۔ کہ ناکامی آپ کو اپنے مقصد کے حصول کا مزید
 شائق بنا دیتی ہے۔ یہ فکر انگیز (Brainstorming) اور ذہنی ارتقا کا بہترین ذریعہ ہے۔ اور
 یہ آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرواتی ہے کہ آپ اپنی پلاننگ کا ایک دفعہ پھر جائزہ لیں اور اپنے
 مقصد کے حصول میں مزید موثر بننے کا باعث بنیں۔
 کامیابی آپ کے لیے اطمینان کا باعث بنتی ہے۔ یہ اطمینان آپ کے تفکیر عمل کو جمود
 کا شکار کرتا ہے۔ دوسری طرف ناکامی آپ کو عدم اطمینان دیتی ہے۔ اور عدم اطمینان زندگی میں
 جہد مسلسل کا سبب بڑا ذریعہ ہے۔



IV

مسرت کا فارمولا

خوشی آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے

جب آپ کسی مسئلے کو مسئلہ سمجھتے ہیں تو یہ ایک مصیبت بن جاتا ہے۔ جب آپ اسے بطور ایک چیلنج قبول کرتے ہیں، تو یہ زندگی کا ایک ایسا مفید حصہ بن جاتا ہے۔ جو آپ کی عقل و دانش کو ہمیز دیتا ہے۔

مثبت نفسیات نامی امریکی اخبار میں ایک رپورٹ شائع ہوئی، جس میں اُن تجربات کی تفصیلات بتائیں گئیں جو خوش رہنے کے حوالے سے کیے گئے۔ شرکاء تحقیق کو پُر مسرت موسیقی سنائی گئی۔ اور جن شرکاء نے خوش کو محسوس کرنے کی کوشش کی۔ بعد ازاں انھوں بتایا کہ انھوں نے اپنے مزاج کو اعلیٰ درجے میں مثبت پایا (دسمبر ۱۹، ۲۰۱۲)۔

اس طرح کی مسرت یقینی طور پر مصنوعی ہے۔ کیونکہ زندگی مسائل سے بھرپور ہوتی ہے۔ اور جب آپ بناوٹی طریقے مثلاً موسیقی سے لطف اندواز ہو کر خوش رہنے کی کوشش کریں گے۔ تو یہ بات طے ہے کہ مسائل جوں کے توں آپ کے ارد گرد موجود رہیں گے۔ اور آپ اپنے دماغ کو اُن مسائل پر غور کرنے سے روک بھی نہیں سکتے۔ ایسے میں موسیقی کے ذریعہ مسرت کا حصول ایک مصنوعی طریقہ اور حقیقت سے متصادم ثابت ہوگا۔

اس طریقے سے مطلق خوشی حاصل کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ آپ داخلی طور پر افسردہ ہوں لیکن مصنوعی طور پر مسکراتے چہرے سے خوش خوش نظر آئیں۔ اس لیے یہ بات مصدقہ ہے کہ حقیقی خوشی کے علاوہ کوئی بھی چیز آپ کے اطمینان کا باعث نہیں بن سکتی۔ مذکورہ تجربے میں عارضی خوشی کے علاوہ کچھ بھی حاصل نہیں ہوا ہے۔ بہتر ہوگا کہ اس خوشی کو خود فریبی پر محمول کریں۔

اگر محققین اپنے دائرے تحقیق میں شرکاء کی ساری زندگی کو شامل کرتے۔ تو یہ حقیقت اُن محققین پر واضح ہو جاتی کہ موسیقی سے خوشی حاصل کرنے والے لوگ آخر کار سست و کاہل ہو گئے۔ کیونکہ حقیقی زندگی میں مسائل ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ اس لیے آپ کا خوش رہنا اسی صورت ممکن ہے جب آپ اپنے تفکیری عمل کو روک دیں۔ اور اگر یہ طویل مدت تک روکا رہے گا۔ تو آپ کو تاہ نظر اور ذہنی بونے بن جائیں گے۔

خوشی حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ مسائل کو بھول جانے کے بجائے اُن کو حل کریں۔ مسائل انسان نہیں فطرت پیدا کرتی ہے۔ چونکہ فطرت کے نزدیک مسائل کوئی رکاوٹ نہیں ہیں بلکہ یہ چیلنج ہوتے ہیں۔ اس لیے جب آپ کسی مسئلہ کو مسئلہ سمجھتے ہیں تو یہ ایک مصیبت بن جاتا ہے۔ جب آپ اسے بطور ایک چیلنج قبول کرتے ہیں، تو یہ زندگی کا ایک ایسا مفید حصہ بن جاتا ہے۔ جو آپ کی عقل و دانش کو ہمیز دیتا ہے۔

عام تجربات کو لیجیے جن کے لیے کسی گہری تحقیق کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے پڑوس میں سے دو افراد کا انتخاب کریں۔ ایک وہ جو منہ میں سونے کا چچھ لے کر پیدا ہوا ہو، اور اُس نے کبھی مشکل حالات کا سامنا نہ کیا ہو۔ دوسرا وہ شخص جو غربت کے ماحول میں پیدا ہوا ہو، اور مسائل کو بطور چیلنج قبول کرنے کے علاوہ اُس کے پاس کوئی چارہ نہ ہو۔ اور وہ اپنی کامیابی کے لیے جدوجہد کرتا رہا ہو۔ آپ یقینی طور پر مشاہدہ کریں گے کہ اول الذکر شخص ذہنی بونے پن کا شکار ہے۔ جب کہ موخر الذکر کشادہ ذہن ہے۔

برطانوی تاریخ دان آرئلڈ ٹائن بی نے انتہائی بصیرت افروز فارمولہ تشکیل دیا ہے جیسے وہ چیلنج پر جوابی رد عمل کا طریقہ کہتا ہے۔ اُس کے فارمولے کے مطابق: مسئلہ چیلنج پیدا کرتا ہے۔ چیلنج جوابی رد عمل کا باعث بنتا ہے۔ اور یہ جوابی رد عمل کامیابی کا پیشہ خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ چیزوں کے بارے میں فطرت کی یہ ہی اسکیم ہے۔ اور اس دنیا میں مثبت نتائج صرف فطرت کے راستے پر چل کر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ کوئی بھی شخص فطرت سے بہتر فارمولہ نہیں بنا سکتا۔

فطرت کے قانون کے مطابق خوشی سب سے اعلیٰ خوبی نہیں بلکہ جدوجہد سب سے اعلیٰ خوبی ہے۔ وہ انسان جو محنت و جدوجہد سے اعراض کرتا ہے اور خوش خوش رہنے کی کوشش کرتا ہے

درحقیقت وہ احمقوں کی جنت میں رہتا ہے۔ اس قسم کی مصنوعی خوشی کا کچھ عرصہ بعد زوال مقدر ہوتا ہے۔ اس قسم کے لوگ عارضی طور پر پُرمسرت کیفیت میں رہتے ہیں۔ لیکن اُن کے نصیب میں بلا خرافہ زندگی ہوتی ہے۔

خوشی نہیں، سنجیدگی، سہولت نہیں، جدوجہد، عیش و آرام نہیں، محنت و مشقت یہ ہی زاد سفر زندگی میں اہمیت رکھتا ہے۔ یہی قدرتی راستہ ہے اور اسی راستے پر چل کر انسان حقیقی کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔



عمر رسیدگی۔۔ ایک نعمت

یہ حقیقت ہے کہ عمر رسیدگی کچھ مسائل پیدا کرتی ہے تاہم آپ اسے نارمل لیں، اور اپنے آپ کو منفی سوچ سے بچائیں۔ اپنے دماغ کو بیدار کر کے آپ مثبت نکتہ نظر کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔ امریکہ میں ایک اعلیٰ یونیورسٹی کے زیر سرپرستی ”ڈہنی شعبہ میں ترقی 2008“ کے عنوان سے تحقیقاتی منصوبوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے نتائج اخبار نیویارک ٹائمز میں بہت ہی بامعنی عنوان ”واقعی ایک عمر رسیدہ دماغ دانش مند ہو سکتا ہے 20 مئی 2008“ سے شائع ہوئے۔ اس تحقیق کے مطابق محققین اس نتیجے پر پہنچے کہ بڑھاپا ایک مصیبت نہیں بلکہ ایک رحمت ہے۔ اس تحقیق کی روح یہ ہے کہ عمر رسیدگی ایک ایسا مقام ہے جہاں انسان کی ڈہنی ترقی اور عقلی سفر اپنے نقطہ عروج پر ہوتا ہے۔ حقیقت میں عمر رسیدگی مزاج کی پختگی، وسیع تجربات اور دانائی کی علامت ہے۔ مشہور کہاوت ”نیا نودن پرانا سودن“ اس کا اظہار بالکل ٹھیک ٹھیک ادا کرتی ہے۔

ہماری جسمانی صحت کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہمارے جسم میں کس قدر کیلوریز ہیں۔ جب کہ دماغ کا معاملہ دوسرا ہے یہ ہمارے جسم کا ایک علاحدہ خود مختار عضو ہے۔ اس لیے ہماری ڈہنی صحت مکمل طور پر مثبت سوچ پر منحصر ہوتی ہے۔ اگر آپ بڑھاپے سے پہلے مثبت ذہنیت کو برقرار رکھتے ہیں، پھر آپ بڑھاپے میں پوری طرح اپنی دماغی صحت سے لطف اندوز ہوں گے۔

بھلے آپ کی جسمانی صحت شکست و ریخت کا شکار ہی کیوں نہ ہو۔ وہ تمام لوگ جو اپنی پختہ عمر کو پہنچ گئے ہیں وہ ممکنہ طور پر یہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ صرف شرط ایک ہے کہ آپ اپنی مثبت ذہنیت کو برقرار رکھیں۔

یہ حقیقت ہے کہ عمر رسیدگی کچھ مسائل پیدا کرتی ہے تاہم آپ اسے نارمل لیں اور اپنے آپ کو منفی سوچ سے بچائیں۔ اپنے دماغ کو بیدار کر کے آپ مثبت نکتہ نظر کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔ یہ ہی واحد راستہ ہے۔ اگر ایک بوڑھا آدمی اس راستہ پر چلتا ہے۔ وہ یقینی طور پر ایک دانش ور بن کر اپنا لوہا منوائے گا۔

بغیر کسی شک کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بڑھاپا انسان کی زندگی کا بہترین حصہ ہے۔ بڑھاپے کا مطلب زیادہ تجربہ و اخلاص، مزید علم و دانائی اور ذہنی پختگی کا حامل ہونا ہے۔ یہ تمام خوبیاں کسی بھی انسان کو منصب احترام پر فائز کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اس صورت حال کے مطابق، پختہ فکر انسان ایک این جی او کی مانند بہت سے قابل قدر کام کر سکتا ہے جیسے اپنی یادداشتیں لکھنا، مشاورتی مرکز کھولنا وغیرہ۔ عمر رسیدہ شخص ایک ایسے بہتر مقام پر ہوتا ہے کہ جہاں سے وہ معاشرے یا انسانیت کو وہ قیمتی تحفہ دے سکتا ہے جو اسے جوانی میں دنیا ممکن نہ تھا۔ انسان کو فطرت کے مہیا کردہ موقع جاننا چاہیے۔ اور اس موقع کو جیسے بھی مناسب ہو استعمال کرنا چاہیے۔

لوگ بڑھاپے کو نہ صرف اپنے لیے بلکہ دوسروں کے لیے بھی بوجھ سمجھتے ہیں۔ عمر رسیدہ افراد یہ سوچنے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ کہ اب وہ بیکار ہو گئے ہیں۔ یہ مسئلہ ان کی عمر رسیدگی کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ بڑھاپے میں لوگ منفی ذہن ہو جاتے ہیں اس لیے پیدا ہوتا ہے۔ وہ منفی کوشش بنانے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ یہ جسمانی مسئلہ کے بجائے عقل و دانش کا مسئلہ ہے۔ میں بہت سے عمر رسیدہ افراد کو جانتا ہوں جو بہت ہی مفید کام کر سکتے ہیں لیکن اپنی منفی ذہنیت کی وجہ سے وہ اس مہیا کردہ موقع سے فائدہ اٹھانے میں ناکام ہوتے ہیں۔

میں اپنی نوے سال کی عمر میں بھی ایک لکھاری ہوں۔ جو لوگ میرے مضامین پڑھتے ہیں وہ تبصرہ کرتے ہیں کہ میرے موجودہ مضامین میرے شروع کے مضامین سے زیادہ واضح اور قابل فہم ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ میں نے ہمیشہ ذہنی دباؤ سے

آزاد زندگی گزارنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اُن تمام مسائل کا سامنا کیا جو لوگوں کو منفی ذہن بناتے ہیں لیکن میں نے منفیت کو منج (Manage) کرنے کا ہنر سیکھا۔ اسی وجہ سے میں اپنے بڑھاپے میں بھی مکمل مثبت ذہن کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوں

میرے تجربے کے مطابق زیادہ تر پریشانیاں حقیقی ہونے کے بجائے محض خیالی ہوتی ہیں۔ اگر آپ میں حقیقی اور خیالی پریشانی میں فرق کرنے کی صلاحیت ہو تو پھر بہت جلد یہ معلوم کر لیں گے کہ جس کو آپ حقیقی سمجھ رہے تھے وہ تو محض خیالی پریشانی تھی۔ چیزوں کو الگ الگ کرنا سیکھیں۔ یہ زندگی کی آخری سانس تک آپ کے نارمل اور مثبت رہنے کا باعث بنے گا۔



پُرسرت زندگی کا فارمولا

ہر مسئلہ دماغ سے شروع ہوتا ہے اور دماغ میں ہی حل کیا جاسکتا ہے۔ یہ اپنے ذہنی گیز کو تبدیل کرنے کے مترادف ہے۔ اگر آپ اپنی فہم و فراست کا گیز تبدیل کر لیتے ہیں تو پھر ذہنی دباؤ سے آزاد ہونے کا سب سے اعلیٰ نسخہ جانتے ہیں۔

اپنے امریکہ کے دورے کے دوران میری ملاقات محترم ایس اے سے ہوئی، میں نے اُنہیں دوسروں سے مختلف پایا۔ وہ ہمیشہ خوش و خرم رہتے تھے۔ اُن کے ساتھیوں نے بھی میرے اس خیال کی تائید کی وہ دوسرے لوگوں سے علیحدہ طبیعت کے مالک تھے۔

ایک دن گفتگو کے دوران میں نے اُن سے پوچھا کہ وہ کیسے ذہنی تناؤ سے آزاد زندگی گزارتے ہیں۔ جب کہ دوسرے لوگ ٹینس میں اپنی عمر بسر کرتے ہیں۔ وہ مسکرائے اور کہا: ”خدا نے مجھے تخلیق کیا اور اس سانچے میں ڈھال دیا“

پھر میری خوش قسمتی کہ مجھے محترم ایس اے نے اپنے گھر چند دن رہنے کی دعوت دی۔ اُن کے ہاں قیام نے مجھے موقع دیا کہ میں اُن کی شخصیت کی اس پُر اثر خوبی کو دریافت کروں۔ میرا اُن کے ہاں قیام ایک نئی دریافت کا باعث بنا۔ کیونکہ میں نے اُن کی خوش و خرم اور ٹینشن فری

زندگی کا بھید دریافت کر لیا تھا۔

میرے قیام کے دوران، ایک دن اُن کا ایک رشتے دار بہت ہی مشتعل حالت میں آیا۔ اُس نے کہا: ”فلاں شخص آپ کی شخصیت کو غلط رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور آپ کے خلاف منفی پروپیگنڈا میں مصروف ہے۔“ آنے والے صاحب مسلسل اپنی دھن میں بولتے رہے، لیکن محترم ایس اے صاحب نے اُنھیں نہایت تحمل سے سنا۔ آخر آنے والے صاحب نے کہا کہ میں نے آپ کو بہت سی تلخ باتیں بتائیں، لیکن آپ نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ محترم ایس اے صاحب نے پرسکون انداز میں کہا: ”یہ اُن کا پرابلم ہے میرا پرابلم تو نہیں“ اگلے دن ہم نے مختلف سیاحتی مقامات پر جانے کا پروگرام ترتیب دیا۔ لیکن کسی وجہ سے عین وقت پر میں نے اُن سے کہا: ”میرے باہر جانے کا ارادہ نہیں ہے، آج گھر پر ہی رہتے ہیں“ محترم ایس اے صاحب نے انتہائی تحمل سے کہا: ”چلو یہ بھی ٹھیک ہے“

اُن کے گھر قیام کے دوران میں نے خوش رہنے کے یہ دو فارمولے دریافت کیے۔ میرا خیال ہے ان فارمولوں کا اطلاق ہر انسان پر ہو سکتا ہے۔ ہر کوئی ان فارمولوں کو اختیار کر سکتا ہے اور ذہنی دباؤ سے آزاد پُرسرت زندگی گزار سکتا ہے۔

پہلا فارمولا یعنی (”یہ اُن کا پرابلم ہے میرا پرابلم تو نہیں“) کو ہم مسائل مینجمنٹ کا فن کہہ سکتے ہیں۔ زندگی میں ہمیشہ مسائل ہوتے ہیں۔ اس کا بہترین حل یہ ہے کہ ہم ان مسائل سے پریشان ہونے کے بجائے اُنھیں مینج (Manage) کرنے کی کوشش کریں۔ اس لیے آپ کو مسائل مینجمنٹ کا فن سیکھنا چاہیے۔ پھر آپ ایسی زندگی کے حامل ہوں گے جس میں ٹینشن اور دباؤ کا گزر نہ ہوگا۔

دوسرے فارمولا (”چلو یہ بھی ٹھیک ہے“) کو ان الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں کہ اگر آپ کو پہلا اچھا موقع نہ ملا تو دوسرے اچھے حل سے مطمئن رہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر صورت حال میں کوئی نہ کوئی ایسا حل ضرور ہوتا ہے جس کو ہم دوسرا سنہرے موقع کہہ سکتے ہیں۔ اور صورت حال یہ تقاضا کرتی ہے کہ پہلے اچھے موقع کو بھول جائیں اور دوسرے اچھے موقع کو اختیار کر لیں۔ نفسیات کے مطالعہ کے مطابق، ہر مسئلہ دماغ سے شروع ہوتا ہے اور دماغ میں ہی حل

کیا جاسکتا ہے۔ یہ اپنے ذہنی گیسر کو تبدیل کرنے کے مترادف ہے۔ اگر آپ اپنی فہم و فراست کا گیسر تبدیل کر لیتے ہیں تو پھر ذہنی دباؤ سے آزاد ہونے کا سب سے اعلیٰ نسخہ جانتے ہیں۔

انسان ہر چیز سے بڑا ہے۔ آپ ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہیں۔ لہذا ہمیشہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کریں۔ اگر کسی صورت حال میں آپ نے کچھ ضائع کر دیا ہے۔ تو بھی آپ اپنی شکل میں کچھ باقی رکھتے ہیں۔ اس لیے جو ضائع ہو گیا اُسے بھول جائیں اور جواب بھی آپ کے لیے باقی ہے اُسے لے لیں۔ یہ پُرسرت زندگی گزارنے کا بہترین فارمولا ہے۔

اکثر پُرسرت زندگی ناخوشگوار حالات میں حاصل کی جاسکتی ہے۔ زندگی ایک آرٹ آف مینجمنٹ ہے۔ آپ دنیا کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ لیکن دنیا میں پُرسرت مقام حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو مینج (Manage) کر سکتے ہیں اس دنیا میں خوش رہنے کے لیے یہ ہی واحد فارمولا قابل عمل ہے۔



اپنی زندگی آپ گزاریں

اپنی ذات کی دریافت کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، اور پھر مصمم ارادے

کے ساتھ اپنے لیے کھڑے ہو جائیں

ایسی صورت حال تصور کریں جس میں کوئی شخص آپ کو مشتعل کر دیتا ہے۔ اور آپ سخت برہم ہو جاتے ہیں: کوئی آپ کو آج دیتا ہے تو آپ پھٹنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ کوئی آپ سے بگڑ کو بولتا ہے تو آپ اُس سے خفا ہو جاتے ہیں۔ کوئی آپ کو نقصان پہنچاتا ہے، تو آپ اُس سے بدلہ لینے کی ٹھان لیتے ہیں۔ اس طرح کے تمام واقعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ آپ دوسروں کے زیر تسلط ہیں۔ اُن کے زیر اثر جو وہ چاہتے ہیں وہ بن چکے ہیں آپ نے اُنہیں اپنا آقا تسلیم کر لیا ہے۔ (آپ کا روموٹ کنٹرول دوسروں کے پاس ہے)

اس طرح کے تمام معاملات میں دوسرے آپ کو احکامات دے رہے ہیں۔ درست طریقہ یہ ہے کہ آپ دوسروں کے احکامات ماننے سے انکار کر دیں، اور اپنی زندگی خود گزاریں۔

آپ کو اپنی محنت کے بل بوتے پر ترقی کرنی چاہیے، آپ کو ایسا طرز عمل اپنانا چاہیے، جس میں کسی کو اجازت نہ ہو کہ وہ آپ کو احکامات دے سکے، یا آپ کو ذہنی الجھاؤ میں رہنے پر مجبور کر سکے۔ یہ دنیا ایسے لوگوں سے بھری ہوئی ہے جنہیں آپ کی ذات میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ آپ کے احساسات کو قطعاً اہمیت نہیں دیتے۔ ہر ایک کو اپنے مفادات سے سروکار ہے اور کسی کو آپ کے ذاتی مفادات سے غرض نہیں ہے۔ آپ کے پاس اپنی ذات کی دریافت کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، اور پھر مصمم ارادے کے ساتھ اپنے لیے کھڑے ہو جائیں۔ صرف آپ ہی اپنے ہیں۔ کوئی اور آپ کا نہیں ہے۔ اس صورت حال میں آپ کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ کیا چیز آپ کے لیے اچھی اور کیا بری ہے۔ اور اس مسئلے کو اپنے دماغ میں خود حل کرنا چاہیے۔ آپ کو دوسروں پر اعتماد کرنے کے بجائے خود دانشمند ہونا چاہیے جب دوسرے آپ کے نام پر دھبہ لگانے کی کوشش کریں تو آپ پریشان نہ ہوں۔

بیجمن فرینکلن کا قول ہے ”خدا ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں“ یہ قول مکمل طور پر قانون فطرت کے مطابق ہے۔ جس کے تحت ہر کوئی اپنی بہبود کا خود ذمہ دار ہے۔



مثبت سوچ کی کیسے نشوونما کریں

منفی سوچ بڑی آسانی سے اچھی سوچ کو ختم کر سکتی ہے۔ لہذا اس کو دور رکھنے کے لیے ٹھوس اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثبت سوچ کے لیے آپ کو صرف اپنی آنکھیں کھولی رکھنے کی ضرورت ہے۔

تمام اچھائیوں کا ماخذ مثبت سوچ ہے۔ اس لیے یہ تمام مرد و عورت کی سب سے اہم عادت ہے۔ یہ اچھی صحت اور صالح ذہنیت کی ضمانت ہے۔ یہ آپ کو اس قابل بناتی ہے کہ آپ اپنے منصوبوں کی تکمیل کریں، یہ بحرانی صورت کو منیج (Manage) کرنے میں مددگار ہے۔ اور مسلمہ طور پر مثبت سوچ کا نتیجہ بڑی کامیابی ہے۔

مثبت سوچ کا دوسرا نام فطرت کی سوچ ہے۔ مثبت سوچ خارجی دنیا سے حاصل نہیں کی

جاسکتی۔ یہ آپ کی داخلی فطرت ہے جو آپ کو مثبت سوچ کا خزانہ دیتی ہے۔ اپنی پیدائشی فطرت کو برقرار رکھیں تو آپ یقینی طور پر مثبت مفکر بن کر ابھریں گے۔ ہر انسان زبردست ممکنہ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے آپ اپنی ممکنہ صلاحیتوں کو اجاگر ہونے کا موقع دیں۔ تو الفاظ کے عین مطابق آپ مثبت مفکر بن کر سامنے آئیں گے۔

آخر کیوں اکثر مرد اور عورت مثبت فکر رکھنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ فطرت نے جو انھیں خزانہ بخشے ہیں وہ ان سے مستفید ہونے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص آنکھوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ آنکھیں بند کر لے تو کچھ نہیں دیکھ پائے گا۔ یہ بات مثبت سوچ کے لحاظ سے بھی درست ہے کیونکہ فطری طور پر مثبت سوچ ہر انسان کے پاس ہوتی ہے بشرطیکہ وہ اپنی آنکھیں اس کی طرف سے بند نہ کرے۔

مثبت سوچ کا متضاد منفی سوچ ہے جو آنکھیں بند کرنے کے مترادف ہے۔ اگر آپ بحیثیت مثبت مفکر زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو منفی سوچ سے فاصلے پر رہنے کی کوشش کریں۔ مثبت فکر ہر انسان کی داخلی خوبیوں کو وسعت دیتی ہے۔ جب کے منفی سوچ کا عمل اس کے برعکس ہوتا ہے۔ منفی سوچ بڑی آسانی سے اچھی سوچ کو ختم کر سکتی ہے۔ لہذا اس کو دور رکھنے کے لیے ٹھوس اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثبت سوچ کے لیے آپ کو صرف اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی ضرورت ہے۔

یہاں مسئلہ یہ ہے کہ ہم سماج میں رہتے ہیں انسان ایک سماجی حیوان ہے۔ اس لیے وہ سماج میں رہنے پر مجبور ہے۔ سماج کیا ہے؟ سماج وہاں تشکیل پاتا ہے جہاں کچھ لوگ باہمی مفادات کے لیے مل جل کر رہتے ہیں۔ لیکن معاشرے کے تمام اراکین میں تفاوت ہوتا ہے۔ یہ ہی تفاوت فطرت کا حصہ ہے۔ ہر مرد و عورت محترم ’’اختلاف‘‘ صاحب یا محترمہ ’’اختلاف‘‘ صاحبہ بن کر پیدا ہوتی ہیں۔ حقیقت میں سماج کثرت سے مختلف عناصر کا مرکب ہے۔

یہی اختلاف مسائل کی وجہ بنتے ہیں۔ جب آپ ایسی صورت حال کا سامنا کرتے ہیں جو آپ کی خواہشات کے مطابق نہ ہوں، تو آپ خفا ہو جاتے ہیں اور پھر جوابی رد عمل کا ایک تسلسل شروع ہو جاتا ہے جو اشتعال، کینہ، منفی فکر اور تشدد کا باعث بنتا ہے۔ یہ ہی وہ رکاوٹ ہے

جو آپ کی مثبت سوچ میں حائل ہے۔

پھر دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہر کوئی کنڈیشننگ کا شکار ہے۔ ہر منفی تجربے سے کنڈیشننگ کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اور بتدریج یہ کنڈیشننگ ذہن کے لاشعور میں بیٹھ جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے کبھی کبھار ہونے والے منفی تجربات ہماری پوری شخصیت کو متاثر کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک وقت آتا ہے یہ کنڈیشننگ ہماری شخصیت کا لازمی حصہ بن جاتی ہے۔ نتیجتاً انسان حقائق دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ جو ایک مصیبت ہے اور انسان کو جتنی جلدی ممکن ہو اس سے نجات حاصل کرنی چاہیے۔

اس مسئلہ پر قابو پانے کے لیے انسان کو خاموش رہنے کا ہنر سیکھنا چاہیے۔ جب بھی آپ کے ذہن میں کوئی منفی خیال آئے، تو کبھی بھی رد عمل کا اظہار نہ کریں۔ چپ رہیں، اور کچھ دیر کے لیے اپنے دماغ کو تمام خیالات سے خالی کر دیں پھر تمام مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اگر کسی نے آپ کے بارے میں تلخ باتیں کہیں ہیں تو آپ اس کو سنجیدگی سے نہ لیں جب ہم چیزوں کو سنجیدگی سے نہیں لیتے، تو وہ دماغ میں شکایت کا موجب نہیں بنتیں ہیں، اور دل میں کسی قسم کی خلش پیدا نہیں ہوتی ہے۔

خوش قسمتی سے فطرت اس معاملے میں ہمارے لیے بہت مددگار ہے۔ دوسری تمام خوبیوں سے قطع نظر، انسانی فطرت میں بے نظیر خوبی پر سکون رہنے کی ہے۔ اس کے لیے واحد شرط یہ ہے ہمیں فطرت کو کام کرنے کا موقع دینا چاہیے۔

جب ہم کسی ناپسندیدہ صورت حال کا سامنا کر رہے ہوتے ہیں ہماری استدلال کی صلاحیت عام طور پر منفی خیالات کے سیلاب میں پھنس جاتی ہے۔ لیکن اگر ہم خاموش رہیں تو پر سکون رہنے کی خوبی منفی خیالات کو زائل کر دے گی۔ یہ سیلاب کی سمت تبدیل کر کے اُسے چند لمحات میں ختم کر دے گی۔ تیس سیکنڈ خاموش رہیں۔ ہر چیز نارمل ہو جائے گی۔ گویا کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔



غیر ضروری شکایات

چیلنجز میں ہماری اپنی بہتری ہے۔ یہ ہماری زندگی میں ہماری تربیت کے لیے آتے ہیں۔ یہ ہماری دانائی اور طاقت میں اضافے کا موجب بنتے ہیں۔

برطانوی وزیر اعظم ایم پی ایناک پاول (1912-1998) نے ایک دفعہ ان سیاستدانوں کے بارے میں بہت دلچسپ تبصرہ کیا جو ذرائع ابلاغ کی شکایت کرتے ہیں۔ انہوں نے محسوس کیا یہ شکایات غیر ضروری اور بلا جواز ہیں انہوں نے کہا: ”وہ سیاست دان جو ذرائع ابلاغ کی شکایت کرتا ہے وہ اُس بحری جہاز کے کپتان کی مانند ہے جو سمندر کی لہروں کی شکایت کرے“

یہ تبصرہ بالکل درست ہے۔ تاہم اس کا اطلاق صرف سیاست دانوں پر ہی نہیں ہوتا بلکہ ہر انسان پر ہوتا ہے۔ جب کوئی کسی کی شکایت کرتا ہے تو حقیقتاً اُس کی شکایت غیر ضروری ہوتی ہے۔ کیونکہ اُس نے مسئلہ کو شکایت میں بدل دیا۔ اگرچہ مسئلہ کچھ بھی نہیں جس کے بارے میں شکایت کی جائے۔

یہ دنیا فطرت کے اصولوں پر قائم ہے۔ اس دنیا میں زندگی ایک وسیع ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی مانند ہے۔ جس میں مسلسل لہریں اُٹھ رہی ہیں۔ انسانی سماج میں رہتے ہوئے ہم ایک لہر کے بعد دوسری لہر کا سامنا کرتے ہیں۔ ان لہروں سے نمٹنے کا ایک ہی قابل فہم راستہ ہے کہ ہم ان لہروں کو ایک چیلنج سمجھ کر قبول کریں۔ ہمیں اپنے راستے میں آنے والی لہروں کی شکایت کرنے کے بجائے ان کے اوپر سے یا انہیں بائی پاس کرتے ہوئے کامیابی سے گزر جانے کا ہنر سیکھنا چاہیے۔

یہ سچ ہے کہ ہمیں اپنی زندگی میں بہت سی لہروں یا چیلنجز کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور یہ چیلنجز خراب یا برے نہیں ہوتے۔ یہ چیلنجز تو ہماری بہتری کے لیے ہوتے ہیں یہ ہماری زندگی میں ہماری تربیت کے لیے آتے ہیں۔ یہ ہماری دانائی اور طاقت میں اضافے کا موجب بنتے ہیں۔ جو مشکلات ہمیں زندگی میں پیش آتیں ہیں وہ تجربات ہوتے ہیں۔ ان تجربات سے

گزرے بغیر کوئی انسان مکمل نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنے تجربات سے سبق سیکھنا چاہیے۔ اور اس دوران ہمیں شکایات سے دور رہنا چاہیے۔



مسرت اطمینان کا دوسرا نام

اکثریت کے لیے ضروریات زندگی قابل رسائی ہیں، لیکن لالچ کو کہیں قرار نہیں ہے حتیٰ کہ مالدار اور سیاسی طاقت رکھنے والے لے بھی اس سے محروم ہیں۔

پُر مسرت زندگی ہر انسان کا پسندیدہ ہدف ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ انسانوں کی اکثریت اس کو حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ وہ اپنے دن کا آغاز اور اختتام افسردگی سے کرتے ہیں۔ یہ تقریباً ہر انسان کی زندگی کا ایک تاریک پہلو ہے۔ تو پھر اس وباء کی مانند پھیلی ہوئی پریشانی کا کیا حل ہے؟

یہاں ہم مشہور فارمولاً ”موازنہ کر کے ہم چیزوں کو سمجھتے ہیں“ کا اطلاق کرتے ہوئے: ہم اس مسئلے کی وضاحت اس طرح کر سکتے ہیں، کہ حیوان کئی لحاظ سے انسان کی مانند ہیں لیکن ایک فرق بڑا نمایاں ہے کہ حیوان پُر مسرت کیفیت میں رہتے ہیں۔ افسردگی کا لفظ اُن کی ڈکشنری میں نہیں ہے۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حیوانات ہمیشہ مطمئن رہتے ہیں جو کچھ بھی اُن کو مل جائے اُس پر خوش رہتے ہیں۔

یہ مثال ہم کو بتاتی ہے پُر مسرت زندگی کا راز ”اطمینان“ میں ہے۔ اگر آپ مطمئن ہیں تو آپ خوش ہوں گے۔ اور اگر جو کچھ آپ کے پاس ہے یا جو کچھ آپ نے زندگی میں حاصل کیا ہے اُس سے مطمئن نہیں ہیں، تو افسردہ کیفیت آپ کا مقدر ہے۔

تحقیق بتاتی ہے کہ کامیابی کے دو معیار ہیں۔ ایک کی بنیاد ضرورت، اور دوسرے کی لالچ پر ہے۔ جہاں تک ضرورت کا تعلق ہے بہت کم لوگ اس دنیا میں ایسے ہیں جن کی ضروریات پوری نہ ہو رہی ہوں۔ لیکن لالچ کی کوئی حد نہیں ہے کوئی بھی حاصل کردہ چیز لالچ کی تسلی و تشفی نہیں کر سکتی۔ انسانی فطرت کی یہ ہی خامی ہے جو اُسے افسردہ رکھتی ہے۔

اس معاملے میں انسان کو حقائق پر نظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ کیا چیز قابل حصول اور کیا چیز ناقابل حصول ہے۔ اکثریت کے لیے ضروریات زندگی قابل رسائی ہیں، لیکن لالچ کو کہیں قرار نہیں ہے حتیٰ کہ مالدار اور سیاسی طاقت رکھنے والے بھی اس سے محروم ہیں۔ اگرچہ وہ چیزیں محدود ہیں جن کے بارے میں انسان لالچ کا شکار ہوتا ہے۔ تاہم لالچ کی کوئی حد نہیں ہے کوئی بھی کوشش اس کو سیر نہیں کر سکتی۔ یہ اُس کی فطرت کا حصہ ہے۔ انسان کے مطالبات لامحدود ہوتے ہیں، جب کہ جس دنیا میں وہ رہتا ہے وہ محدود ہے اس فرق کی وجہ سے افسردگی جنم لیتی ہے۔

خوشی اور افسردگی دماغ کی دو کیفیات ہیں اگر آپ اس حقیقت کا اعتراف کر لیں تو بڑی آسانی سے آپ اپنی خواہشات کو لگام دے کر خوشی حاصل کر سکتے ہیں۔ خوشی ایک داخلی مسئلہ ہے۔ یہ خارجی کامیابی کا نام نہیں ہے۔

اچاریہ رنجیش ہندوستان کے ایک صوفی گورو تھے انھوں نے ایک کتاب ”کنڈلانی اندر باس“ لکھی۔ اس کتاب کا عنوان ایک کستوری ہرن کی کہانی پر مبنی ہے۔ جب وہ مسکراتا ہے۔ اُس کی اپنی مشک کی خوشبو ادھر ادھر پھیل جاتی ہے۔ تو وہ خوشبو کا ماخذ جانے کے لیے یہاں وہاں دوڑتا ہے جب کہ خوشبو اُس کے اپنے اندر سے آرہی ہوتی ہے۔ خوشی کے بارے میں بھی یہ بات درست ہے۔ انسان خوشی کو اپنے سے باہر تلاش کرتا ہے اس بات سے بے خبر کہ خوشی کا مسکن تو اُس کے اپنے اندر ہے۔

مسرت حاصل کرنا ہر انسان کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ لیکن چند ایک ہیں جو ایسے حاصل کرتے ہیں ایسا کیوں ہے؟ یہ اس لیے ہے کہ انسان اس کو اپنے سے باہر خارجی دنیا میں تلاش کرتا ہے جب کہ مسرت اُس کے اندر واقع ہے یعنی یہ ایک دماغی کیفیت کا نام ہے۔ اپنی ذہنی کیفیت کو صحت مند بنائیں آپ یقیناً خوشی حاصل کر لیں گے۔



خوشگوار ازدواجی زندگی

زندگی سے لطف اندوز ہونے کا بہترین طریقہ دانشمند ساتھی کا کردار ادا کرنا ہے۔ شوہر اور بیوی کو ایک دوسرے کا دانشور ساتھی بن کر زندگی گزارنی چاہیے۔
مرد و عورت دونوں کا جنم بطور خصوصی مخلوق کے ہوا ہے دونوں ایک مادے سے بنے ہیں۔ زندگی دو پہیوں کی گاڑی کی مانند ہے۔ یہ گاڑی اُس وقت تک نہیں چل سکتی، جب تک دونوں پہیل چلنے چلیں۔ ان پہیوں میں کوئی بڑھیا یا گھٹیا نہیں ہے۔ دونوں مساوی ہیں دونوں کا کردار برابر ہے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ انسان سماجی حیوان ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مرد یا عورت تنہا اپنا کردار ادا نہیں کر سکتے۔ زندگی کا مقصد پورا کرنے کے لیے انھیں ایک دوسرا کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ ہر کامیاب مہم چاہے مرد و عورت میں سے کسی نے بھی شروع کی ہو وہ مشترکہ مہم ہوتی ہے۔ بغیر مشترکہ کوششوں کے قطعاً بڑی کامیابی حاصل نہیں کی جاسکتی ہے۔

ایک مشترکہ مہم سے ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ دونوں اصناف کو یکساں کام یا ایک سا کام کرنا چاہیے اس قسم کی مساوات فطرت کے منافی ہے۔ اس لیے ناقابل عمل ہے۔ زندگی میں عملی طور پر ایسی کوئی چیز واقع نہیں جس کو ملازمت میں برابری کی طرز پر بیان کر سکیں۔ حقیقی برابری عزت اور مرتبے میں مساوات ہے۔ یہاں مشترکہ کوششوں سے مراد دونوں مرد اور عورت کو گاڑی کے دو پہیوں کی طرح اپنی زندگی کے مشن کے لیے متحد ہونا ہے۔

کسی مرد یا عورت کا کردار زندگی میں اتنا ہی نہیں کہ وہ بس روپیہ کمائے تعیشات زندگی کو اکٹھا کرے، زندگی سے لطف اٹھائے اور وہ چیزیں حاصل کرے جنہیں تفریحات کہتے ہیں۔ زندگی کا مقصد ان چیزوں کے حصول سے بڑا ہے۔ انسان صرف ایک مادی وجود نہیں ہے۔ بلکہ وہ عقلی وجود بھی ہے۔ اس لیے مرد ہو یا عورت انھیں زندگی سے صرف مادی سطح پر نہیں بلکہ شعوری سطح پر بھی لطف اندوز ہونا چاہیے۔ زندگی سے لطف اندوز ہونے کا بہترین طریقہ دانشمند ساتھی کا کردار ادا کرنا ہے۔ اس لیے شوہر اور بیوی کو ایک دوسرے کا دانشور ساتھی بن کر زندگی گزارنی

چاہیے۔ کائنات کے پاس شاپنگ مال سے زیادہ حقیقی اشیا ہیں۔ اس کائنات میں اربوں کھربوں ایسی اشیا ہیں جو روحانی اور عقلی نوعیت کی ہیں۔ مرد اور عورت کو لازمی طور پر اس منزل کے لیے رخت سفر باندھ لینا چاہیے۔ تاکہ اعلیٰ حقائق دریافت کریں اور باکمال سطح پر زندگی سے لطف اٹھائیں۔ اس طرح اپنی زندگی کے پوشیدہ خزانے کو عیاں کریں۔

حضرت عیسیٰ نے بالکل درست کہا ہے کہ انسان صرف روٹی پر زندگی نہیں گزارتا۔ یہ روٹی تو ایک علامت ہے اس سے مراد تعیشتات زندگی ہیں تجربات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ جو لوگ ساری عمر صرف ضروریات زندگی پر نظر مرکوز رکھتے ہیں وہ مایوسی کی حالت میں مرتے ہیں۔ مادی تعیشتات کی بڑی سے بڑی مقدار بھی آپ کو حقیقی تسلی اور ذہنی سکون نہیں دے سکتی ہے۔ انسان صرف تعیشتات زندگی پر عمر بسر نہیں کر سکتا۔

ہر مرد و عورت کا اصل مقصد حیات سب سے زیادہ قیمتی شے ذہنی سکون حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ذہنی سکون اپنی نوعیت کے لحاظ سے روحانی ہوتا ہے۔ یہ صرف روحانیت کا حصول ہے جو آپ کو ذہنی سکون دے سکتا ہے۔ ذہن صرف اسی صورت پر سکون رہ سکتا ہے، جب اُسے زیادہ سے زیادہ روحانی چیزیں سے روشناس کروایا جائے۔ مرد و عورت اس معاملے میں قدرتی شراکت دار ہیں۔ یہ اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ مشترکہ کوششوں سے اپنا مقصد حاصل کریں۔

روحانیت کا حصول کوئی پراسرار الفاظ کا منتر نہیں ہے۔ یہ تو بالکل اسی طرح ہے جیسے دانشمندی کا حصول ہے۔ روحانی اور عقلی حصول مشق کرنے سے ممکن ہے۔ مشق سے مراد مشترکہ کوششیں ہیں۔ ہر کسی کو ایسے ہم سفر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اُس کا سفر میں ساتھ دے۔ فطرت نے مرد اور عورت کا جوڑا بنا کر یہ رحمت کی ہے۔

عقل و دانش کی شراکت بہت اہم ہے۔ مزید مرد اور عورت کا سب سے اعلیٰ مقصد بھی ہے۔ لیکن اس کے حصول میں کامیاب ہونے کے لیے ایک شرط ہے اور یہ شرط دس حروف پر مشتمل کرشمہ انگیز لفظ ایڈجسٹمنٹ (Adjustment) ہے۔

ایڈجسٹمنٹ کا مطلب مطیع یا مغلوب ہونا نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک بڑی تسکین آور چیز ہے۔ یہ حقیقت کا اعتراف ہے۔ جب آپ چیون ساتھی کے ساتھ ایڈجسٹ کرتے ہیں تو آپ یہ

ثابت کرتے ہیں کہ آپ کا دانشمندانہ مزاج بلند سطح پر ہے۔ ایڈجسٹمنٹ گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اور یہ بہت ہی مسرت انگیز تجربہ ہوتا ہے۔

برطانوی شکاری جیم کار بیٹ (1875-1955) شیروں کے حوالے سے بڑی معلومات رکھتا تھا اُس نے اپنی کتاب (Man Eaters of Kumaon) میں لکھا ہے: ”شیر بے حد جرات کے ساتھ ساتھ فراخ دل اور بھلامنس ہوتا ہے“ عام خیال کے برعکس شیر ہمیشہ ایڈجسٹ کرتا ہے۔ کبھی لڑائی کے لیے پہل نہیں کرتا۔ لہذا ایڈجسٹمنٹ شیر کا وصف ہے۔ شیر کی طرح زندگی گزاریں اور ایڈجسٹمنٹ کی اعلیٰ تہذیب اختیار کریں۔ شیر جنگل کا بادشاہ ہوتا ہے۔ آپ یہ رویہ اختیار کر کے ایک بادشاہ کی طرح زندگی گزار سکتے ہیں۔



چھوٹی موٹی

ٹینشن فری دماغ ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس کو حاصل کرنا کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہم انسانی صورت حال کو منج (Manage) کرنے کا ہنر سیکھیں۔

چھوٹا سا پودا جس کا بائیکل نام ’موسا پوڈیکا‘ ہے یہ سایہ دار جگہ پر پایا جاتا ہے۔ اپنی حساس طبیعت کی وجہ سے اس کا مشہور نام ’چھوٹی موٹی‘ ہے۔ جب کوئی اسے چھوتا ہے تو اس کے پتے اندر کی طرف سمٹ جاتے ہیں اور کچھ دیر بعد پھر پھیل جاتے ہیں۔

یہ فطرت کا مسئلہ ہے۔ یہ اس بات کی صراحت ہے کہ کیسے ایک مرد یا عورت کے ساتھ کامیاب رویہ رکھا جائے۔ فطرتی طور پر عورت جذباتی اور مرد انا پرست ہے۔ یہ دونوں کی بنیادی فطرت ہے۔ اس معاملے میں دونوں اصناف کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ اس لیے اگر آپ عورت کے جذبات، اور مرد کی انا نیت کو مت چھوئیں۔ تو آپ اُن کے ساتھ کامیابی سے معاملات طے کر سکتے ہیں۔ یہ اُن تمام مردوزن سے اچھے تعلقات رکھنے کا حتمی کلیہ بھی ہے جن سے آپ گھر کے اندر خاندان کے افراد کے لحاظ سے یا باہر معاشرے کے رکن ہونے کے ناطے یا کسی سفر میں ملنے

جلنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔ اگر آپ اس کلیہ کو اپناتے ہیں، تو آپ کو تلخ تجربات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ آپ گھر کے اندر اور باہر ہر جگہ ایک متوازن زندگی گزار سکتے ہیں۔
من حیث المجموع لوگ ٹینشن میں زندگی گزارتے ہیں۔ اکثر معاملات میں دیکھا گیا ہے اس ٹینشن کی وجہ غیر شائستہ رویہ ہے۔ دانستہ یا غیر دانستہ طور پر لوگ خواتین کے جذبات اور مردوں کی انانیت کو مجروح کرتے ہیں۔ اور یہ غلط رویہ قطع تعلقات کا باعث بنتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں پارٹنر غیر ضروری ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اس کا سادہ سا علاج ہے۔ مثال کے طور پر اگر کبھی خاوند تاخیر سے گھر آتا ہے۔ اور اُس کی بیوی ناراضی کا اظہار کرتی ہے تو اُسے مشتعل نہیں ہونا چاہیے، بلکہ مسکرا کر جواب دینا چاہیے: ابھی تو میں بھوکا ہوں لہذا مجھے کچھ کھانے کو دو، پھر میں تاخیر سے آنے کی وجہ بتاتا ہوں، دوسری طرف اگر بیوی بازار جانے کے لیے اصرار کرتی ہے۔ اور خاوند کا بازار جانے کا من نہیں ہے۔ تو خاوند کو جھٹ سے انکار کرنے کے بجائے یہ کہنا چاہیے: ”اچھا خیال ہے۔ لیکن آج نہیں، میں تمہارے ساتھ کل چلوں گا۔“ یہ میاں بیوی کے درمیان معاملات طے کرنے کا آسان راستہ ہے۔

ٹینشن فری دماغ ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس کو حاصل کرنا کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہم انسانی صورت حال کو مینج (Manage) کرنے کا ہنر سیکھیں۔ اس ہنر کو چند منتخب الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن کی شائستگی سے ادائیگی دوسروں کی تسکین کا باعث ہوگی۔ اور یہ نہ صرف آپ کے اپنے سکون کو مجروح ہونے سے بچائے گی بلکہ آپ کی جسمانی صحت منفی اثرات سے محفوظ رہے گی۔



ذہنی سکون۔۔ کس لیے

ہر مردوزن کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے تفکیری عمل کو منفی رخ اختیار کرنے سے روکے اور مثبت سمت پر چلنے کی ہدایت کرے۔ یہ ہر انسان کے لیے لازمی ہونا چاہیے

تفکرات کی عدم موجودگی کو ذہنی سکون سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ دماغ کا پرسکون ہونا اچھی بات ہے۔ تاہم سوال یہ ہے کہ ذہنی سکون کا مقصد کیا ہے؟ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ پرسکون ذہن ٹینشن سے آزاد، پرمسرت زندگی میں مگن، اپنی ملازمت میں متحرک، کاروبار میں چاک و چوبند اور جسمانی صحت میں متوازن رہنے کا باعث ہوتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ ایک پرسکون دماغ مذکورہ تمام چیزوں کو ممکن بناتا ہے۔ لیکن ذہنی سکون کی قدر و قیمت کا یہ انتہائی ادنیٰ معیار ہے۔ کیونکہ پرسکون ذہن ایک مثبت ذہن ہوتا ہے۔ اور یہ مثبت ذہن ہی ہوتا ہے جو ہمیں اعلیٰ معیار پر زندگی گزارنے کے قابل کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا دماغ ایک نان اسٹاپ سوچنے والی مشین ہے۔ جیسے دل دھڑکنے نہیں چھوڑتا، ایسے ہی دماغ سوچنا نہیں چھوڑتا۔ ہمارے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم اپنے دماغ کو مثبت سمت دیں۔ اگر ہم یہ کرنے میں ناکام ہو گئے تو ہمارا دماغ منفی رخ پر چل پڑے گا۔ اور اگر ایک دفعہ دماغ منفی سمت اختیار کر گیا۔ تو نتیجتاً ہماری فطرت کی ساری شیرازہ بندی منتشر ہو جائے گی۔

مشکل یہ ہے کہ جس دنیا میں ہم رہ رہے ہیں یہاں ہر کوئی اپنی من مرضی کرنے کے لیے آزاد ہے۔ جس کی وجہ یہ یہ دنیا چیلنجز اور مقابلوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہ صورت حال اُن تمام سماجی مسائل کا باعث بنتی ہے جنہیں ہم عام طور پر معاشرتی مصائب کہتے ہیں۔ اس طرح ممکن ہے کہ ایک شخص کی خوشی دوسرے کے لیے حزن و ملال کا موجب بنے۔ جیسا کہ اکثر سماج میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایسی صورت حال میں یہ قدرتی بات ہوتی ہے کہ ذہن اضطراب کا شکار ہو جائے، اور منفی سمت میں سفر شروع کر دے۔ یہ واقعات اتنے عام ہیں کہ کہیں بھی واقع ہو سکتے ہیں جیسا کہ یہ ہمارے معاشرے میں عام دیکھے جاسکتے ہیں۔ انسان کے لیے اپنے آپ کو مثبت شخصیت کے روپ میں نہ ڈھالنا ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ آپ صرف اُسی صورت میں قوانین فطرت کی عطا کردہ نعمتوں کے حقدار بن سکتے ہیں جب آپ مثبت شخصیت کے حامل ہوں۔ اگر آپ اپنی شخصیت کو منفی رنگ دینے پر راضی ہو گئے ہیں۔ تو پھر آپ وہ رحمتیں کبھی بھی حاصل نہیں کر پائیں گے جو آپ کے لیے مخصوص کی گئیں تھیں۔ آپ مایوسی میں زندگی بسر کریں

گے، اور مایوسی میں ہی موت کو گلے لگائیں گے۔ بغیر اُن اعلیٰ مقاصد کو حاصل کیے جن کے لیے آپ پیدا ہوئے تھے۔

اس صورت حال میں ہر مرد و زن کا فرض اولین یہ ہے کہ اپنے تفکیری عمل (Thinking Process) کو منفی رخ لینے سے روکے، اور اُس کی مثبت سمت کی طرف راہنمائی کرے۔ یہ ہر انسان کے لیے فعل لازم ہونا چاہیے۔

ذہنی ارتقاء کے تین بڑے ذرائع، مطالعہ، مشاہدہ، اور تبادلہ خیال (Debate) ہیں۔ یہ تینوں عناصر ذہن کے لیے قوت بخش غذا ہیں۔ اگر ذہن پرسکون ہے تو دماغ ان ذرائع سے درست سبق حاصل کرنے کا اہل ہوگا۔ لیکن اگر ذہن ہیجان انگیزی کا شکار ہے۔ تو انسان کو جیسی مرضی عقل و دانش کی خوراک دیں، یہ اُس سے افادہ حاصل نہ کر پائے گا۔ ذہن ہر قسم کی شخصیت کو فروغ دینے والا سب سے عظیم صنّاع (Shaper) ہے۔ ہم میں سے ہر کوئی جانتا ہے کہ اچھی جسمانی صحت کے لیے بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہ کوئی بھی مضرت رساں چیز ہماری جسمانی اعضاء کو نقصان نہ پہنچائے۔ اسی طرح ہمیں ایک بہتر شخصیت کی تعمیر کے لیے اس بات کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے کہ ہمارا ذہن تمام ایسے عوامل سے محفوظ رہے، جو اس کے تفکیری عمل میں خلل انداز ہوں۔ آپ کا ذہن ایک انجن کی مانند ہے اس لیے اس کو پٹری سے نہ اترنے دیں۔ ورنہ آپ کبھی بھی منزل مقصود پر نہیں پہنچیں گے۔

دانائی ہر مرد و زن کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے۔ دانائی اصل میں سچ اور صحیح کو شناخت کرنے کی صلاحیت ہے جس کا ماخذ انسانی دماغ ہوتا ہے۔ جیسے ایک صحت مند جسم آپ کو مادی توانائی دیتا ہے اسی طرح ایک صحت مند ذہن آپ کو حکمت و دانائی عطا کرتا ہے۔ اگر آپ اپنے دماغ کو ہیجان انگیزی سے محفوظ نہ رکھ پائے تو آپ حکمت و دانائی سے محروم ہو جائیں گے۔ اور حکمت و دانائی سے محرومی ہر چیز سے محرومی ہے۔ دانائی صرف صحت مند دماغ کا تحفہ ہے۔ اور صحت مند دماغ وہ کہلاتا ہے جس کی نشوونما مثبت تفکیری عمل سے ہوئی ہو۔



ذہنی سکون کیسے حاصل کریں

ذہنی دباؤ حقیقت کو قبول نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ پھر اس کا حل یہ ہے کہ ہم حقیقت کو قبول کر لیں۔ کیونکہ حقیقت سے انحراف مسائل کو پیدا کرتا ہے۔ اور حقیقت کا اعتراف مسائل کو حل کرتا ہے۔

ذہنی دباؤ عصر حاضر کا مشترکہ مسئلہ ہے۔ سب امیر و غیر امیر اس سے دوچار ہیں۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کی ایک رپورٹ کے مطابق ۲۰۲۰ تک ذہنی دباؤ دنیا میں بیماریوں کی دوسری بڑی وجہ بن جائے گا۔ ذہنی دباؤ سے نجات کے لیے بہت سے حل تجویز کیے گئے ہیں لیکن سب کے سب غیر موثر ثابت ہوئے ہیں۔ شاید یہ حل عارضی سکون فراہم کرتے ہیں۔ لیکن مستقل مسئلے سے چھٹکارا دلانے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔

اکثر ذہنی دباؤ سے نجات کے لیے مراقبہ تجویز کیا جاتا ہے۔ لیکن مراقبہ میں مرکز نگاہ دل ہوتا ہے جبکہ جدید سائنسی دور نے اس علاج کو رد کر دیا ہے۔ سائنس نے ثابت کر دیا ہے۔ کہ دل تو محض ایک عضو ہے۔ جو خون کو پمپ کرتا ہے۔ دباؤ ایک ذہنی مسئلہ ہے۔ یہ دماغ ہی ہے جو دل کو کنٹرول کرتا ہے دل کی دماغ پر دسترس نہیں ہے۔ ذہنی دباؤ ایک غیر مادی جب کہ دل ایک مادی وجود ہے۔ کیسے ایک مادی عضو ایک غیر مادی مسئلے کو حل کر سکتا ہے؟

مزید ہم اکثر دماغی تناؤ کو روکنے کے لیے فزیکل تیکنیک کے بارے میں سنتے ہیں۔ لیکن ان فزیکل تیکنیک کی رسائی جسم تک محدود ہوتی ہے۔ ان کا اثر دماغ تک نہیں ہوتا ہے۔ پھر کیسے یہ فزیکل تیکنیک دماغی الجھن کو سلجھا سکتی ہیں۔

ذہنی دباؤ حقیقت کو قبول نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ پھر اس کا حل یہ ہے کہ ہم حقیقت کو قبول کر لیں۔ کیونکہ حقیقت سے انحراف مسائل کو پیدا کرتا ہے۔ اور حقیقت کا اعتراف مسائل کو حل کرتا ہے۔

ہماری دنیا آزادی، مقابلے، چیلنجز اور مفادات کے ٹکراؤ کی دنیا ہے۔ یہ انسانی فطرت مسائل پیدا کرنے کا باعث ہے۔ کوئی بھی انسان اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس وجہ سے ذہنی دباؤ

سے نجات کا صرف ایک فارمولا ہے۔ کہ ذہنی دباؤ کو بجائے ختم کرنے کے اسے میج (Manage) کرنے کا فن سیکھا جائے۔

انسان کاروبار میں نقصان کی وجہ سے افسردہ ہو سکتا ہے۔ یا اُس کے اندر امتیازی سلوک کا احساس جنم لے سکتا ہے۔ مثلاً اگر وہ انتخابات میں ہار جاتا ہے یا محبت کی شادی نفرت کی بندھن میں بدل جاتی ہے یا اُس کے لیے تنقید رنجیدگی کا باعث ہوتی ہے۔ تو وہ مایوس اور دل برداشتہ ہو جائے گا۔ ان تمام معاملات میں انسان حقیقی وجوہات سے عدم واقفیت کی بنا پر منہنی ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنے نقصان اور ناچاقی کے اسباب کو دوسرے اشخاص کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اور اپنی تمام پریشانیوں کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہراتا ہے۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے کہ یہ ساری ناپسندیدہ صورت حال تو انین فطرت کے تحت ہیں۔ اگر آپ اپنی تمام پریشانیوں اور مسائل کو خالق کائنات کے بنائے فطری قوانین سے منسوب کر دیں۔ تو آپ کا یہ عمل آپ کے اندر منہنی سوچ کو پیدا نہیں ہونے دے گا۔ لیکن جب آپ اپنے مسائل کسی انسان کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ تو یہ منفی تفکیری عمل کا باعث بن جاتا ہے۔ قانون فطرت آپ کا حریف نہیں ہے جب کہ دوسرا شخص مفادات میں آپ کا مد مقابل ہے۔ اگر آپ دوسرے شخص کو، جو کہ آپ کے مد مقابل ہے، اپنی پریشانیوں کا قصور ٹھہرائیں گے۔ تو آپ کا یہ عمل لازماً منہنی سوچ کو ہوا دے گا اور ناراضی کا باعث ہوگا۔ لیکن جب آپ اپنی ناکامیوں کی وجوہات کو تو انین فطرت سے وابستہ کرتے ہیں تو یہ آپ کا اپنا محاسبہ کرنے کا باعث ہوگا۔ کیونکہ فطرت کے قوانین آپ کے حریف نہیں ہیں ان کا اطلاق سب پر یکساں ہوتا ہے۔

جب آپ کسی شخص کے خلاف منہنی سوچ کے بجائے فطرت پر منہنی سوچ کو اپنائیں گے، تو آپ دانائی کو تلاش کرنے کی کوشش کریں گے اور اس بات کو تسلیم کریں گے کہ جو کچھ بھی واقع ہوا ہے وہ سب میری بہتری کے لیے ہوا ہے۔ ان واقعات کے ظہور کا مقصد میرے دماغ کو بیدار کرنا اور میری تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنا تھا۔ اور آپ کا یہ زاویہ نظر حقیقت پر منہنی سوچ کو ترقی دینے کا کام کرنے کی ترغیب کو توانا کرنے، اپنی غلطی کا احساس کرنے اور اپنے منصوبے کو دوبارہ درست خطوط پر استوار کرنے کا ذریعہ ہوگا۔

جب آپ اس طرح سوچیں گے تو آپ کا دماغ ایک خود کار نظام کے تحت خود بخود منفی سوچ کو مثبت میں بدل دے گا۔ آپ تو انین فطرت کے شکر گزار ہوں گے جس نے پوشیدہ نعمت سے آپ کو نوازا۔ جو کچھ بھی واقعہ ہوا اس کا مقصد آپ کی بہتری تھی نہ کہ آپ کا نقصان کرنا۔ یہ سوچ آپ کے ذہنی دباؤ کو محو کر دے گی اور آپ کے لیے نارمل زندگی گزارنے کا باعث ہوگی۔ ذہنی دباؤ سے نجات کا یہ واحد راستہ ہے۔ اور کوئی ایسی ٹیکنیک یا طریقہ نہیں جو آپ کے دماغ کو تناؤ سے آزاد کر سکے۔



شکایت نہیں

یہ حقیقت ہے کہ ہر انسان فطرت کی ناقابل بیان رحمتوں سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ اگر یہ سچائی نظروں سے اوجھل نہ ہو تو انسان کا ذہن کبھی منفی سوچ، اور زبان کبھی شکایت سے آلودہ نہ ہو۔ اور وہ اپنے نکتہ نظر میں ہمیشہ مثبت رہے۔ بغیر کسی تردد کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مثبت ذہنیت ہر قسم کی اچھائیوں کا ذریعہ ہوتی ہے۔

میڈیکل تحقیق بتاتی ہے کہ ہر انسان کے کم از کم اٹھتر (78) اعضاء ہوتے ہیں۔ اور یہ تمام کے تمام اعضاء کمال ہم آہنگی کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ اس لیے انسان ان گنت سرگرمیاں بہت آسانی سے ادا کرتا ہے۔ اگر ایک یا ایک سے زائد جسمانی عضو کام کرنا چھوڑ دیں تو انسان کے لیے رکاوٹوں سے آزاد زندگی ناممکن ہو جائے۔ مزید یہ اعضاء جسمانی خود کار طریقہ سے مسلسل کام کرتے ہیں اگر ان اعضاء کو کبھی ویسے آپریٹ کرنا پڑتا جیسے ایک مشین کو آپریٹ کرنا پڑتا ہے تو انسان کبھی بھی دوسرا کوئی اور کام کرنے کے قابل نہ ہوتا۔ وہ اپنے اعضاء جسمانی کو آپریٹ کرنے میں مصروف رہتا۔ اس بات کا احساس ہم کو دو باتوں سے باخبر کرتا ہے۔ اولاً یہاں ایک مہربان خالق ہے۔ اس احساس کے بعد ہر انسان کے دل میں ایک زبردست محبت اپنے خالق کے لیے پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنے اندر لازوال تشکر کے جذبات محسوس کرتا ہے۔ ثانیاً اعلیٰ نعمتوں سے سرفراز ہونے کا احساس انسان کو مثبت سوچ کا حامل بنائے گا۔ اس طرح وہ

معاشرے کا ایک مفید رکن بن جائے گا۔



خدا۔۔ ایمان کا ماخذ

اس وسیع کائنات میں، خدا ہمارا مددگار ہے۔ یہ ہی خدا ہے جو ہمیں دریائے حیات کو پار کرنے میں سہارا دیتا ہے اور ہمیں باحفاظت دوسرے کنارے پر لے آتا ہے۔ خدا پر ایمان انسان کے لیے سب کچھ ہے۔ اس ایمان کے بغیر انسان کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر آپ خلا میں کسی مقام پر ہوں اور آپ ایک طاقتور دور بین سے کائنات کا جائزہ لے رہے ہوں۔ تو آپ استثنائی اور قدرے چھوٹے سیارے یعنی زمین کا مشاہدہ کریں گے۔ جو بے جان کائنات کے درمیان زندگی کی بقا کا سارا سامان لیے کھڑی ہے۔ یہ حیران کن منظر آپ کو ششدر کر دے گا۔ اگر آپ مزید قریب سے دیکھیں گے تو آپ اور چونکا دینے والی چیزیں کا جائزہ لیں گے۔ مثال کے طور پر آپ مشاہدہ کریں گے کہ زمین اور اس کا چاند اور ساتھ ساتھ دیگر سیارے مستقل حرکت میں ہیں۔ آپ انہیں اپنے محور کے گرد اور ساتھ ساتھ سورج کے گرد گھومتے پائیں گے۔ مزید آپ دیکھیں گے کہ پورا نظام شمسی مرکز کہکشاں کے مدار میں گردش کناں ہے جس کا وہ حصہ ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ یہ کہکشاں وسیع کائنات میں دیگر کہکشاؤں کے ساتھ خود بھی حرکت میں ہے۔

آپ یہ سب کچھ دیکھ کر خوف زدہ ہونے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اور پھر جب آپ بیٹھا آگ کے بڑے بڑے آتشی گولے جنہیں ہم دوڑتے ستارے کا نام دے سکتے ہیں ادھر ادھر گھومتے دیکھتے گے جن کے سامنے ہماری زمینی ایک معمولی سے ذرے کی مانند ہے۔ اُس وقت آپ یقیناً خوف ناک حیرانی میں مبتلا ہو جائیں گے جو آپ کو یہ تسلیم کرنے کے لیے مجبور کرے گی کہ اس تمام فلکیاتی دنیا کے سامنے آپ بالکل غیر اہم اور بے قیمت ہیں۔

یہ تجربہ اس حقیقت کا احساس دے گا کہ اس کائنات کا خالق، مالک اور قائم رکھنے والا ایک خدا ہے۔ اگر آپ اپنے ذہن میں کائنات کی وسعت کا تصور کریں گے تو آپ کا دل پکار

اُٹھے گا کہ کائنات بذات خود اپنے خالق کا ثبوت ہے۔ کائنات کا مشاہدہ کرنے کے بعد پھر کسی ثبوت کی ضرورت ہی نہیں رہتی ہے۔ اور ساتھ ساتھ آپ یہ تسلیم کریں گے کہ اس کائنات کی وسعت کے سامنے انسان تو بالکل بے بس اور معمولی مخلوق ہے۔ اس لیے خدا ہماری ناگزیر ضرورت ہے۔ خدا کے بغیر ہمارا باقی رہنا قطعاً ممکن نہیں ہے۔ بلا تردد یہ زندگی کی سب سے اہم حقیقت ہے۔ جب کسی کو اس حقیقت کا ادراک ہو جاتا ہے تو وہ ساری رکاوٹوں کو پھلانگ کر خدا کی طرف بے محابہ دوڑتا ہے۔ اُس کے جسم کا رُواں رُواں چیخ اُٹھتا ہے: ”اے خدا میری مدد فرما! تیری مدد کے بغیر میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔“ اس وسیع کائنات میں، خدا ہمارا مددگار ہے۔ یہی خدا ہے جو ہمیں دریائے حیات کو پار کرنے میں سہارا دیتا ہے اور ہمیں باحفاظت دوسرے کنارے پر لے آتا ہے۔ خدا پر ایمان انسان کے لیے سب کچھ ہے۔ اس ایمان کے بغیر انسان کچھ بھی نہیں ہے۔

جب ایک انسان ایک طاقتور دور بین سے بے کنار کائنات کا مشاہدہ کر لیتا ہے تو وہ یہ جان لیتا ہے کہ ہمارے روزمرہ کے تمام تجربات ہماری بے بسی پر محمول ہیں۔ ہر مرد و عورت بارہا ایسے واقعات کا سامنا کرتا ہے جو اُنھیں حدود میں رہنے کا پابند کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہماری ساری آرزوئیں ہمیشہ تکمیل کا جامہ نہیں پہنچتیں۔ اکثر ہم حالات کے ایسے بھنور میں پھنس جاتے ہیں جہاں ہم اپنے آپ کو بالکل بے بس و لاچار پاتے ہیں۔ ہم سب خوف نقصان، بیماری، بڑھاپا، اور موت کا سامنا کرتے ہیں۔ یہ سب تجربات ہمیں احساس دیتے ہیں، کہ ہماری زندگی کا انحصار کسی مقتدر اعلیٰ پر ہے۔ اور اس مقتدر طاقت کے بغیر ہم کسی صورت بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس احساس کو یوں بیان کیا جاسکتا کہ یہ خدا کے وجود کا ایک نفیساتی ثبوت ہے۔

ہر انسان لازمی طور پر اس تجربے سے گزرتا ہے۔ اور ہم میں سے ہر ایک اپنے اندر خدا کی موجودگی کا ناقابل تردید ثبوت رکھتا ہے۔

انسان کا باطن اور فطرت اُسے بتاتی ہے۔ ”تمہیں خدا کی ضرورت ہے بغیر خدا کے نہ تمہاری زندگی مکمل ہو سکتی ہے اور نہ تم کامیاب ہو سکتے ہو“



خوشیوں کی کنجی

اگر آپ پُرسرت کیفیت میں رہنا چاہتے ہیں
تو خواہشات اور ضروریات میں فرق کرنا سیکھیں

آپ کے پاس جو کچھ ہے اگر آپ اُس پر مطمئن رہ سکتے ہیں، تو آپ کے لیے یقینی طور پر پُرسرت زندگی کا حصول ممکن ہے۔ لیکن اگر آپ کے اطمینان کا انحصار محض زیادہ سے زیادہ سامانِ تعیش کے حصول پر ہے۔ تو آپ کبھی بھی شاداں نہیں رہ سکتے۔ خوشی ایک دماغی کیفیت کا نام ہے۔ اس لیے کوئی مادی چیز آپ کے لیے خوشیوں کا اہتمام نہیں کر سکتی ہے۔

اگر آپ کے دماغ میں ایسی مادی تعیشات کی فہرست ہے جو آپ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور آپ خیال کرتے ہیں کہ ان اشیاء کی تحصیل کے بعد آپ خوش و خرم ہو جائیں گے تو پھر آپ کے لیے دلشاد رہنا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ مادی اشیاء کی فہرست کا اختتام کاغذ کے صفحے پر تو ہو جاتا ہے لیکن دل کے صفحے پر کبھی نہیں ہوتا۔ اگر آپ اپنی سوچوں کو ان راستوں پر گامزن ہونے سے روکنے کا ہنر نہیں سیکھتے، تو دماغ آپ کی خواہشات کی فہرست میں مزید درمزید اشیاء کا اضافہ کرتا رہے گا۔ اور آپ ہمیشہ غیر مستحکم رہیں گے۔ اگر آپ پُرسرت کیفیت میں رہنا چاہتے ہیں تو خواہشات اور ضروریات میں فرق کرنا سیکھیں۔ انسان کی اصل ضروریات بہت محدود ہیں۔ حقیقی ضروریات کے فہرست میں ہمیشہ فل اسٹاپ ہوتا ہے۔ لیکن خواہشات پر مبنی فہرست میں فل اسٹاپ نہیں ہوتا ہے۔ ہر روز آپ ایک کو مے کا اضافہ کریں گے اور یہ آپ کی آخری سانس تک مسلسل لامتناہی طور پر چلتا رہے گا۔ قدرتی طور پر انسان خواہشات کی نہ بچھنے والی پیاس رکھتا ہے۔ لہذا مادی اشیاء کی کثرت آپ کو خوشی نہیں دے گے بلکہ قناعت آپ کا دامن خوشیوں سے بھرے گی۔

اپنے حوالے سے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں پُرسرت کیفیت میں رہتا ہوں کیونکہ میں قناعت پسند ہوں مجھے پورا یقین ہے کہ جو کچھ میرے پاس ہے میرے لیے کافی ہے۔ اس فارمولے نے مجھے ہمیشہ خواہشات کی تکمیل کا احساس دیا ہے۔ میں اپنے آپ سے کہتا ہوں میں

موجود حالات پر پورے طور پر مطمئن ہوں۔ میری یہ طبیعت مجھے دائمی اطمینان عطا کرتی ہے بطور (Status quoist) ہونا کسی شخص کا منفی پہلو نہیں ہے۔ بلکہ یہ بہت بڑا اضافی پوائنٹ ہے۔ وہ انسان جو (Status Quoist) ہو وہ ہر طرح کی مداخلت سے محفوظ رہتا ہے۔ جب آپ ہر قسم کی مداخلت سے محفوظ ہوں، تو آپ کے اچھے کام مثلاً مطالعہ، مثبت سوچ، سماجی خدمات مہیا کرنے کے لیے کافی وقت ہوتا ہے۔

خوشی صرف ذاتی کیفیت کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ اخلاقی قداریں سے ایک بہت اعلیٰ اور نایاب قدر ہے۔ اگر آپ ناخوش ہیں تو آپ ذہنی دباؤ اور ٹینشن میں رہنے پر مجبور ہیں جو کہ نہ آپ کے لیے اور نہ دوسروں کے لیے اچھا ہے۔ لیکن اگر آپ خوش ہیں اور ٹینشن فری ہیں تو آپ ہر قسم کے ذہنی دباؤ اور مایوسی سے آزاد اور ملنسار ہوں گے پھر آپ کی شخصیت مثبت ہوگی اور مثبت شخصیت انسانی ترقی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔



ازدواجی زندگی کا مقصد

زندگی دندانہ دار پہیوں (Cogwheel) کی مانند ہوتی ہے۔ اگر مرد ایک دندانے دار پہیہ کی طرح ہے تو عورت دوسرے دندانے دار پہیہ جیسی ہے دونوں کو اشتراک عمل کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ متحدہ کوشش ممکن ہو سکے۔

یہ بالکل سچ ہے کہ کامیاب ازدواجی زندگی کے لیے ایڈجسٹمنٹ واحد فارمولا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایڈجسٹمنٹ کس لیے کی جائے؟ یہ ایڈجسٹمنٹ محض ایڈجسٹمنٹ کے لیے نہیں ہوتی ہے بلکہ یہ اعلیٰ مقصد حیات یعنی نارٹل ماحول پیدا کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ جس سے ازدواجی زندگی کا حقیقی مقصد حاصل ہو۔ شادی شدہ زندگی محض اکٹھے زندگی گزارنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ باہمی اشتراک کا نام ہے۔ شادی کے بعد ہر ساتھی کے پاس کوئی نہ کوئی بے نظیر خوبی ہوتی ہے اور ہر ایک کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس کا دوسرے کے ساتھ اشتراک کرے۔ ہم میں سے ہر ایک مختلف صفات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اور ہر ایک کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ ان

صفات کا اپنے ساتھی کے ساتھ اشتراک کرے، تاکہ دونوں ساتھی اپنی شخصیت کی تعمیر بہتر طریقہ سے کر سکیں۔ کیونکہ ازدواجی زندگی میں دونوں ساتھی ایک ہی وقت میں ایک دوسرے کا سہارا لینے والے اور ایک دوسرے کو سہارا دینے والے بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے دونوں کو ایسی پسندیدہ صورت حال کی ضرورت ہوتی ہے جس میں اُن کا ایک دوسرے کو فائدہ پہنچانا ممکن ہو۔ زندگی دندانہ دار پہیوں (Cogwheel) کی مانند ہوتی ہے۔ اگر مرد ایک دندانے دار پہیہ کی طرح ہے تو عورت دوسرے دندانے دار پہیہ جیسی ہے دونوں کو اشتراک عمل کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ متحدہ کوشش ممکن ہو سکے۔

میں بہت سے ایسے شادی شدہ جوڑوں کا جانتا ہوں جنہوں نے اس حقیقت سے واقف ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ ایڈجسٹ ہونے کی کوشش کی۔ اور وہ اس سے بھی پوری طرح باخبر تھے کہ اُن کا ایسا کرنا محض ایڈجسٹمنٹ کے لیے نہیں تھا بلکہ باہمی اشتراک کے لیے تھا۔ لہذا اُن کی شادی کامیاب ہوئی۔ یہ ازدواجی زندگی کا ایک بہت ہی اہم پہلو ہے۔ جس کو میں عقل و دانش کا اشتراک (Intellectual Partnership) کہتا ہوں ہم ہر روز نئی سے نئی مشکلات کا سامنا کرتے ہیں، ہر دن ہمیں کچھ نہ کچھ نئے فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ ہر طلوع ہوتے سورج کی روشنی میں، ہم خیالات کی نئی دنیا دریافت کرتے ہیں یہ نئے نئے مسائل ہم سب کے لیے اہم ہے اس لیے ہم میں سے ہر ایک کو دانشمند ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کے ساتھ ہم تبادلہ خیال کر سکیں، جس کے ساتھ باہمی امور پر گفت و شنید ہو سکے، اور جس کے ساتھ مل کر ہم بہتر راستے کو دریافت کرنے کی کوشش کر سکیں۔ اور میرے تجربے کے مطابق بہترین دانشمند ساتھی اپنے جیون ساتھی کے علاوہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

ایڈجسٹمنٹ کلچر کو ہر انسان نے اختیار کیا ہے۔ جیسے کاروباری حضرات نے اپنے گاہکوں کے ساتھ، اور ہر ملازمت پیشہ مرد اور عورت نے اپنے باس کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ اگرچہ اس مذکورہ ایڈجسٹمنٹ کا مقصد صرف روپیہ کمانا ہوتا ہے پھر بھی میرے خیال میں یہ اچھی چیز ہے۔ اسی طرح یہی ایڈجسٹمنٹ کلچر شوہر اور بیوی کے درمیان بھی لازمی درکار ہے۔ کیونکہ اپنی ازدواجی زندگی میں اس کلچر کو اپنا کر آپ دولت سے بھی زیادہ قیمتی چیز حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جب آپ اپنے شریک حیات کے ساتھ بات چیت کرتے ہیں۔ تو یہ باہمی گفتگو آپ کو نئے خیالات سے روشناس کراتی ہے۔ اس لحاظ سے دانشمندی کا اشتراک ذہنی ارتقا کا باعث بنے گا۔ اور ذہنی ارتقا ہر انسان کا سب سے اعلیٰ مقصد ہے۔ انسان ایک استدلال پسند جانور ہے۔ لہذا جب آپ ازدواجی زندگی میں باہم ایڈجسٹمنٹ کی بات کریں گے۔ تو دونوں میاں بیوی یہ سوال کر سکتے ہیں کہ ایڈجسٹمنٹ کیوں ضروری ہے؟ آپ کو اس کے حق میں عمدہ جواب دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ورنہ ایڈجسٹمنٹ کے حوالے سے آپ کی تمام گفتگو تشنہ رہ جائے گی۔ اور ایسی صورت میں شاید وہ آپ کی ایڈجسٹمنٹ کی گفتگو کی ضرورت تائید کریں۔ لیکن وہ اس کا اطلاق اپنی عملی زندگی پر نہیں کریں گے۔ میرا تجربہ علمی شعبہ کا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ایک ممتاز عالم کی بنیاد علم ہے۔ لیکن صرف کتابوں کا مطالعہ اعلیٰ درجہ کی تبحر علمی کا باعث نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اس کے لیے باہمی گفت و شنید، مذکرہ، تبادلہ خیال، سینار اور کانفرنسز ضروری ہیں۔ تاہم آپ کا ازدواجی ساتھی ہر وقت تیار ایک انٹیکچول پارٹنر ہے۔ وہ دن ہو یا رات ہر وقت دستیاب ہوتا ہے۔ گھریلو کانفرنس اُس روائتی کانفرنس سے ہزار درجے بہتر ہوتی ہے جو آڈیو ٹیپ میں منعقد ہوتی ہے۔ ازدواجی زندگی کے اس پہلو کو دریافت کریں تو آپ کو ایڈجسٹمنٹ کی ہر قیمت معمولی لگے گی۔



روشن مستقبل کا تصور

جیسے رات دن کو آنے سے نہیں روک سکتی، اسی طرح کوئی بھی ناگوار صورت حال انسان کو روشن مستقبل کی اُمید سے محروم نہیں کر سکتی۔

روشن مستقبل کا تصور انسانی شخصیت میں راسخ ہے۔ ہر انسان اس حقیقت کا گواہ ہے کہ ہر دن کے بعد رات، اور ہر رات کے بعد دن طلوع ہوتا ہے۔ یہ بات زندگی کے لیے بھی درست ہے۔ مزید انسانی زندگی میں کوئی فُل اسٹاپ نہیں ہے، اس راہ میں صرف کوئے آتے ہیں حتیٰ کہ انسان اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔ روشن مستقبل کا تصور صرف انسانوں میں ہے، حیوانوں

میں نہیں ہے انسان ہمیشہ مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے۔ کوئی بھی سانحہ اُس سے آنے والے دنوں سے وابستہ خوشگوار تصورات نہیں چھین سکتا۔ لہذا اس تصور کی وجہ سے انسانی جدوجہد کبھی لا حاصل نہیں ہوتی ہے۔ جیسے رات دن کو آنے سے نہیں روک سکتی، اسی طرح کوئی بھی ناگوار صورت حال انسان کو روشن مستقبل کے تصور سے محروم نہیں کر سکتی۔ یہ آنے والے کل کے خوشنما خواب فرد واحد سے شروع ہوتے ہیں پھر قومی جدوجہد کو اپنے اندر سموتے ہوئے ایک تہذیب و تمدن کی عالمگیر امید بن جاتے ہیں۔ یہ ہی امید کا تسلسل انسان کو خاص طرہ امتیاز ہے۔

عام خیال کیا جاتا ہے کہ موت اس تسلسل کا نقطہ اختتام ہے۔ لیکن دائمی زندگی کے تسلسل پر یقین کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ عمل موت تک مسلسل ہے تو موت کے بعد کیوں نہیں ہے؟ موت صرف انسان کے مادی جسم کو آتی ہے۔ لیکن انسانی شخصیت کے دیگر پہلوں جیسے سوچ فکر جو ایک ابدی وجود ہے اس کو موت نہیں آتی ہے۔ اور یہ بالکل یقینی بات ہے سوچ و فکر پر مبنی شخصیت کو زوال نہیں ہے حتیٰ کہ یہ شخصیت ظاہری موت کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔



متبادل راستہ دریافت کریں

آپ اپنے وہم و گمان کے دائرے سے ایک بار باہر آئیں، پھر آپ دیکھیں گے کہ دنیا متبادل مواقع سے بھری ہوئی ہے۔

اگر آپ کار چلاتے ہوئے اچانک دیکھتے ہیں کہ ایک تیز رفتار گاڑی بالکل مخالف سمت سے سیدھی آپ کی طرف آرہی ہے تو آپ آنے والے گاڑی سے فاصلہ پیدا کرنے کے لیے فوراً اپنی کار کو ایک طرف کر لیں گے۔ کیونکہ اگر دونوں گاڑیاں قریب آگئیں، تو اس کا نتیجہ حادثے کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ایک کار سڑک کے ایک طرف چلے اور دوسری کار سڑک کے دوسری طرف چلے تو ان کا سفر محفوظ رہے گا۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دونوں گاڑیاں متبادل راستہ اختیار کر کے حادثے سے بچ سکتی ہیں۔ زندگی گھریلو، معاشرتی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر محاذ آرائی سے بھری ہوئی ہے۔ کسی بھی وقت کوئی ایسا بحران کھڑا ہو سکتا ہے۔ جو دو

افراد یاد کرو ہوں کے درمیان محاذ آرائی کا باعث بن جائے۔ ایسی صورت میں بہتر طریقہ یہ ہے کہ متبادل تلاش کیا جائے۔ یہ زندگی کے بحران سے نمٹنے کا سادہ ترین طریقہ ہے۔

متبادل راستہ اختیار کرنا یہ فطرت کا عالمگیر قانون ہے۔ مثال کے طور پر بارش کا میدانی اور پہاڑی علاقوں میں برسنا ایک عام واقعہ ہے۔ میدانی علاقوں میں عموماً بارش قطروں کی صورت میں ہوتی ہے جبکہ پہاڑی علاقوں میں یہ برف باری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ میدانی علاقوں میں دریا ہوتے ہیں جو براہ راست بارش کو اپنے اندر سمو لیتے ہیں اور ان میں پانی کی وافر مقدار جمع ہو جاتی ہے۔ جس کو پورے سال استعمال کی جا سکتا ہے جبکہ پہاڑوں پر دریا نہیں ہوتے۔ لیکن یہ فطرت نے ایک متبادل طریقہ اختیار کیا اُس نے پانی کو برف کی شکل میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر محفوظ کر دیا۔ جو سارے سال آہستہ آہستہ پگھلتی رہتی ہے۔ جس سے پہاڑی علاقوں کو پانی ملتا رہتا ہے۔

اگر آپ کی زندگی میں بحران ہے۔ آپ محاذ آرائی کے بجائے اس سے نمٹنے کے لیے کوئی متبادل دریافت کریں۔ اگر آپ پرسکون ہو کر غور و فکر کریں۔ تو آپ بحران کو حل کرنے کے لیے پرامن متبادل تلاش کر لیں گے۔

مثال کے طور پر برٹش دور اقتدار میں ہندوستان کے لوگوں کا مقصد حیات آزادی تھا۔ اُس وقت سبھا س چندر باس نے کہا تھا: ”آپ مجھے اپنا خون دیجیے میں آپ کو آزادی دوں گا۔“ لیکن یہ فارمولانا قابل عمل ثابت ہوا۔ باس اور اُس کی فوج آزادی کا سورج دیکھنے سے پہلے مر گئے۔ گاندھی جی نے محسوس کیا کہ پُر تشدد طریقہ قابل عمل نہیں ہے۔ تو انھوں نے اس کا متبادل راستہ عدم تشدد کی صورت میں دریافت کر لیا۔ یہ متبادل طریقہ کامیاب ثابت ہوا اور 1947 میں ہندوستان آزاد ہو گیا۔ اس اصول کا اطلاق تمام شعبہ ہائے زندگی پر ہوتا ہے۔ جب آپ کسی بحران سے نبرد آزما ہوں تو اپنے دماغ کو بیجانی کیفیت میں مبتلا نہ ہونے دیں بلکہ کچھ متبادل حل تلاش کریں۔ یہ عمل آپ کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

اگر آپ کسی کمپنی میں کام کرتے ہیں اور آپ کو ایسا لگتا ہے وہاں آپ کو ترقی نہیں دی جا رہی ہے تو نتیجتاً آپ شکایت درج کراتے ہیں۔ لیکن آپ کی شکایت پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔ پھر

آپ کو متبادل ”انتظار اور صبر“ کا فارمولا اختیار کرنا چاہیے۔ جہاں پہلا فارمولا ناکام ہو گیا، وہاں دوسرا فارمولا قابل عمل ہو جائے گا۔

آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کی آمدن کم ہے اور اخراجات زیادہ ہیں لہذا آپ اپنی آمدن میں اضافے کرنا چاہتے ہیں لیکن آپ کو کوئی راستہ نہیں ملتا کہ جو آمدن میں اضافے کا ذریعہ بنے۔ تو ایسی صورت میں بھی آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ یہاں بھی، آمدن میں اضافہ کرنے کے بجائے اپنے اخراجات میں کمی کی صورت میں، متبادل موجود ہے۔ لہذا پھر یہ ثابت ہوتا ہے کہ جہاں پہلا فارمولا کارآمد نہ رہے، وہاں دوسرا فارمولا آسانی سے کام کرے گا۔

اگر آپ ناگوار صورت حال کو دیکھ کر جلد مشتعل ہونے کی عادت میں مبتلا ہیں جس کی وجہ سے آپ ٹینشن کا شکار ہو جاتے ہیں تو اس کا بھی متبادل ہے۔ کہ آپ چیزوں کو معمول کے مطابق لے کر اپنے رویہ کو بدلیں۔ تو آپ بہت جلد محسوس کریں گے کہ آپ کا دماغ پرسکون ہو گیا ہے۔ لوگ اپنے ذہن کاروموٹ کنٹرول اپنے باؤلے پن کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ اور ان کا یہ عمل متبادل حل تلاش کرنے میں رکاوٹ کا باعث بنتا ہے۔ آپ اپنے وہم و گمان کے دائرے سے ایک بار باہر آئیں، پھر آپ دیکھیں گے کہ دنیا متبادل مواقع سے بھری ہوئی ہے۔



شکایت نہ کریں

شکایت کے قابل عمل حل کے لیے اُس کو موضوع گفتگو بنانے کے بجائے آپ کو یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ شکایت دور کرنے کا واحد حل اُس کو بھول جانا ہے نہ کہ یہ تلاش کرنا کہ وہ سچی ہیں کہ جھوٹی

شکایت کارجمان بہت مہلک ہے اس کی عادت بہت سے سماجی مصائب کی جڑ ہے۔ یہ فطری امر ہے کہ معاشرے میں جب مختلف مزاج کے لوگ اکٹھے رہیں گے تو ان کا متفرق طبیعت ہونا، ایک دوسرے کے خلاف شکایت کا باعث ہوگا۔ جو جلد ہی دشمنی اور نہ ختم ہونے والی نفرت میں بدل جائے گا۔ شکایت کے ازالہ کا ایک ہی حل ہے کہ اسے سنجیدگی سے لینے کے

بجائے بھول جائیں۔ اگر کسی سے کوئی شکایت پیدا ہو۔ تو اس کی تفتیش کرنے یا یاد رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ ایک طرفہ بنیاد پر اسے طاق نسیاں کے سپرد کر دیں۔ جب آپ اجتماعیت کی صورت میں رہیں گے تو شکایت کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ لیکن انھیں حل کرنے کی نیت سے ان کی طے میں اترنا کسی طرح بھی سودمند نہیں ہے۔

اس دنیا میں شکایات کو ختم کرنا ناممکن ہے۔ اس لیے اس کا واحد حل یہ ہے کہ وہ گلے شکوے جو آپ کو دوسرے کے ساتھ پیدا ہو جاتے ہیں ان کو اپنے دماغ میں جمع نہ کریں۔ مسائل کے سلجھاؤ کا یہ ہی طریقہ ہے۔ قابل عمل نکتہ نظر سے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ اگر آپ اس دنیا میں مثبت ذہنیت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا اس دنیا سے مثبت ذہنیت کے ساتھ رخصت ہونا چاہتے ہیں تو آپ کے پاس حقیقی انتخاب کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ شکایات ایک سنجیدہ معاملہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی تحلیل کا ایک ہی قابل عمل طریقہ ہے کہ اسے موضوع گفتگو نہ بنائیں بلکہ آپ کے ذہن نشین ہونا چاہیے کہ ان کے حل کا واحد طریقہ ان کو بھول جانا ہے، نہ کہ اس بات کی تلاش کرنا کہ وہ سچی ہیں جھوٹی۔ تجربات سے ثابت ہوتا ہے کہ شکایات کی تفتیش اس کو دور نہیں کرتی۔ بلکہ بعض اوقات یہ مزید شکایت کا باعث بنتی ہے۔ ان کو ذائل کرنے کا واحد قابل عمل حل یہ ہے کہ شکایات کو طاق نسیاں کے سپرد کر دیں۔



VII

زندگی کی حکمت

دل کی آواز پر لبیک

جب آپ کوئی غیر مناسب بیان دیتے ہیں یا کسی ناجائز معاملہ پر زبان کھولتے ہیں، تو آپ کا ضمیر داخلی طور پر آپ کو تنبیہ کرتا ہے۔ اور اگر آپ اُس تنبیہ کو سن لیں، تو یقینی طور پر غلط سوچنے اور ناجائز بولنے سے اعراض کر سکتے ہیں۔

ہر انسان جامع فطرت پر پیدا ہوتا ہے اس لیے فطرت ہر مرد و عورت کی بہترین راہنما ہے۔ انسانی فطرت ہر موقع پر درست سمت کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ جب پورے خلوص کے ساتھ اس فطری راہنمائی کی پیروی کی جاتی ہے۔ تو یہ انسان کی کامیابی کی ضمانت بن جاتی ہے۔ مثلاً بسیار خوری ایک عام مسئلہ ہے۔ یہ موٹاپا اور ہر طرح کی بیماری کا باعث بنتا ہے۔ لیکن بسیار خوری سے بہت آسانی سے بچا جاسکتا ہے۔ کھانے کے دوران معدہ خفیہ اشارے دیتا ہے اگر آپ ان اشاروں کو سن لیں اور فوراً کھانا چھوڑ دیں تو آپ بسیار خوری سے اپنے آپ کو روک سکتے ہیں۔ یہ اپنے آپ کو غیر فطری بیماریوں سے بچانے کا آسان طریقہ ہے۔

جب آپ کوئی غیر مناسب بیان دیتے ہیں یا کسی ناجائز معاملہ پر زبان کھولتے ہیں، تو آپ کا ضمیر داخلی طور پر آپ کو تنبیہ کرتا ہے۔ اور اگر آپ اُس تنبیہ کو سن لیں تو آپ یقینی طور پر غلط سوچنے اور بے جا بولنے سے اعراض کر سکتے ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ غلط رخ پر سوچنا اور نامناسب بولنا نامی کی بنیادی وجوہات ہیں۔

فرض کریں کہ آپ کسی منصوبہ پر عمل پیرا ہیں، اور کچھ عرصے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو رہے ہیں۔ بلکہ آپ کے اقدامات کے معکوس اثرات مرتب

ہور ہے ہیں۔ تو یہ جو منفی نتائج ہوں گے وہ ایک طرح سے آپ کے لیے فطرت کے اشارے ہوں گے۔ اگر آپ یہ اشارے سمجھ لیتے ہیں اور اپنی منصوبہ بندی کا دوبارہ جائزہ لیتے ہیں اور اپنے لائحہ عمل کو از سر نو ترتیب دیتے ہیں تو آپ کا یہ خود صحیحی کا عمل آپ کی یقینی کامیابی کا باعث ہوگا۔

ایک اور بہت اہم اشارہ دوسرے لوگوں کا آپ کو نصیحت کرنا ہے۔ دوسرے لوگ آپ کے لیے ایک آئینہ کی مانند ہوتے ہیں۔ جس طرح آپ اپنے چہرے کے نقص نہیں دیکھ سکتے۔ آئینہ آپ کے چہرے کے تمام نقائص آپ کے سامنے عیاں کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح دوسروں کی نصیحتیں بھی ایک آئینہ کی مانند ہوتی ہیں۔ یہ ہمارے لیے فطرت کے اشارے ہوتے ہیں۔ اس لیے ہمیں دوسرے افراد کی نصیحتوں کو پوری توجہ سے سننا چاہیے۔ اور ان کا نکتہ نظر سمجھنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ پھر آپ آسانی سے درست نتیجہ پر پہنچ جائیں گے۔ یہ آپ کو اپنا لائحہ عمل درست کرنے میں مدد کرے گا۔ اور بلا آخر آپ کے منزل مقصود پر پہنچنے کا سامان کرے گا۔

اگر آپ موسم برسات میں بغیر چھتری لیے باہر چلے گے اور کچھ چلنے کے بعد بارش شروع ہوگئی تو بارش بھی آپ کے لیے اس بات کا اشارہ ہوگئی کہ آپ موسم برسات میں احتیاطی تدبیر اختیار نہ کر سکتے۔ اس طرح یہ فطرت کی مثال انسانی زندگی کے معاملے میں بھی ہے۔ انسانی دنیا میں بھی ہر کوئی کبھی داخلی طور پر اور کبھی خارجی طور پر اشارے وصول کرتا ہے۔ تو پھر اپنی کامیابی کو یقینی بنانے کا بہترین طریقہ یہ ہی ہے کہ ان اشارات کو سنیں، اور ان کے احکامات کی پابندی کریں، تو آپ یقینی طور پر منزل پر پہنچ جائیں گے۔ فرض کریں آپ راہنما ہیں آپ ایک احتجاج منظم کرتے ہیں۔ جس میں آپ لوگوں کی اچھی خاصی تعداد اکٹھی کر لیتے ہیں۔ لیکن جب اس جھوم کی قیادت کر رہے ہوتے ہیں تو آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا احتجاج ٹریفک میں خلل کا باعث بن رہا ہے، کاروبار اس سے متاثر ہو رہے ہیں، اور بہت جلد آپ ایک محاذ آرائی کی صورت میں ہوں گے، جس میں خون خرابہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے منفی نتائج آپ کے لیے اشارے ہیں، کہ آپ اپنے پلان کا دوبارہ جائزہ لیں۔ اور یہ سمجھیں کہ آپ کا طریقہ کار غلط ہے۔ آپ کو گاندھی جی کے مشہور قول کو تسلیم کرنا چاہیے ”کسی مطلوب ہدف کا حصول اُس تک رسائی کے ناجائز ذرائع کے درست ہونے کا جواز فراہم نہیں کرتا ہے“ (The end does not justify the

(means)

اس اصول کی ایک تاریخی مثال ہے۔ 1920 میں انڈین نیشنل کانگریس نے مہاتما گاندھی جی کی سربراہی میں ”عدم تعاون“ کی تحریک شروع کی۔ یہ بات تسلیم شدہ تھی کہ ستیہ گرہ پر امن رہیں گے۔ لیکن 1922 میں احتجاج کرنے والوں کا ہجوم آپے سے باہر ہو گیا، اور کچھ پولیس والوں کو چوری چورا گاؤں میں قتل کر دیا۔ تحریک میں تشدد کا عنصر پاتے ہیں گاندھی جی نے اپنی جدوجہد معطل کر دی۔

ہر کوئی اپنے پروگرام پر عمل کرنے کے لیے آزاد ہے۔ صرف ایک شرط ہے کہ اُس کی سرگرمی کسی نئی مصیبت کا پیشہ خیمہ نہ بنے۔ ایسی سرگرمیاں جو پریشانی پیدا نہ کریں وہ اچھی ہوتی ہیں اور ایسے اقدامات جو مصائب کھڑے کر دیں وہ برے ہوتے ہیں

☆☆

دولت دودھاری تلوار

دولت کمانے کے لیے اعلیٰ حکمت اور سخت مشقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاہم اُس وقت بڑی حیرانی ہوتی ہے جب کوئی شخص بیوقوفی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے خون پسینے سے کمائی ہوئی دولت کو فضول خرچی میں اڑا دیتا ہے

سب جانتے ہیں کہ دولت کیسے کمائی جاتی ہے لیکن بہت کم لوگ ہیں جنہیں معلوم ہے کہ دولت کیسے خرچ کی جاتی ہے۔ ہمارے معاشرے کے تمام طبقات چاہے وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی یہ عام تجربہ ہے کہ سمجھدار آدمی وہ ہے جو اس حقیقت کو دریافت کر لے اور اس سے سبق حاصل کر کے اپنی زندگی کا لائحہ عمل تیار کرے۔

دولت انسان کی زبردست مددگار (Booster) ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ دولت انسان کے لیے تباہ کن بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ ابتدا میں دولت ایک طاقت کا ذریعہ ہوتی ہے۔ یہ اس کا استعمال ہے جو اس کو انسان کے لیے اچھا یا برا بناتا ہے۔ لوگ اپنی دولت نہایت سمجھداری سے کماتے ہیں لیکن جب اُس کے خرچ کرنے کا موقع آتا ہے تو اکثر لوگ بالکل احمق بن جاتے

ہیں۔

حال ہی میں مجھے میرے ایک دوست نے اپنے فارم ہاؤس پر آنے کی دعوت دی، جو کہ بڑی اہم سڑک پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس گھر میں ہر طرح کی سہولیات اور تہذیبی زندگی موجود تھیں۔ لیکن عملی طور پر یہ فائدے سے زیادہ نقصان پہنچانے والی چیز تھی۔ میں نے مالک مکان سے کہا دولت کا اس طرح ضیاع تو بہت نقصان دہ ہے۔ اگر آپ اس جگہ اسکول بناتے تو یہ آپ کی دولت کا بہت جائز مصرف ہوتا۔

اگر آپ اپنی دولت کو تعمیری مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں تو یہ بہت ہی مفید عمل ہے۔ لیکن اگر آپ اسے نمود و نمائش پر خرچ کرتے ہیں تو یہ دولت کا انتہائی غیر مفید استعمال ہے۔ اور بہت ہی مکروہ عمل ہے دولت کمانے کے لیے اعلیٰ حکمت اور سخت مشقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاہم اُس وقت بڑی حیرانی ہوتی ہے جب کوئی شخص بیوقوفی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے خون پسینے سے کمائی ہوئی دولت کو فضول خرچی میں اڑا دیتا ہے۔ اگر آپ دولت کو معاشرے کی بہتری کے لیے خرچ کرتے ہیں تو اس سے آپ کی ساکھ بھی بہتر ہوگی اور لوگ آپ کی عزت بھی کریں گے۔ اگر آپ شاہانہ انداز میں اپنے خاندان پر دولت لٹاتے ہیں تو یہ آپ کے خاندان کے لیے سہل حصول زر (Easy Money) ہوگا۔ اور یہ اپنے نتائج کے لحاظ بہت معیوب ہوتا ہے۔ دولت کا پاس ہونا اچھا ہے۔ لیکن اگر دولت آپ کو متکبر بنا دے تو پھر یہ زہر سے بھی زیادہ مہلک ہے۔ اور اگر دولت آپ کو منکسر المزاج بنا دے تو یہ تعمیر شخصیت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

اگر آپ صرف دولت ہی کو مقصد حیات بنا لیتے ہیں۔ تو اس کا مطلب ہے کہ آپ اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح استعمال نہیں کر رہے ہیں۔ یقیناً دولت انسان کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے حصول کو مقصد حیات نہ بنائیں۔

ایک کہاوت ہے کہ ہم چیزوں کا باہم مقابل کر کے اُن کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ اگر دولت کا موازنہ علم سے کریں۔ تو آپ آسانی سے ان کے فرق کو سمجھ سکتے ہیں۔ دولت سرمائے کی ایک پُرخطر شکل ہے۔ یہ آپ سے دانستہ یا غیر دانستہ طور پر ضائع ہو سکتی ہے۔ جب کہ علم ایک مستقل اثاثہ ہے۔ اگر آپ سیر نہ ہونے والی فطرت کے مالک ہیں تو اس کو حصول دولت کے

بجائے حصول علم کے لیے استعمال کریں کیونکہ دولت کے لیے محنت ایک مشکوک سرمائے ہے۔ میں ایک شخص کو جانتا ہوں جو بہت مفلوک الحالی میں پیدا ہوا، لیکن اپنے آخری سالوں میں وہ امیر ہو گیا۔ ایک دفعہ اُس کے ایک دوست نے اُس سے گلہ کیا کہ امیر ہونے سے پہلے تو آپ سے نہایت آسانی سے ملاقات ہو جاتی تھی لیکن اب آپ سے ملنا بہت محال ہو گیا ہے۔ امیر آدمی نے جواب دیا: ”میرے اُوپر دولت کی بجلی گری ہے“۔ اس بات کو آسان الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ظاہری طور پر مال و دولت کا ہونا اچھا لگتا ہے لیکن باطنی طور پر معاملہ مختلف ہے۔ کیونکہ امیر آدمی بہت زیادہ ذہنی دباؤ میں رہتا ہے۔

ایک دفعہ میں ایک صنعت کار سے ملا، جو مجھے اپنا گودام دکھانے لے گیا۔ اگرچہ اُس کا گودام ایک کباڑ خانہ لگ رہا تھا، لیکن غریب مزدور زمین پر لیٹے گہری نیند کے مزے لے رہے تھے۔ مزدوروں کو دیکھ کر صنعت کار نے کہا: ”مجھے ان پر رشک آتا ہے کیونکہ میرے پاس نرم اور آرام دے مسہری کے باوجود، مجھے اس طرح گہری نیند نہیں آتی ہے۔“

دولت کو اپنا نوکر بنانا بہت اچھا ہے لیکن دولت کو اپنا مالک بنانا بہت برا ہے۔



یوٹرن۔ زندگی کا اصول

ایک سمجھدار آدمی وہ ہوتا ہے جو اپنی صلاحیتوں کا از سر نو جائزہ لے، اپنی ترجیحات کو دوبارہ ترتیب دے، اپنے منصوبے کو نیا جامہ پہنائے اور بدلتے حالات میں اپنے آپ کو ڈھال لے۔ ایک دفعہ میں انڈیا کے ایک علاقہ میں سفر کر رہا تھا۔ جس کے راستوں سے میرا ڈرائیور واقف نہ تھا۔ ایک مقام پر اُس نے کار کو غلط سمت موڑ کر بالکل مخالف راستے پر ڈال دیا۔ پانچ میل آگے جا کر اُسے احساس ہوا کہ وہ غلط سمت جا رہا ہے۔ اُس نے کار کو روکا۔ اور وہاں سے یوٹرن لے لیا۔ اس طرح جلد ہی ہم اپنی منزل مقصود پر آسانی سے پہنچ گئے۔ اس طرح کے یوٹرن نہ صرف شاہراؤں کا کلچر ہے بلکہ یہ زندگی کا بھی اصول ہے۔ ہر شخص، ہر برادری اور ہر قوم کو کسی نہ کسی مقام پر یوٹرن لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں ناقابل برداشت

نقصان اٹھانا پڑ سکتا ہے۔ مثال کے طور پر 2007 میں ٹائٹان نے مغربی بنگال میں نیوکار بنانے کی فیکٹری لگائی۔ جلد ہی انھیں معلوم ہو گیا کہ مغربی بنگال ان کی انڈسٹری کے لیے سود مند نہیں ہے۔ تو انھوں نے مغربی بنگال سے فیکٹری ختم کر کے گجرات میں لگائی۔ نتیجتاً اب نیوکار بھارت کے تمام شہروں میں بڑی کامیابی سے چل رہی ہے۔ کامیابی یوٹرن حکمت عملی کا اختیار کرنے کا براہ راست نتیجہ ہوتی ہے۔

اس حکمت عملی کا اطلاق قوموں پر بھی ہوتا ہے۔ یہی حکمت عملی برطانیہ نے دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنائی۔ برطانوی قیادت، خاص طور پر وہ راہنما جن کا تعلق فینین سماج (Fabian Society) سے تھے انھوں نے محسوس کیا کہ اب ان کے لیے ہندوستان اور دوسرے زیر تسلط علاقوں کو کنٹرول کرنا بہت مشکل ہے۔ تو انھوں نے ترک نوآبادیات کی پالیسی اختیار کر لی۔ جیسے کہ ہم جانتے ہیں کہ مسٹر چرچل دوسری جنگ عظیم کے ہیرو بن کر نمودار ہوئے تھے لیکن وہ 1945 کا الیکشن ہار گئے۔ ان کی ہار کی وجہ یہ تھی کہ برطانوی آبادی جنگ کے بعد وسیع پیمانے پر اصلاحات کی خواہشمند تھی۔ اس لیے جس شخص نے جنگ کے دوران قوم کی قیادت کی تھی امن کے دور میں اس کی راہنمائی فائدہ مند نہ تھی۔

تاریخ میں ایسے لوگوں کی کامیابی کی مثالیں جا بجا پھیلی ہوئی ہیں جنہوں نے یوٹرن کی پالیسی اختیار کی۔ اور ایسے لوگوں کی ناکامی کی داستانیں موجود ہیں جنہوں نے یوٹرن سے اجتناب کیا۔ اس دنیا میں کوئی بھی چیز نہ فرد واحد کے لیے اور نہ ہی کسی قوم کے لیے یقینی ہے۔ لہذا ہر انسان یا انسانی گروہ کو یہ پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ کہ جب انھیں معلوم ہو جائے کہ ان کا سفر ایک بندگی کی طرف بڑھ رہا ہے، تو انھیں اپنی پالیسی کا جائزہ لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ متعلقہ معاملات کی دوبارہ جانچ کریں۔ اور اگر یہ معلوم ہو کہ آپ غلط سمت میں سفر کر رہے ہیں تو فوراً آپ کو اپنی سمت تبدیل کر لینی چاہیے۔

اس حکمت عملی کی بھارت ایک اچھی مثال ہے۔ آزادی کے بعد یہاں معیشت کو اشتراکیت کے خطوط پر استوار کیا گیا۔ لیکن اس کے نتائج بہت حوصلہ شکن تھے۔ پھر 1991 میں بھارت نے نئی معاشی منصوبہ بندی متعارف کروائی۔ 2013 میں بھارتی انتظامیہ اتنی بڑی

معاشی پالیسیوں میں تبدیلی لے کر آئی کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ پوری بنیاد ہی تبدیل کر رکھ دی۔
 یوٹرن فطرت کا قانون ہے۔ کیونکہ کسی آدمی کو غیب کا علم نہیں ہے۔ کوئی بھی مستقبل میں
 ظہور پذیر ہونے والے معاملات کی پیش گوئی نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے زندگی کا سفر ایک بے یقینی
 کی صورت حال میں چھلانگ لگانے کے مترادف ہے۔ ایک سمجھدار آدمی وہ ہوتا ہے جو اپنی
 صلاحیتوں کا ازسرنو جائزہ لے، اپنی ترجیحات کو دوبارہ ترتیب دے، اپنے منصوبے کو نیا جامہ
 پہنائے اور بدلتے حالات میں اپنے آپ کو ڈھال لے۔ حقائق سے کبھی بھی لڑنے کی کوشش نہ
 کریں۔ بلکہ انہیں قبول کریں۔ جب آپ حقائق کو تبدیل نہ کر سکیں تو اپنے آپ کو تبدیل کر
 لیں۔ بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ یوٹرن پالیسی نقصان کا باعث ہوگی۔ بہر حال یہ نقصان اُس
 نقصان سے کہیں کم ہوتا ہے جو حقائق کے خلاف چلنے سے واقع ہوتا ہے۔ یوٹرن پالیسی کا دوسرا
 نام حقائق کو تسلیم کرنا اور بدلتے حالات کے ساتھ ایڈجسٹ کرنا ہے۔
 یوٹرن پالیسی سمجھدار لوگوں کی پالیسی ہے: یہ کامیابی کی ضامن ہے۔ اس سے اعراض
 میں ناکامی کا خدشہ ہے۔ اس لیے کامیابی اور ناکامی دونوں آپ کے ہاتھ میں ہیں۔



گمشدہ ماضی

اگر ایک شخص کسی غلطی کا مرتکب ہو کر اپنی شناخت کھودیتا ہے
 تو وہ اپنی اہمیت دوسروں کی نظروں میں کھودے گا

راجت گپتا کلکتہ میں 1948 میں پیدا ہوئے۔ جب وہ لڑکپن میں تھا تو اُن کے
 والدین اُن سے جدا ہو گئے۔ انہوں نے ان حالات کو بطور چیلنج قبول کیا۔ جس کے نتیجے میں اُن
 کے اندر کام کرنے کی لگن زور پکڑ گئی۔ پھر کچھ سالوں کے بعد وہ امریکہ چلے گئے۔ اور ایک طویل
 جدوجہد کے بعد وہ پریسیڈنٹ گلوبل کنسلٹنگ فرم میک کنسنسے کے میجنگ ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز
 ہو گئے۔ کاروبار میں کامیاب ہونے کے بعد اُن سے ایک بہت ہی سنجیدہ غلطی ہو گئی۔ جس کی وجہ
 سے جون 2012 میں امریکی عدالت نے انہیں سازش کرنے اور گولڈ مین سیکس کو خفیہ معلومات

فراہم کرنے کا مجرم قرار دیا۔ اُنھیں دو سال کے لیے پابند سلاسل کر دیا گیا۔ اور ساتھ ساتھ پچاس لاکھ امریکی ڈالر جرمانہ بھی کیا گیا۔ اُس دن ظاہری طور پر اُن کا کیرئیر ختم ہو گیا تھا۔ سزا سے پہلے اپنی چھ منٹ کی گفتگو میں اُنھوں نے کہا: ”میں نے اپنی نیک نامی ضائع کر دی، جو کہ ایک عرصہ حیات کے بعد میں نے حاصل کی تھی۔“ راجت گپتا کا بیان سو فیصد درست تھا۔ میں صرف اُن کے الفاظ میں کچھ ترمیم کروں گا۔ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ راجت گپتا کا کیس تاریخ میں بریک کا کیس تھا۔ اُنھوں نے غلطی کرنے کے بعد اپنے ماضی کو کھود دیا، جو کسی بھی نقصان سے بڑا نقصان تھا۔

انسان اپنی دولت کا نقصان برداشت کر سکتا ہے۔ لیکن کوئی اپنے ایام گذشتہ کا ضیاع برداشت نہیں کر سکتا، کوئی شخص چاہے عام کام کرتا ہو یا کسی ادارے میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہو۔ وہ اپنی کارکردگی سے اپنی ایک تاریخ رقم کرتا ہے۔ یہ ہی تاریخ اُس کا سب سے بڑا اثاثہ ہوتا ہے۔ دنیا ایک بازار کی مانند ہے یہاں ہر کوئی اتنا ہی حاصل کرتا ہے جتنا وہ اپنا استحقاق ثابت کرتا ہے۔ یہ انسان کی تاریخ ہوتی ہے جو اُس کے استحقاق کا تعین کرتی ہے۔ انسان کی اپنی تاریخ اپنے بینک بیلنس، جائیداد اور کسی بھی مادی تعیش سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ انسان کو اس معاملے حد درجہ محتاط ہونا چاہیے۔

ایک کہاوت کے مطابق: ”اگر دولت ضائع ہو جائے تو کچھ بھی ضائع نہیں ہوا، اگر صحت ضائع ہو جائے تو قدرے نقصان ہوا ہے۔ لیکن اگر کردار ضائع ہو جائے تو سب کچھ ضائع ہو گیا۔ میں یہاں کردار کو تاریخ کے لفظ سے تبدیل کرنا پسند کروں گا۔ اور یہ کہوں گا کہ انسان جو کچھ ضائع کرتا ہے اُس کی تلافی ممکن ہے۔ لیکن اگر آپ نے اپنی تاریخ کو ضائع کر دیا تو اس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔“

لوگ سروس میں بریک کے نقصان کو جانتے ہیں لیکن جو تاریخ میں بریک آتی ہے اُس کے نقصان کا اُنھیں شعور ہی نہیں ہے۔ گپتا کوئی استثنائی کیس نہیں تھا۔ انسان کی اپنی تاریخ اُس کی پہچان ہوتی ہے۔ یہ تاریخ اُس کی ایمانداری، دیانت اور شہرت پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ چیزیں کسی کی پہچان بنتی ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی غلطی کا ارتکاب کر کے اپنی پہچان کھود دیتا ہے تو وہ درحقیقت دوسروں کی نظر میں اپنی اہمیت کھود دیتا ہے۔ یہ ہی تاریخ میں بریک ہے۔ اگر کوئی شخص کسی بھی وجہ

سے اپنی تاریخی شناخت کو کھودے گا تو وہ اپنا سب سے قیمتی سرمایہ کھودے گا۔
ظاہری طور پر گپتا کے لیے کوئی راستہ نہیں بچا ہے، لیکن اُن کی زندگی دوسروں کے لیے سبق آموز ہے۔ جو لوگ ملازم ہیں وہ سروس میں بریک (Break in service) کے حوالے سے بہت محتاط ہوتے ہیں۔ لیکن لوگوں کو سروس میں بریک کے مقابلے تاریخ میں بریک قابل (Break in History) کے حوالے سے زیادہ محتاط رہنا چاہیے۔ سروس میں بریک قابل تلافی نقصان ہے۔ لیکن تاریخ میں بریک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ فارسی میں ایک کہاوٹ ہے کہ میری غلطی سے تم سبق حاصل کرو اور کبھی بھی وہ غلطی نہ کرو جو میں نے کی ہے۔ شاید یہ بہترین پیغام ہے جو گپتا دوسروں کو دے سکتے ہیں۔

دوسروں کی غلطیوں سے سبق حاصل کرنا اس بات کا آسان حل ہے کہ ہم دوسروں کی غلطیوں کو دوبارہ نہ دہرائیں اس طرح انسان کامیابی کی دہلیز پار کرنے سے پہلے کامیاب زندگی کا فارمولا سیکھ سکتا ہے۔ اگر چہ راجت گپتا ناکام ہو گیا لیکن وہ اُمید رکھ سکتا ہے کہ اُس کی ناکامی دوسروں کو کامیابی کے آزمودہ نسخہ سے روشناس کرائے گی۔



زندگی ایک تِنے ہوئے رَسے پر چلنا ہے

یقینی طور پر زندگی ایک تِنے ہوئے رَسے پر چلنے کی مانند ہے۔ اگر آپ ایک ہی طرف جھک جاتے ہیں تو گرنے سے نہیں بچ سکتے۔ اس لیے اپنے آپ کو ایک طرف جھکنے سے بچائیں، اور دونوں طرف اپنا توازن قائم رکھیں۔ محفوظ زندگی گزارنے کا یہ واحد راستہ ہے۔
زندگی ایک تِنے ہوئے رَسے پر چلنے کی مانند ہے۔ تِنے ہوئے رَسے پر چلنے کا مطلب ہے دو مختلف اطراف میں اپنا توازن قائم رکھتے ہوئے۔ بہت احتیاط سے آگے بڑھنا تا کہ آپ دونوں اطراف کی خطرناک صورت حال سے بچ سکیں۔ ٹائٹ روپ واکنگ (Tightrope Walking) کے الفاظ ابتدائی طور پر ایک تفریح عمل کے لیے اختیار کیے گئے تھے جس میں ایک رَسے کو مضبوطی سے دو پول کے درمیان باندھ دیا جاتا ہے۔ اور اس رَسے پر کوئی شخص لوگوں

کو محفوظ کرنے کے لیے چلتا ہے۔ تاہم تنے ہوئے رسے پر کامیابی سے چلنے کی روح اپنے توازن کو دو مخالف اطراف میں قائم رکھنا ہے۔ اور یہ توازن حقیقی زندگی کا ایک عظیم اصول ہے۔ آپ کو مٹھائیاں پسند ہیں لیکن آپ کے ڈاکٹر کا مشورہ ہے کہ آپ مٹھی اشیاء سے پرہیز کریں۔ کیونکہ آپ ذیابیطس کے مریض ہیں لہذا اس صورت حال میں آپ کوشش کریں گے اپنی خواہش اور ڈاکٹر کی ہدایت کے درمیان توازن رکھیں۔ اسی طرح گھر پر آپ کو پریشان کن صورت حال کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن جب آپ آفس میں ہوتے ہیں تو آپ اپنے دفتری امور کو بڑے پرسکون انداز میں ادا کرتے ہیں۔ لہذا آپ ان دو مختلف ذہنی دباؤ والی صورت حال کو متوازن کرنے کی کوشش کریں گے۔ آپ سڑک پر جا رہے ہیں۔ اور ایک اسکوٹر والا آپ سے ٹکرا جاتا ہے۔ قدرتی طور پر آپ کو غصہ آئے گا اور آپ اُس کو زد و کوب کرنا چاہیں گے۔ لیکن آپ سوچتے ہیں کہ اگر میں نے تشدد کیا تو پولیس آپ کو گرفتار کر کے جیل لے جائے گی۔ لہذا آپ اپنے غصہ کو قابو کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اپنے جذبات کو کنٹرول کرتے ہیں۔ آپ کا کاروبار میں کچھ نقصان ہو جاتا ہے اور آپ مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن آپ سوچتے ہیں کہ میں نے اپنے زمانہ حال کو ضائع کیا ہے لیکن اگر میں اسی طرح مایوسی کی دلدل میں پھنسا رہا تو میں اپنے مستقبل کو بھی ضائع کر دوں گا۔ پھر آپ اپنے جذبات کو کنٹرول کرتے ہیں اور اپنے دماغ کی دو مختلف حالتوں کے درمیان توازن قائم کرتے ہیں۔ اس طرح کی ہماری روزمرہ کی زندگی میں بے شمار مثالیں ہیں کسی کو اس میں استثنا نہیں ہے۔ اکثر صورت حال میں دماغ کی دو مختلف کیفیات ایک دوسرے کے برابر ہوتی ہیں اگر آپ کا جھکاؤ ایک کی طرف ہو تو دوسری طرف سے نقصان کا امکان ہے۔ یقینی طور پر زندگی ایک تنے رسے پر چلنے کی مانند ہے۔ اگر آپ ایک ہی طرف جھک جاتے ہیں تو گرنے سے نہیں بچ سکتے۔ اس لیے اپنے آپ کو ایک طرف جھکنے سے بچائیں اور دونوں طرف اپنا توازن قائم رکھیں۔ محفوظ زندگی گزارنے کا یہ واحد راستہ ہے۔

مثال کے طور پر ایک طالب علم امتحان میں فیل ہو کر مایوسی اور افسردگی کے اندھیروں میں ڈوب جاتا ہے۔ اور فیصلہ کرتا ہے کہ وہ خودکشی کر لے گا۔ پھر اُسے وہ سنہرا قول یاد آتا ہے: ”کوشش، کوشش اور پھر کوشش“۔ پھر وہ اپنے مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں دوبار سوچنا

شروع کر دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اگر اُس سے پہلا موقع ضائع ہو گیا تو کیا ہو ممکن ہے کہ میں دوسرے موقع پر کامیاب ہو جاؤں۔ پھر وہ دل و جان سے دوبار اپنی تیاری شروع کر دیتا ہے۔ دوسری دفعہ امتحان دیتا ہے اور اچھے نمبروں سے پاس ہو جاتا ہے۔ اس طالب علم نے دو مختلف اطراف میں اپنا توازن قائم رکھ کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیا۔

عام ڈکشنری کے مطابق تے ہوئے رسے پر چلنا (Tightrope walk) تفریحات میں سے ایک تفریح ہے۔ لیکن حکمت کی ڈکشنری میں اس کا معنی ”دانائی کے ساتھ زندگی گزارنا“ ہے۔ الفاظ و معنی کی ڈکشنری آپ کے ذخیرے الفاظ کو وسعت دے سکتی ہے۔ حکمت کی ڈکشنری آپ کو زندگی کے نشیب و فراز کے اثرات سے محفوظ رکھتے ہوئے کامیابی کے مواقع دیتی ہے۔

ہر کوئی اپنے اندر ہزاروں خواہشات دبائے بیٹھا ہے۔ جبکہ خارجی دنیا بے شمار حقائق سے بھری ہوئی ہے۔ آپ کو اپنی اندورنی خواہشات اور بیرونی حقائق کے درمیان حکمت پر مبنی توازن قائم کرنا چاہیے۔ یہ زندگی گزارنے کا حقیقی فن ہے۔ یہی وہ فن ہے جو ہر کسی سے مطلوب ہے۔ چاہے وہ امیر ہو یا غریب، عالم ہو یا جاہل امام ہو یا مقتدی۔ زندگی سب کے لیے یکساں ہے۔ ہر کسی کا اس طرح کی صورت حال کا سامنا کرنا لازمی امر ہے۔ تو ہر کسی کو تے ہوئے رسے پر چلنے والے فارمولے کو اختیار کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔



زندگی کو با مقصد بنانا

زندگی کا درست فارمولا وہ ہے جو زندگی کے آخری سانس تک اطمینان کا باعث بنے نہ کہ وہ فارمولا جو کہ عارضی تیشفی کا اہتمام کرے۔

ایک انگریزی کہاوت ہے کہ مطلوبہ نتائج اتنے اہم ہیں کہ اُن کے لیے کوئی بھی راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ شاید اس لحاظ سے ایک اور متعلقہ اصول کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے: ”

کسی مطلوب ہدف کا حصول اُس تک رسائی کے ناجائز ذرائع کے درست ہونے کا جواز فراہم نہیں کرتا ہے“ (The end does not justify the means) بہت سے لوگوں نے اپنی زندگی کا آغاز بڑے جوش و خروش سے کیا۔ لیکن زندگی کے آخری حصہ میں یہ ثابت ہوا کہ اُن کا آغاز درست نہ تھا۔ اُن کا معاملہ اپنی صلاحیتوں کے درست تعین کے بجائے غلط اندازوں پر مبنی تھا۔ مثال کے طور پر سکندر اعظم (323-356 BC) بہت ہی پر عزم شخص تھا۔ اُس کا مقصد دنیا کو فتح کرنا تھا۔ لیکن بشری کمزوریاں اُس کے عزائم میں حائل ہوئیں اور وہ بتیس سال کی عمر میں اپنے وطن سے تین ہزار کلومیٹر دور بابل لونا میں انتقال کر گیا۔ یہ بات ایڈلف ہٹلر (1889-1945) کے حوالے سے بھی درست ہے۔ جو ایک اولوالعزم شخص کی مانند جرمنی کے چانسلر کے عہدے پر پہنچا۔ پھر اُس نے پورے یورپ پر حکومت کرنے کا فیصلہ کیا، جس کے لیے اُس نے جنگ کی آگ بھڑکائی۔ جو بڑھتے بڑھتے دوسری جنگ عظیم میں بدل گئی۔ لیکن ہٹلر کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا اور اُس نے چھپن سال کی عمر میں کسی مورچے میں چھپ کر خودکشی کا ارتکاب کر لیا۔

اس طرح کی ہزاروں مثالیں تاریخ میں موجود ہیں۔ کہ بہت سے لوگوں نے اپنی زندگی کا آغاز بڑے پر عزم انداز میں کیا۔ لیکن اپنا ہدف حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے۔ اور مایوسی کی حالت میں مر گیا۔ آغاز میں وہ پُر امید تھے لیکن آخر میں، وہ کلی طور پر مایوسی کی حالت میں انتقال کر گئے۔ ”Right here, Right now“ زندگی کا فارمولا ہے۔ جس نے عصر حاضر میں مقبولیت حاصل کی ہے۔ یہ بہت خوبصورت فارمولا لگتا ہے میں خواتین و حضرات میں سے کئی لوگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے اس اصول کو اپنایا۔ اگرچہ وہ شروع میں بہت خوش تھے لیکن اپنی بعد کی زندگی میں انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے مقاصد حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے۔ بلا خروہ مایوسی کا شکار ہو گئے اور کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو کر اس جہان فانی سے اُس وقت رخصت ہوئے جب اُن کی اُمیدیں خاک میں مل چکی تھیں اور اُن کا جوش و خروش سرد ہو گیا تھا۔

وقتی خوشی کامیابی کا معیار نہیں ہے۔ خوشی کا درست پیمانہ اس سوال میں پوشیدہ ہے آیا

کہ کہ انسان اپنی خوشی اور اطمینان کو زندگی کی آخری سانس تک برقرار رکھ سکے یا نہیں۔ جس طرح درخت کی اہمیت کا انداز اُس وقت ہوتا ہے جب وہ پوری طرح شمر بار ہوتا ہے۔ اسی طرح زندگی کا درست فارمولا وہ ہے، جو انسان کے لیے اُس کی زندگی کے آخری لمحے تک اطمینان کا باعث بنے۔ نہ کہ وہ جو عارضی دورانیہ کے لیے خوشی کا اہتمام کرے۔

درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اور درخت کا شمر بار ہونے والا دور اُس کی زندگی کا آخری مرحلہ ہوتا ہے۔ اس طرح انسانی زندگی کی اہمیت کا اندازہ بھی اُس کی زندگی کے آخری دنوں میں اُس سے ظہور ہونے والے کاموں سے ہوگا۔ کبھی بھی عارضی خوشی کو پیش نظر رکھ کر زندگی کی منصوبہ بندی نہ کریں۔ انسان کو ہمیشہ مستقبل کو ذہن میں رکھ کر منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔ حال کے مقابلے میں مستقبل کی کامیابی اہمیت رکھتی ہے۔

انسان کو چاہیے سب سے پہلے اپنی دریافت کرے پھر اُس کے مطابق اپنی پلاننگ کرے۔ لوگ اپنے مقاصد اپنے جوش کے زیر اثر منظم کرتے ہیں۔ لیکن فیصلہ کرنے کا یہ طریقہ کار پختگی سے خالی ہوتا ہے۔ فیصلہ کرنے کا بہتر طریقہ یہ ہے انسان زندگی کے حقائق کو سمجھے۔ پھر اُس کے مطابق عمل کرے۔ مایوسی کی حالت میں مرنے کی بڑی وجہ جو شیے پن میں طے کردہ مقاصد میں ناکامی ہے۔ عموماً لوگ اپنے مقاصد کا تعین کرتے ہوئے جوش کے بجائے جوش سے کام لیتے ہیں۔ لہذا اس طرح کا پلان پائیدار نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ یہ ریت کے گھر وندے کی مانند ہوتا ہے جس نے آخر کار ڈھے جانا ہوتا ہے۔



ہاتھ پھیلانے کی قیمت

قانون سازی کے ذریعہ اول درجے کے شہری کا مرتبہ حاصل نہیں کیا جاسکتا یہ درجہ صرف اُسی صورت حاصل کیا جاسکتا ہے جب ہم معاشرے کو دینے والا کاردار ادا کریں اپنے امریکہ کے کئی دوروں کے دوران میں انڈیا کے مسلم اور ہندوں دونوں طبقوں سے ملا میں نے محسوس کیا کہ دونوں طبقوں کے معمر افراد کی ایک ہی تشویش ہے۔ کہ نئی نسل تیزی

سے اپنی تہذیبی شناخت کھورہی ہے میں نے دیکھا کہ اگرچہ دونوں طبقات سے تعلق رکھنے والی فیملیز نے معاشی خوشحالی حاصل کر لی ہے۔ لیکن پھر بھی وہ ناخوش ہیں۔ وہ بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ کہ ان کے بچے ثقافتی انجذاب کا شکار ہو جائیں گے۔ میں نے دونوں طبقوں کے معمر افراد سے کہا کہ آپ کے خدشات ممکن ہے درست ہوں لیکن آپ کی موجودہ کوششیں کوئی رنگ نہیں لائیں گی۔

نئی نسل کے ساتھ اصل مسئلہ کیا ہے؟ اصل مسئلہ یہ ہے کہ دونوں طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد امریکہ میں لینے والے بن کر رہ رہے ہیں۔ معاشرے کو کچھ دینے والے بن کر نہیں رہ رہے ہیں۔ دونوں طبقے ڈالر کمانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں لیکن دونوں معاشرے کو کچھ دینے والا کردار ادا کرنے سے پہلو تہی کر رہے ہیں۔ اسی گفتگو کے دوران، ایک بھارتی بزرگ نے تبصرہ کیا کہ عصر حاضر میں امریکہ کی زیادہ تر ترقی تارکین وطن کی مرہون منت ہے۔ میں نے کہا، ”نہیں“، اگرچہ ظاہری طور پر تارکین وطن امریکہ کی ترقیاتی کام میں سرگرم نظر آتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ ترقی (Credit) تارکین وطن کے بجائے اُس حوصلہ افزائی (Incentive) کے مرہون منت ہے جو یہاں موجود ہے۔ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ تارکین وطن اپنے ملک میں اپنی صلاحیتوں کے اظہار میں ناکام رہے ہیں۔ تاہم امریکہ میں یہ تقریباً تمام ترقیاتی کاموں میں متحرک نظر آتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ میں ہر کامیابی کی بنیاد میرٹ پر ہے۔ اس لیے ان تارکین وطن نے یہاں ایک ہیرو کی طرح کامیابی حاصل کی۔ ان حقائق کو پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے یہ ترقیاں تارکین وطن کے بجائے اُس حوصلہ افزاء ماحول کو جاتی ہے جو یہاں موجود ہے۔

آزادی کے بعد بھارتی معیشت ریاست کے زیر نگیں آگئی اور ایک ایسے نظام کو اپنالیا گیا تھا جس میں ہر چیز کا انحصار ریاستی پالیسی پر ہوتا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ آزاد معاشی اور مقابلے کے رجحان کا قلع قمع کر دیا گیا۔ ہر چیز کا فیصلہ اب ریاست کے ہاتھ میں تھا۔ اور فرد واحد ریاستی پالیسی کا محکوم بن کر رہ گیا۔ اور ریاست کنٹرول معیشت کا یہ لازمی خاصا ہے۔ کہ اس میں لوگ کام کرنے کی ترغیب کم رکھتے ہیں۔ اور جہاں کام کرنے کی ترغیب نہ ہو وہاں لوگ خلوص

نیت اور جذبے سے کام کرنے کے بجائے بس قانونی آڑ لے کر کام کو لٹکاتے ہیں۔
 1893 میں سوامی ویکانند امریکہ گئے۔ ایک روز وہ شکاگو میں ایک گلی میں جا رہے تھے اور سوامی رسم کے مطابق وہ دو چادروں میں ملبوس تھے اُس دور میں اس طرح کا لباس امریکہ میں زیب تن کرنا بالکل غیر معروف تھا۔ یہ دیکھ کر ایک عورت نے اپنے شوہر سے کہا، ”مجھے نہیں لگتا یہ کوئی شریف آدمی ہے“۔ حسن اتفاق سے سوامی ویکانند نے اُس عورت کی بات سن لی۔ وہ اُس خاتون کے پاس آئے اور شائستگی سے کہا: خاتون میں معذرت چاہتے ہوئے پوچھنا چاہوں گا۔ کیا آپ کے ملک میں صرف درزی ہی ہیں جو کسی کو شریف آدمی بناتے ہیں؟ کیونکہ جس ملک سے میں آیا ہوں وہاں تو یہ انسان کا کردار ہوتا ہے جو اُس کو شریف بناتا ہے۔“ میں نے یہ واقعہ ایک امریکن پروفیسر کو سنایا۔ میری بات سن کر مسکرائے اور کہا: ”شاید ماضی میں یہ انڈیا کا کلچر ہو لیکن اب انڈین کے لیے درآمد شدہ اشیاء کا کلچر ہے۔ اس سے مراد گھریلو کھپت کی اشیاء نہیں ہیں۔“ اگر ہندوستانی برادری اپنی اگلی نسل کا تحفظ چاہتی ہے تو اُس کو امریکی معاشرے کو کچھ دینے والا گروہ بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر اُن کی اگلی نسل امریکی معاشرے کی مسلسل لینے والے رکن بن کر زندگی گزارتی ہے تو پھر اُن کی کوئی بھی کاوش انھیں امریکن تہذیب میں ضم ہونے سے نہیں روک سکتی۔

کچھ بھارتی شکایت کرتے ہیں کہ امریکہ میں اُن کے ساتھ دوسرے درجے کے شہری کا سلوک روا رکھا جاتا ہے اگر ایسا ہے۔ تو یہ کسی قسم کے امتیازی قوانین کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ مساوات پر مبنی سخت قوانین کے باوجود بھارتی شہری دوسرے درجے کے شہری رہیں گے۔ کیونکہ اول درجے کے شہری کا مقام قوانین سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اول درجے کے شہری کا مقام اُسی وقت حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جب آپ معاشرے میں کچھ دینے والے کا کردار ادا کریں۔ مشہور کہاوت ہے۔ ”یہ دیا ہوا ہوتا ہے جو واپس آتا ہے۔“ موجودہ حالات میں اس کہاوت کا انڈین طبقے پر پوری طرح اطلاق ہوتا ہے۔



فردِ واحد، فطرت اور سماج

وہی اختلاف چیلنج کو تخلیق کرتا ہے۔ چیلنج مذاکرے کا باعث بنتا ہے اور ہر قسم کی ترقی مذاکرہ اور باہمی گفت و شنید کا نتیجہ ہوتی ہے۔

انسان اپنی پیدائشی خصوصیات کی وجہ سے مکمل انسان ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ دو خارجی اثرات پر انحصار کرتا ہے ایک فطرت دوسرا سماج۔ ایک اہم نکتہ نظر کے مطابق انسان مکمل طور پر فطرت پر تکیہ کرتا ہے۔ کیونکہ فطرت پانی، دھوپ، آکسیجن، خوراک اور دیگر تمام نظام زندگی کو منظم کرنے والے عناصر فراہم کرتی ہے۔ انسان ان قدرتی ذرائع سے قطع تعلقی برداشت نہیں کر سکتا۔ ان ذرائع سے دوری اختیار کرنے کا مطلب خودکشی کا ارتکاب ہے۔

یہ بات انسان اور سماج کے درمیان تعلق کے حوالے سے بھی درست ہے۔ عام کہا جاتا ہے کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے۔ یہ صرف اس لحاظ سے نہیں کہا جاتا، کہ انسان سماج میں رہتا ہے بلکہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ انسان کا مکمل طور پر دار و مدار سماج پر ہے۔ انسانی شخصیت سے لے کر تہذیب و تمدن کی ترقی تک ہر چیز کا آسرا معاشرے پر ہے۔ سماج سے منہ موڑنا نقل نفس کے مترادف ہوگا۔

کچھ لوگ ایک قسم کی انفرادیت پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ انفرادیت دیکھنے میں بہت خوبصورت لگتی ہے۔ لیکن عملی طور پر اس میں فائدہ نہیں ہے۔ کوئی بھی فرد واحد صرف اپنے لیے زندہ رہنا قبول نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ تمام چیزوں سے بے نیاز رہنے کے مترادف ہے۔ اور ہر شے سے بے نیاز رہنا صرف خدا کی صفت ہے۔

کوئی بھی انسان اپنے آپ کو سماج سے علیحدہ نہیں کر سکتا۔ ہر انسان سماج کا حصہ ہے۔ اور کسی کو سماج کے خلاف چلنے کا مشورہ دینا نیکی نہ ہوگی۔ تاہم اگر معاشرہ کرپٹ ہے تو اس صورت میں انسان اپنے آپ کو علیحدہ کر سکتا ہے۔ لیکن اس طرح کی صورت بمشکل ایک فیصد ہے۔ باقی 99 فیصد قابل اعتراض نہیں ہیں۔ اس لیے شاید ہی کبھی ہمارے اور معاشرے کے درمیان فاصلے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کوئی تیز مزاج ہے تو اُس کو اپنے اخلاق کو سماجی اقدار کے قالب میں ڈھال

لینا چاہیے۔ سماج کا یہ مسئلہ نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی فرد واحد کے لیے بدلے۔ ہر انسان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرتی اقدار سے ہم آہنگی پیدا کرے۔ کوئی بھی شخص اکیلا نہیں رہ سکتا۔ تاہم مسئلہ یہ ہے کہ ہر انسان یہاں مسٹر یا مسز اختلاف بن کر پیدا ہوتا ہے۔ یہ پیدائشی خصوصیت مسائل کو جنم دیتی ہے۔ جب لوگ اجتماعی طور سماج میں رہتے ہیں۔ تو ان کو بار بار محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک اختلافات کی دنیا میں رہ رہے ہیں۔ ہر اختلاف ایک چیلنج کی مانند ہوتا ہے۔ تو سماج میں رہنے کا مطلب ہے کہ مسلسل چیلنجز کے درمیان رہنا۔ یہ مسئلہ لوگوں کو پریشان کر دیتا ہے اور وہ تنہائی پسند بن جاتے ہیں یہ تنہائی درحقیقت ایک فرار کی قسم ہے۔ جب کہ مسائل سے فرار کوئی حل نہیں ہے۔ اختلاف پریشانی کا باعث نہیں ہے۔ نتائج کے لحاظ سے یہ رحمت ہے۔ یہ فطرت کا انسان کے لیے ایک تحفہ ہے۔ ایک مشہور کہاوت ہے کہ جب سب یکساں سوچتے ہیں۔ تو کوئی گہرا غور و فکر نہیں کرتا۔ اختلاف کا مطلب تنوع (Diversity) ہوتا ہے اس کا مطلب ہے کہ انسان اس دنیا میں ایک تنہا درخت کی مانند نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک بڑے باغ کا حصہ ہے۔ رنگ برنگے درختوں کا امتزاج باغ کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ اس اختلاف کے بغیر باغ بے رنگ ہو جائے گا۔ دراصل یہ اختلاف انسان کے لیے بہت بڑی سہولت ہے۔ یہ اختلاف ہی ہے جو کہ دماغ کو متحرک کرتا ہے اور زیادہ سے زیادہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

اختلاف ذہنی چیلنج کو تخلیق کرتا ہے۔ ذہنی چیلنج مذاکرات اور تبادلہ خیال کا باعث بنتا ہے اور ہر قسم کی ترقی مذاکرہ اور باہمی گفت و شنید کا نتیجہ ہوتی ہے۔ الگ تھلگ رہنے کا مطلب محدود دائرے میں رہنا ہے یعنی مستقبل کی ترقی میں ایک مسلسل رکاوٹ بن کر رہنا۔ تنہا پسند زندگی انسان کو باہمی طور علم سیکھنے سیکھانے سے اور ایک دوسروں کے تجربوں سے استفادہ کرنے سے محروم کر دیتی ہے۔ یہ بند خول میں رہنے کے مانند ہے۔ اور یوں بند خول میں رہنا صرف لاروا (Larva) کے لیے سود مند ہے۔ انسان کے لیے نہیں۔ انسان خول میں رہنے کا نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ لاروا کا خول میں رہنا اُس کی زندگی کا تحفظ ہے۔ لیکن انسان کے لیے خول میں رہنا موت سے کم نہیں ہے۔ سماجی زندگی کا مطلب ہے کہ تجربات کے درمیان رہنا، چیلنج قبول کرنا، اور دوسروں سے سیکھنا اور ان کو سیکھانا۔ سماجی زندگی ایک دانش گاہ کی طرح ہوتی ہے۔ جو

انسان سماج کے خلاف چلنے کی کوشش کرتا ہے درحقیقت وہ خودکشی کی کوشش کرتا ہے۔ کوئی بھی انسان فطری یا سماجی خودکشی کا انتخاب برداشت نہیں کر سکتا۔ لہذا شکایت ایک مہلک عمل ہے۔ چاہے وہ فطرت کے خلاف ہو یا سماج کے خلاف۔ ایڈجسٹمنٹ صرف واحد قابل عمل فارمولا ہے۔



دستیاب وسائل سے مستفید ہوں

اگر ایک طرف آپ کا اسکول روایتی تعلیم کا ذریعہ ہے تو دوسری طرف آپ کا خاندان آپ کے لیے غیر روایتی تعلیم کا وسیلہ ہے۔ اس لحاظ سے دونوں اہم ہیں۔ ہماری زندگی تعلقات کا مجموعہ ہے جس کی وجہ سے ہم زندگی کے منفی یا مثبت پہلوؤں کو کنٹرول کرتے ہیں۔ لہذا ہمیں اُن مواقع کو جو ہمارے تعلقات اور رشتے ناطوں نے مہیا کیے استعمال کرتے ہوئے بہت چوکس رہنا چاہیے۔

مثال کے طور پر آپ کا خاندان آپ کی ذات کا پہلا معیار ہے۔ یہ آپ کے خاندان کے ارکان ہیں جن کے ساتھ آپ شب و روز گزارتے ہیں۔ آپ اُن کے ساتھ بہت سے تلخ و شیریں تجربات سے گزرتے ہیں۔ اس لحاظ سے خاندان آپ کے سماجی ماحول کا بہت اہم حصہ ہے۔

آپ کو ہر اُس سبق سے مستفید ہونا چاہیے جو آپ نے اپنے خاندان سے سیکھا ہے۔ اگر آپ کو اپنے خاندان میں بعض ناگوار معاملات پیش آتے ہیں۔ تو آپ کو بُر د باری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ آپ کو تسلیم کرنا چاہیے کہ میرے اپنے خاندان کے دائرے میں ناگوار صورت حال کو نہیں روکا جاسکتا۔ تو معاشرے میں کیسا روکا جاسکتا ہے۔ اور پھر اگر آپ اپنے خاندان میں نرمی کا رویہ نہیں اپنا سکتے تو باہر کی دنیا میں آپ کیسے اپنائیں گے جب کہ باہر کی زندگی تو بہت مشکل ہے جہاں آپ کو بڑے پیمانے پر ناگوار صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے آپ کو نا پسندیدہ صورت حال کو اپنی زندگی کا ناگزیر حصہ سمجھ کر قبول کرنا

چاہیے۔ مزید اپنے خاندان اور معاشرے کے درمیان رہتے ہوئے کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔

آپ کا خاندان محض آپ کا خاندان ہی نہیں بلکہ یہ آپ کی تربیت کا ذریعہ بھی ہے۔ اس طرح آپ کا خاندان آپ کے مستقبل کی بنیاد بن جاتا ہے۔ اگر ایک طرف آپ کا اسکول روایتی تعلیم کا ذریعہ ہے تو دوسری طرف خاندان آپ کی غیر روایتی تعلیم کا وسیلہ ہے۔ اس لحاظ سے دونوں اہم ہیں۔

مثال کے طور پر آپ کا اپنے خاندان کے کسی فرد سے تنازع کھڑا ہو جاتا ہے، تو اُسے مصیبت نہ سمجھیں۔ بلکہ اُس کو سب سے پہلے تربیت کے زمرے میں لیں، کیونکہ ایک نہ ایک دن آپ نے اپنے گھر سے سے باہر نکل کر معاشرے میں زندگی گزارنی ہے۔ اور معاشرے میں آپ کو بارہا ایسے منفی تجربات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آپ لازمی اس اہمیت کا شکر ادا کریں کہ آپ کا خاندان آپ کے لیے خدا کی رحمت ہے۔ کیونکہ یہ آپ کی تربیت گاہ ہے جو آپ کو بطور ایک پختہ انسان تیار کر کے معاشرے میں بھیجتی ہے۔ اور یقیناً آپ کا خاندان آپ کے مستقبل کا اہم محرک ہے۔

ہر کوئی جانتا ہے کہ روایتی تعلیم مستقبل کے لیے بہت اہم ہے۔ بغیر بہترین روایتی تعلیم کے اچھی ملازمت کا حصول ناممکن ہے میں اس نکتہ پر اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن جامعیت کے لحاظ سے دیکھیں، تو روایتی تعلیم ہر مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ بہتر طرز زندگی کے لیے کچھ مزید بھی درکار ہے۔ یعنی غیر روایتی تعلیم بھی ضروری ہے۔ ہر کسی کا خاندان اُس کے لیے غیر روایتی تعلیم کی تربیت گاہ ہے۔ اس ادارے میں داخلہ لیں اس کی کوئی داخلہ فیس نہیں ہے۔ یہ حقیقت پیدائشی طور پر فطرت نے آپ کے مقدر میں لکھ دی ہے۔ تو آپ کی فیملی جو کچھ بھی آپ کو پیش کرتی ہے آپ لازمی طور پر اُس سے مستفید ہوں۔

خاندان ہر سماج کا ایک یونٹ ہے اس لحاظ سے آپ کا خاندان ایک چھوٹا سماج ہے۔ لہذا آپ کو اس چھوٹے سماج میں اپنی تربیت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ ایک بڑے سماج میں یہ آپ کی ایک خوشحال زندگی کا باعث بنے۔ جو انسان اپنے خاندان میں ایک خوشگوار زندگی

گزارنے میں ناکام ہو جاتا ہے وہ لازمی طور پر سماج میں بھی خوشگوار زندگی حاصل کرنے میں ناکام ہوگا۔

ایڈجسٹمنٹ زندگی کا ایک اصول ہے۔ جو تمام معاشرے میں ہم آہنگی کا باعث ہوتا ہے۔ اگر آپ بغیر اپنے خاندان میں ایڈجسٹمنٹ کا ہنر سیکھے سماج میں داخل ہوتے ہیں۔ تو آپ کے پاس پھر صرف دو انتخاب ہوں گے: یا تو آپ فوراً دوسروں کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کرنا سیکھیں گے یا منافقانہ روش اپنائیں گے اور زندگی نہ ختم ہونے والے ذہنی دباؤ میں گزاریں گے۔



سب سے بڑی خوبی

انسان اسی صورت میں اپنا ذاتی اہداف حاصل کر سکتا ہے جب وہ اُن چیزوں کو پیش نظر رکھے جو اُس کے بس میں نہیں ہیں۔ یہ ہی ایک واحد حقیقت پسندانہ زاویہ نظر ہے۔

لہذا یہی مہنی بردار نائی ہے

انسان کے لیے سب سے بڑی خوبی کون سی ہے؟۔ عام طور پر عدل و انصاف کو انسانی زندگی کی سب سے بڑی خوبی گردانا جاتا ہے۔ بادی النظر میں یہ بات ٹھیک بھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن عملی طور پر عدل و انصاف کے بجائے سب سے بڑی خوبی ایڈجسٹمنٹ کو تسلیم کیا جانا چاہیے۔ میں اپنے اس نکتہ نظر کی وضاحت کے لیے آپ کے سامنے جاپان اور پاکستان کی مثال پیش کروں گا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد پاکستان ایک علیحدہ ملک کے روپ میں وجود میں آیا تھا۔ لیکن ساٹھ سال سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود پاکستان کو عموماً ایک ناکام ریاست تصور کیا جاتا ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان نے اپنے ہمسائے ممالک کے ساتھ کشیدگی کا رویہ اپنایا۔ نتیجتاً اس کشیدگی نے پاکستان کو ماسوائے نقصان کے اور کچھ نہیں دیا۔ اس کے برعکس مثال جاپان میں دیکھی جاسکتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جاپان نے اپنی تاریخ کا نیا سفر شروع کیا۔ جاپان اور امریکہ کے درمیان بہت سنجیدہ مسائل تھے۔ جاپان نے معاملات کو بھانپتے ہوئے ایڈجسٹمنٹ کا راستہ اپنایا۔ دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد اُس وقت کے

جاپانی شہنشاہ ہیرو ہیتو (Hirohito) نے اپنی قوم کو واضح ہدایت دیتے ہوئے کہا، ”ہمیں ناقابل برداشت کو برداشت کرنا ہے، تاکہ جنگ کے بعد کے دور میں ہم اپنی قوم کی تعمیر از سر نو کر سکیں۔“ اور اب یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اُس کی حکمت عملی کے نتائج کرشماتی تھے۔ عصر حاضر میں جاپان دنیا کی سپر معاشی طاقت بن کر ابھرا ہے۔

یہ حکمت عملی عام آدمی کے لیے بھی درست ہے۔ میرے ایک جاننے والے صاحب ایک بین الاقوامی بینک میں ایک اعلیٰ پوسٹ پر تعینات تھے اُن کی اپنے سینئر آفیسر سے کسی بات پر ٹوٹکار ہوگئی۔ جس کے نتیجے میں وہ بہت دل برداشتہ ہوئے اور اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ آج وہ بیروزگار ہیں اور مایوسی میں دن گزار رہے ہیں۔ میرے ایک اور جاننے والے بھی کسی بینک کے اعلیٰ عہدے پر تعینات ہیں۔ اُن کے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی مسئلہ پیش آیا۔ اُن کی بھی اپنے سے زیادہ سینئر آفیسر سے کشیدگی ہوگئی۔ وہ میرے پاس مشورے کے لیے آئے۔ میں نے اُنھیں کہا کہ میرا مشورہ چار نکات پر مبنی ہے۔ پہلا نمبر پرائیڈ جسٹمنٹ، دوسرے نمبر ایڈ جسٹمنٹ، تیسرے نمبر پرائیڈ جسٹمنٹ اور آخر میں پھر ایڈ جسٹمنٹ۔ اُنھوں نے میرے مشورے پر عمل کیا اور آج وہ خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔

ذرا غور کریں کہ عدل و انصاف اور ایڈ جسٹمنٹ کے تصور میں کیا فرق ہے۔ انصاف کا حصول دونوں فریقین کا متاثر ہونا ہے۔ اس لیے اس کا حصول بہت مشکل ہے۔ جب کہ ایڈ جسٹمنٹ یک رخ پالیسی ہونے کی وجہ سے فوری طور پر قابل حصول ہوتی ہے نا انصافی کے کیس میں جب کوئی پارٹی آپ کے ساتھ نامناسب رویہ اپنائے ہوئے ہو تو ایسے میں دو مد مقابل فریقین کے درمیان انصاف کا حصول بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر قدرتی طور پر انصاف کی تلاش میں مطالبات کیے جاتے ہیں، احتجاج کا طریقہ اپنایا جاتا ہے۔ جس سے ایک طویل تنازع جنم لیتا ہے اور بعض اوقات یہ تنازع تشدد کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح انصاف کے حصول کی جدوجہد معکوس نتائج کا باعث بنتی ہے۔

ایڈ جسٹمنٹ کا معاملہ مکمل طور پر مختلف ہے اس میں آپ کے مد مقابل کوئی حریف نہیں ہوتا کوئی مخالف گروہ نہیں ہوتا۔ صرف آپ ہی کا تنہا کردار ہوتا ہے۔ اس لیے جب آپ

ایڈجسٹمنٹ کا انتخاب کرتے ہیں تو فوراً آپ کو نقطہ آغاز مل جاتا ہے۔ ایڈجسٹمنٹ کے ساتھ ہمیشہ امن وابستہ ہوتا ہے۔ اور معروضی حقائق کو زیر غور لائے بغیر عدل و انصاف کا اصرار کشیدگی کا باعث بنتا ہے۔

مشہور قول ہے کہ سیاست ممکنات کا ہنر ہے۔ اس قول کا اطلاق نہ صرف سیاسی دائرے پر ہوتا ہے بلکہ انسانی زندگی کے تمام دائروں میں اسے منطبق کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے تمام شعبہ ہائے زندگی کے مسائل کو ٹھیک کرنے کے لیے حقیقت پسندانہ سوچ کو ہر پہلو سے اختیار کرنا چاہیے۔ آپ کو اپنے اہداف میں یہ امتیاز کرنا چاہیے کہ کون سے اہداف قابل حصول ہیں اور کون سے اہداف آپ کی رسائی سے باہر ہیں۔ کون سا راستہ منزل کو جاتا ہے اور کون سا راستہ بھول بھلیاں ہے۔

ہر انسان کو اپنی اندرونی خواہشات اور بیرونی صورت حال میں توازن قائم کرنا چاہیے۔ اندھا دھند اپنی خواہشات کے پیچھے دوڑنا سے ضروری نہیں کہ آپ کا مقصد پورا ہو جائے۔ اس لیے انسان کو خارجی صورت حال اور بیرونی مواقع کا پوری طرح ادراک کرنا چاہیے۔ انسان اسی صورت میں اپنا ذاتی اہداف حاصل کر سکتا ہے جب وہ ان عوامل کو بھی پیش نظر رکھے جو اُس کے بس میں نہیں ہیں۔ یہی ایک واحد حقیقت پسندانہ زاویہ نظر ہے۔ اسی لیے یہی بردنائی ہے۔



ایڈجسٹمنٹ ایک سنہرا اصول

دوسرے لوگوں کے ساتھ ایڈجسٹ کرنا ہی آپ کے لیے واحد حقیقت پسندانہ انتخاب ہے۔ یہاں ایڈجسٹمنٹ سے مراد جوابی رد عمل کی پالیسی سے اعراض کرنا، دوسروں کو تبدیل کرنے کی کوشش نہ کرنا، منفی ذہنیت سے باز رہنا اور مسائل کو ناقابل حل تصور نہ کرنا ہے۔ مزید ایڈجسٹمنٹ سے خراب صورت حال کی خود اعتمادی کے ساتھ چول بیٹھنا ہے۔

ایڈجسٹمنٹ ایک طریق زندگی ہے۔ لیکن یہ ایڈجسٹمنٹ آخر ہے کیا؟ اپنے تمام

ارادوں اور مقاصد میں دوسروں کے ساتھ روادری یا شائستگی کا رویہ اپنانا ایڈجسٹمنٹ کہلاتا ہے ظاہری طور پر یہ رویہ دوسروں کے فائدے کے لیے ہوتا ہے لیکن حقیقت میں یہ آپ کے اپنے مفاد اور ذہنی سکون کے لیے ہوتا ہے۔ جب ایک دفعہ ناخوشگوار صورت حال میں مسایا نہ ایڈجسٹمنٹ طے پا جائے۔ تو انسان ذہنی سکون کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ خدا کے تخلیقی منصوبے کے مطابق ہماری دنیا اختلافات کی دنیا ہے۔ یہاں ہر انسان مسٹرنا موافق ہے یا مسزآن بن بنی ہوئی ہیں۔ اس پر مزید اضافہ یہ ہے یہاں ہر انسان کو اختیار ہے کہ وہ جس طرح کا رویہ چاہتا ہے اختیار کر سکتا۔ نتیجتاً یہاں ہر انسان بامر مجبوری اختلافات کے جنگل میں رہتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ یہ بات بھی تسلیم شدہ ہے کہ خدا کا تخلیقی منصوبہ ناقابل تغیر ہے۔ پھر ایسی صورت حال میں کیا کیا جائے؟ لامحالہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ایڈجسٹ کرنا ہی ایک حقیقت پسندانہ انتخاب باقی رہ جاتا ہے۔ ایڈجسٹمنٹ سے مراد جوانی رد عمل کی پالیسی سے اعراض کرنا، دوسروں کو تبدیل کرنے کی کوشش نہ کرنا، منفی ذہنیت سے باز رہنا اور مسائل کو ناقابل حل تصور نہ کرنا ہے۔ مزید ایڈجسٹمنٹ کا مطلب خراب صورت حال کی چول کا خود اعتمادی کے ساتھ بیٹھنا ہے۔ ہر صورت حال میں آپ کے پاس دو انتخاب ہوتے ہیں۔ آپ دوسرے لوگوں کے ساتھ ایڈجسٹ کریں یا ان کے ساتھ کشیدگی میں زندگی گزار دیں۔ اگر دوسروں کے ساتھ ایڈجسٹ نہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو یہ آپ کے مسائل میں مزید اضافہ کا باعث ہوگا۔ آپ ذہنی دباؤ میں زندگی بسر کریں گے۔ بے سکونی محسوس کریں گے اور اپنا وقت اور توانائی برباد کریں گے۔ لیکن اگر آپ ایڈجسٹمنٹ کا انتخاب کرتے ہیں۔ تو آپ فوراً ذہنی سکون حاصل کریں گے۔ اور یہ آپ کو ہر قسم کی منفی سوچ سے بچانے کا باعث بنے گا۔

ایڈجسٹمنٹ اپنے معاملات کو بہتر طور سے حل کرنے کا موقع دیتی ہے۔ لیکن عدم رواداری اور بے لحاظ ہونے کی پالیسی آپ کی زندگی میں لازمی طور پر عارضی یا مستقل ہیجان کا باعث بنتی ہے۔

ایڈجسٹمنٹ سے ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ آپ فروتنی کا رویہ اختیار کریں۔ بلکہ یہ دانائی کا اظہار ہے۔ یہ وہ ہی اصول ہے جو ہم میں سے ہر کوئی سڑک پر اختیار کرتا ہے۔ سڑک پر جہاں

مخالف سمت سے گاڑیاں آرہی ہوتیں ہیں۔ تو اپنے اپنے ملک کے ٹریفک قوانین کے مطابق ہر کوئی دائیں یا بائیں چلنے کا انتخاب کرتا ہے۔ یہ سڑک پر ایڈجسٹمنٹ کرنے کا طریقہ ہے۔ اگر آپ ان ٹریفک قوانین سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ تو یقینی طور پر آپ کسی خطرناک صورت حال کا سامنا کر سکتے ہیں حتیٰ کہ ایسا حادثہ بھی ہو سکتا ہے جس میں آپ کی موت واقع ہو جائے۔ ایڈجسٹمنٹ فطری فارمولے ”اپنے آپ کو بچاؤ“ پر مشتمل ہے۔ جب آپ دوسروں کو تبدیل کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، تو اپنے آپ کو تبدیل کریں۔ اس رویہ کا نام ہی ایڈجسٹمنٹ ہے۔ قانون فطرت کے مطابق باہمی معاملات کا تصفیہ کرنا زندگی گزارنے کا بہترین طریقہ ہے۔ جب آپ کے دوسروں کے ساتھ اختلافات پیدا ہو جائیں تو تنازع کھڑا کرنے کے بجائے باہم ایڈجسٹمنٹ کریں۔ یہ طریقہ نتائج کے حوالے سے آپ کے لیے بہترین ثابت ہوگا۔ یہ فارمولا اختیار کر کے آپ بغیر کسی تاخیر کے اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔ عملی (Practical) بننے اور اپنے وقت اور توانائی کو ضائع نہ کریں۔ ایڈجسٹمنٹ کے راستہ پر چلیں اور اپنی کامیابی کو یقینی بنائیں۔



باقی ماندہ پر منصوبہ بندی کرنا

بہترین فارمولا یہ ہے کہ جو گم ہو گیا اُس کو بھول جائیں اور دانشوار نہ پلاننگ سے جو باقی بچا ہے اُس کو استعمال کریں۔ جلد یاد دیر آپ بہت بڑے کامیاب شخص بن کر ابھریں گے۔

جرمن مدبر اوتو فون بسمارک (1815-1898) کا مشاہدہ بالکل درست ہے کہ سیاست ممکنات کا فن ہے۔ (یعنی سیاست میں کوئی شے حرف آخر نہیں ہے سیاست میں ہر چیز ممکن ہے۔) اس دانشمندانہ قول میں منصوبہ بندی کو بھی شامل کر کے وسعت دی جاسکتی ہے۔ کہ پلاننگ میں کوئی چیز بھی حرف آخر نہیں ہوتی ہے اس لئے پلاننگ ہمیشہ دستیاب وسائل کی بنیاد پر کی جانی چاہیے۔ اس کا مطلب ہے جو مواقع آپ کی رسائی میں ہیں ان کو پیش نظر رکھ کر اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنائیں۔ اس منصوبہ بندی کو اصطلاحاً ”دستیاب وسائل پر مبنی پلاننگ“ کہا جا

سکتا ہے:-

عام طور پر لوگ اپنا لائحہ عمل تشکیل دیتے ہوئے تصور کمالیت کے جنون میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ چیزوں کو ایک ہی دفعہ جامعیت کے ساتھ حاصل کر لیں۔ وہ اپنے منصوبوں کی مرحلہ وار تکمیل سے ہچکچاتے ہیں۔ تاہم ان خطوط پر سوچنا فطرت کے قوانین کے خلاف ہے۔ جب کہ حقیقت پسندانہ فارمولا یہ ہے کہ اگر کوئی چیز مکمل طور پر قابل حصول نہیں ہے تو انسان کو حاصل شدہ حصہ پر قناعت کرنی چاہیے۔ دنیا کی کئی اقوام نے چیزوں کو مکمل طور پر حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن سو سالہ جدوجہد کے باوجود ان کی خواہشات تشنہ رہ گئیں ان پر اس ہندی کہاوت کا اطلاق ہوتا ہے۔ 'آدھی چھوڑ کر جو ساجی دھاوا آدھی رہ ناساجی پاوا'۔ یہی وجہ ہے اگرچہ ان قوموں نے اپنے مقاصد کے حصول کی جدوجہد بڑے جوش و جذبے سے شروع کی۔ لیکن ان کی کوششیں ناکامی سے ہمکنار ہوئیں۔ وہ نہ صرف اپنے مقرر شدہ اہداف سے محروم رہے، بلکہ جو پاس تھا اُسے بھی گنوا بیٹھے۔

اس کے برعکس جاپان اور جرمنی کی مثال ہے۔ دونوں قومیں دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنے ان بہت سے علاقوں سے محروم ہو گئیں جو جنگ سے پہلے ان کے زیر تسلط تھے۔ جرمنی کے مشرقی حصہ اور برلن کا کچھ علاقہ ملا کر کل رقبہ 108333 کلومیٹر بنتا ہے جس پر روس نے قبضہ کر لیا تھا۔ جاپان کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔ اُس نے جزیرہ اوکیناوا جس کا کل رقبہ 1206 کلومیٹر تھا امریکہ کے حوالے کر دیا تھا۔ دونوں ملک جو کچھ گنوا چکے تھے اُس کو ایک طرف رکھ کر انہوں نے باقی ماندہ کو بنیاد بنا کر اپنے معاشی استحکام کے لیے مستقبل کا پلان تشکیل دیا۔ اس حکمت عملی سے حیران کن نتائج برآمد ہوئے۔ جنگ کے بعد جرمنی کے قائد کونارڈ ایڈنائر یورپ کے صنعت و حرفت کے لیڈر بن کر ابھرے۔ اور دوسری طرف جاپان شہنشاہ ہیرو ہٹو کی قیادت میں براعظم ایشیا کی سپر معاشی طاقت بن کر نمودار ہوا۔

یہی دستیاب وسائل کی بنیاد پر پلاننگ یا باقی ماندہ حصہ کی اساس پر منصوبہ بندی کا معجزہ ہے۔ اُس پلاننگ کے برعکس جو سارے کے سارے حصے کے حصول کے لیے کی جائے۔ فرد واحد اور قوموں کے لیے یہ بہترین فارمولا ہے کہ جو گم ہو چکا ہے اُس کو بھول جائیں۔ اور گہری

منصوبہ بندی سے جو باقی بچا ہے اُس کو استعمال کریں۔ جلد یا بدیر آپ بہت بڑے کامیاب شخص بن کر ابھریں گے۔

تاریخ میں ایک اور بہت اچھی مثال سنگاپور کی ہے پہلے سنگاپور ملائیشیا کا حصہ تھا 1965 میں اس کو ملائیشیا کی فیڈریشن سے نکال دیا گیا۔ اور یہ ایک آزاد ریاست بن گیا۔ سابقہ پرائم منسٹر لی کون یو کے زیر قیادت سنگاپور نے مذکورہ پالیسی اختیار کی۔ آج نتیجہ سامنے ہے اگرچہ رقبہ کے لحاظ ملائیشیا سنگاپور سے چار سو گنا بڑا ہے۔ لیکن ترقی کے لحاظ سے سنگاپور ملائیشیا سے کہیں آگے ہے۔

افراد و اقوام اپنی ہزاروں خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے منصوبہ بندی کرتی ہیں۔ لیکن گہری بصیرت پر مبنی منصوبہ بندی کو دو چیزیں یعنی ذاتی خواہشات اور دستیاب وسائل کے درمیان ایڈجسٹمنٹ مطلوب ہوتی ہے۔ لہذا کامیابی کا راز یہ ہے کہ اپنی خواہشات اور دستیاب وسائل کا صحیح تعین کیا جائے۔ یہ بات سو فیصد یقینی ہے کہ انسان اپنی خارجی دنیا کو نہ تبدیل کر سکتے۔ اور نہ قوانین فطرت پر حکمرانی کر سکتا ہے ایسے میں ہمارے پاس صرف ایک راستہ ہے: کہ اپنی خواہشات اور بیرونی دنیا میں دستیاب وسائل کے درمیان حقیقی ایڈجسٹمنٹ کریں۔



مقابلے کا زمانہ

انسانی زندگی ہمیشہ نشیب و فراز کا سامنا کرتی ہے، لیکن کوئی بھی صورت حال سفر حیات میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ ایسی تمام صورت میں قانون فطرت ہی غالب آئے گا۔
زمانہ ماضی میں جانب داری، افر با پروری کا سماج میں عام چلن تھا۔ لیکن عصر حاضر میں مقابلہ کار، حجان ترقی کے لیے ایک فیصلہ کن عنصر ہے۔ معاشرے میں مقابلہ کار، حجان پیدا ہونے کی وجہ جمہوریت کا ظہور ہے۔ جمہوریت کا کلچر جانب داری کے بجائے میرٹ پر مبنی ہوتا ہے۔ اگر آپ اپنی جانب کے لیے اہل ہونا ثابت کرتے ہیں تو آپ کو اچھی مراعات دی جائیں گی۔ ورنہ جمہوریت آنے کے بعد ذاتی مفاد کا تصور نظریاتی طور ختم ہو چکا ہے۔

عصر حاضر میں مقابلے کے رجحان کی وجہ سے نئے سماجی اقوال ظہور میں آئے۔ جیسے ”مقابلہ یا موت“ اور ”میرٹ پر مبنی ترقی“ وغیرہ۔ اس زبردست مقابلے کے پس منظر میں، کچھ لوگ اس بات پر اصرار کرتے ہیں۔ کہ مقابلہ پر مبنی نظام وسائل یافتہ اور محروم دو قسم کے طبقات پیدا کرتا ہے۔ اُن کے خیال میں وسائل یافتہ طبقہ لازمی کامیابی حاصل کرتا ہے۔ جب کہ وسائل سے محروم طبقے کی قسمت میں مفلسی ہے۔ سماجی فلاح و بہبود کے کام کرنے والے مقابلے میں رکاوٹ بننے والے مسائل کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں لیکن یہ تمام اقدامات نتائج کے لحاظ سے منفی ثابت ہوتے ہیں کیونکہ اُن کا دوہرا معیار تصور غیر منصفانہ ہونے کی وجہ سے ناقص ہے۔

قانون فطرت کے مطابق اگر ایک انسان اپنے آپ کو محرومی کی حالت میں پاتا ہے۔ تو یہ اُس کے لیے فُک اسٹاپ نہیں ہے۔ بلکہ یہ اُس کے مستقبل کے راستے پر کوما ہے۔ کیونکہ احساس محرومی اُسے محنت کرنے کی ترغیب دے گی تاکہ وہ ترقی کرے۔ اس لیے وہ شخص جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ برباد ہو چکا ہے حقیقت میں برباد نہیں ہوا ہوتا۔ بلکہ وہ اپنے آپ کو ثابت کرنے کے لیے ایک نئے جذبے کے ساتھ متحرک ہوتا ہے۔ اور اُس کے منتخب کردہ دائرہ عمل سے کوئی اُسے کمزور یا بے دخل نہیں کر سکتا۔ اس طرح متحرک شخص اپنے احساس محرومی کو کوسوں دور چھوڑ کر بیاخرباعزت مقام حاصل کرنے لگا۔

بہت سی تاریخی مثالیں ہیں جس سے پتا چلتا ہے کہ تحریکی عنصر ذاتی ترقی میں کارآمد ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ کہ بڑے بزنس مین بل گیٹس اپنے تجربات سے آگاہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں، کہ میں کچھ مضامین میں فیل ہو گیا جب کہ میرا دوست سب مضامین میں پاس ہو گیا۔ اب وہ آرگنائزیشن میں انجینئر ہے۔ اور میں اُس آرگنائزیشن کا مالک ہوں۔“ اس بیان میں ایک اہم حقیقت پوشیدہ رہ گئی۔ وہ یہ کہ جب بل گیٹس نے دیکھا کہ وہ مقابلے میں بہت پیچھے رہ گیا تو انسانی فطرت کے مطابق اُس نے اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ تیار کیا اور اپنے اندر کام کرنے کی ایک زبردست لگن محسوس کی۔ پھر وہ آگے نکل گیا۔

عموماً لوگ چیزوں کی ظاہری اہمیت کو دیکھتے ہیں لیکن فطرت کیسے ان چیزوں کے پس

منظر میں کام کر رہی ہے وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ کے باغ میں ایک درخت ہے۔ آپ اُس کی کسی شاخ کو توڑ دیتے ہیں آپ بہت جلد دیکھیں گے کہ اُسی جگہ ایک نئی شاخ نمودار ہوگئی ہے۔ یہ فطرت کا قانون ہے۔ جس کا اطلاق انسان زندگی پر بھی ہو سکتا ہے۔ اس اضافہ کے ساتھ کہ کوئی شخص آپ کو پہلے موقع سے فائدہ اٹھانے سے روک سکتا ہے لیکن کسی بھی انسان میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ آپ کو دوسرا موقع استعمال کرنے سے روک سکے۔ لہذا فارمولہ ”مقابلہ یا موت“ کا مطلب ہر چیز کا ختم ہو جانا نہیں ہے۔ یہ تو صرف ایک تشبیہ ہے۔ جس کا مقصد لوگوں کی صلاحیتوں کو ہمیز لگانا ہے۔ تاکہ وہ زندگی میں کامیاب ہو جائیں۔ اگر ایک شخص پہلے موقع پر ناکام ہو گیا تو اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ وہ تباہ ہو گیا۔ کیونکہ ہر انسان کے اندر ممکنہ طور پر یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ دوسرا موقع استعمال کر سکتا ہے۔ اور جو کچھ اُس نے پہلے موقع کے وقت ضائع کر دیا تھا اُسے دوبارہ حاصل کر لے۔

انسانی زندگی ہمیشہ نشیب و فراز کا سامنا کرتی ہے، لیکن کوئی بھی مشکل سفر حیات میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ ہر صورت میں قانون فطرت ہی غالب آئے گا۔



اب یا پھر کبھی نہیں

آپ کو ہر دن اپنی زندگی کا آخری دن سمجھنا چاہیے تاکہ آپ فیصلہ کریں کہ فوری طور پر کیا کرنا ہے، ورنہ آپ کچھ بھی نہ کر سکیں گے

میری ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی وہ تعلیم یافتہ اور ذہین تھا لیکن کسی وجہ سے اُسے سگریٹ نوشی اور شراب نوشی کی لت لگ گئی تھی۔ میں نے اُسے ان بری عادات کو ترک کرنے کی نصیحت کی۔ اور کہا: ”یہ عادات نہ صرف تمہاری صحت کو تباہ کر دیں گی۔ بلکہ تمہاری ذہنی ترقی کی رفتار کو بھی سست کر دیں گی۔ ان عادات کو اختیار کرنا ہر زاویہ نظر سے ایک تباہی کا عمل ہے۔“ میں نے مزید کہا کہ ان عادات سے چھٹکارا حاصل کرنے کو بطور ایک ایمر جنسی لیں۔ اُس نے میری بات سن کر، کچھ وقفہ کے بعد جواب دیا، ”میں ایسا ہی کروں گا“ میں نے کہا، ”نہیں، آپ کو کہنا

چاہیے، میں یہ کر چکا ہوں“

زندگی میں اب یا پھر کبھی نہیں کا اصول کام کرتا ہے۔ میں بذات خود کسی بھی لمحے اس اصول کو ترک نہیں کرتا ہوں۔ یوں کہنا کہ میں یہ کام کروں گا اس میں ایک آرام پسندی ہے، جو کہ ہمارے لیے ناقابل برداشت نقصان ہے۔ ہمیں نہ صرف تیزی سے فیصلے کرنے چاہئیں بلکہ اُن پر فوری عمل بھی کرنا چاہیے۔ آپ کو ہر دن اپنی زندگی کا آخری دن سمجھنا چاہیے، تاکہ آپ فیصلہ کریں کہ فوری طور پر کیا کرنا ہے، ورنہ آپ کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ پرانی کہاوت کو یاد رکھیں، ’وقت اور جو اربھائیس کا انتظار نہیں کرتے‘

میں نے اُس نوجوان لڑکے سے کہا کہ انسانی ذہن میں صلاحیتوں کی بہت سی کھڑکیاں ہیں۔ عموماً یہ کھڑکیاں ہنگامی حالات میں کھلتی ہیں جب انسان کو فوری فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ اچانک شیش ناگ دیکھتے ہیں تو بہت تیزی سے پیچھے ہٹیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سانپ کے خوف نے آپ کے دماغ کو فوراً سرگرم کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دماغ کی کچھ کھڑکیاں فوری طور پر کھولیں جو عام حالات میں بند تھیں۔

ہر انسانی ذہن بہت سی ممکنہ صلاحیتوں کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن عام طور پر لوگ ان صلاحیتوں کو آخری درجے میں جا کر استعمال کرتے ہیں۔ لیکن سمجھدار آدمی وہ ہوتا ہے جو اپنی نظر اس قول پر رکھتا ہے، ’موجودہ وقت جیسا کوئی وقت نہیں ہے‘ وہ اپنے ذہن کی کھڑکیاں نارمل حالات میں بھی کھول کر رکھتا ہے تاکہ اپنے ذہن کی تمام صلاحیتوں کو مثبت پلاننگ میں استعمال کر سکے۔ انسان اور حیوان دونوں خوف سے چونکنا ہو جاتے ہیں لیکن جو چیز انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ یہ کہ خوف نہ ہونے کے باوجود اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو متحرک کرتا ہے۔

☆☆

مظاہرے بمقابلہ نتائج

معاملات کو حل کرنے کے دو طریقے ہیں ایک مبنی بر مظاہرہ دوسرا مبنی بر نتائج۔ مظاہروں پر مبنی معاملات بہت جلد مقبول ہو جاتے ہیں۔ یہ اخبارات میں شہ سرخیاں بنتے، لوگوں کا ہجوم اکٹھا

کرتے اور عوام کی طرف سے تعریف و تحسین کی وجہ بنتے ہیں۔ تاہم اس طرح کی سرگرمیوں کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی ہے۔ (جس پر مثبت فکر تعمیر ہو) یہ سرگرمیاں خبریں تو پیدا کرتی ہیں۔ لیکن آخر میں مثبت نتائج سے بہرہ مند نہیں کرتیں۔ ان خطوط پر جو لوگ کام کرتے ہیں وہ ہمیشہ ہائی پروفائل انداز میں کام کرتے ہیں اور اس طرح وہ اپنے ذاتی مفاد کے لحاظ سے کچھ حاصل کر لیتے ہیں، لیکن جس سماج کا وہ حصہ ہوتے ہیں اُس کی کسی قسم کی تعمیر کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ دوسرا کام کرنے کا طریقہ اپنے آپ کو ایسی سرگرمیوں میں منہمک کرنا ہے جس میں مظاہر یا احتجاج نہ ہو۔ جو لوگ اس طرح مشقت کرتے ہیں وہ لو پروفائل (Low Profile) میں کام کرتے ہیں شاذ ہی کبھی انھیں شہرت نصیب ہوتی ہے۔ اُن کا کام عوام کی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ تاریخ میں بھی اُن کے کام کا ذکر نہ ہو۔ لیکن یہ ہی لوگ بہترین انسان ہوتے ہیں۔ یہ لوگوں سے کچھ لیے بغیر اُن کو دیتے ہیں۔ اس طرح وہ انمول روایات تشکیل دیتے ہیں جو آنے والی نسل کو فائدہ دیتی ہے۔

مبنی براحتجاج طریقہ مختصر وقت کے لیے ہوتا ہے۔ اور فوراً فائدے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ قانون فطرت کے مطابق کوئی ایسا کام جس کا مقصد فوراً فائدہ حاصل کرنا ہو وہ کام کبھی بھی نفع بخش نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس نتائج پر مبنی کام کی نظر کچھ تعمیری فوائد دینے پر ہوتی ہے۔ جو لوگ اس طرح کے ہدف مقرر کرتے ہیں وہ طویل مدتی منصوبہ بندی کرتے ہیں اس دنیا میں یہ ہی طریقہ ہے جو ٹھوس نتائج لاسکتا ہے۔



اعمال کے غیر متوقع نتائج

دانا آدمی وہ ہوتا ہے جو لائحہ عمل تیار کرنے سے پہلے اُس کے متعلقہ ہر پہلو کو با نظر غائر جائزہ لیتا ہے پھر با مقصد سوچے سمجھے اقدامات کرتا ہے امریکی صدر براک اوباما نے سابقہ امریکی صدر جارج ڈبلیو بوش کو اسلامی ریاستوں میں تیزی سے بڑھتی دہشت گردی کا قصور وار ٹھہرایا ہے۔ اُنھوں نے وائس نیوز ۷ مارچ ۲۰۱۵ کو

انٹرویو دیتے ہوئے کہا، کہ دہشت گرد گروپوں کا ظہور میں آنا اُس جنگ کا نتیجہ تھا جو جارج بش نے عراق میں شروع کی تھی۔ ”عراق شام میں دولت اسلامیہ کا قیام براہ راست القاعدہ کا نتیجہ تھا جو کہ ہمارے حملے کے نتیجے میں پیدا ہوئی، یہ ایک غیر متوقع نتائج کی مثال ہے۔ اس لیے ہمیں گولی چلانے سے پہلے نشانہ باندھنا چاہیے۔“

۱۹ مارچ ۲۰۰۳ امریکی صدر بوش کے دور حکومت میں ایک بڑی فوجی طاقت کے ساتھ امریکہ نے عراق پر حملہ کیا۔ حملے سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے یہ خبر آئی کہ شاید امریکہ عراق پر حملہ کر دے۔ میں نے ۱۶ ستمبر، ۲۰۰۱، ٹائمز آف انڈیا کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ امریکہ کی جارحیت معکوس نتائج (Counter productive) کا باعث بنے گی۔ بعد ازاں جو واقعات ظہور پذیر ہوئے انھوں نے میرے خدشات کی تصدیق کر دی۔ سیاسی یا غیر سیاسی میدان عمل میں چند ایک انسان ہوتے ہیں جو اس طرح کے اقدامات سے گریز کرتے ہیں جو اپنے نتائج کے حوالے سے اٹھے ہوں۔ اور ایسے اقدامات جو غیر متوقع صورت حال کا باعث بنے وہ منفی نتائج پیدا کرتے ہیں۔ یہ بات صرف امریکہ کے معاملے میں درست نہیں ہے بلکہ پوری تاریخ میں کئی ممالک اور طاقتور عہدوں پر فائز افراد کی بھی یہی داستان ہے

انسان کی ایک بہت بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا ضرورت زیادہ اندازہ لگا لیتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ایسے اقدامات کر بیٹھتا ہے جن سے اُس کی توقعات پوری نہیں ہوتیں ہیں۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ انسانی تاریخ تباہ کن شکستوں اور عظیم فتوحات سے بھری ہوئی ہے۔ شاید کوئی بھی ایسی فتح نہیں ہے کہ جس کو ہم لا جواب فتح کہہ سکیں

یہ حقیقت ہے مختلف سماجی، سیاسی اور مذہبی عناصر دنیا میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں کچھ ہمارے حق میں کام کرتے ہیں اور کچھ نہیں کرتے۔ دنیا میں غیر متوقع نتائج یا غیر مطلوبہ رد عمل ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں چونکہ لوگ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے اُن خارجی عناصر کو زیر غور نہیں لاتے جو اُن کے پلان کے خلاف جارہے ہوتے ہیں۔

دانا آدمی وہ ہوتا ہے جو لائحہ عمل تیار کرنے سے پہلے اُس سے متعلقہ ہر پہلو پر گہرا غور و فکر کرتا ہے پھر با مقصد سوچے سمجھے اقدامات کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص ان خطوط پر چلنے میں

نا کام ہوتا ہے تو وہ غیر ارادی اور غیر متوقع نتائج کا سامنا کرے گا۔ یہ اصول سپر پاورز اور کمزور ممالک دونوں پر صادق آتا ہے۔



آفات کبھی فائدہ مند نہیں ہوتیں

خود اعتمادی اچھی صفت ہے لیکن خوش فہمی کا شکار ہونا منفی عمل ہے بہادری فائدہ مند ہو سکتی ہے۔ لیکن خطرہ مول لینا تباہ کن ہو سکتا ہے۔

۲۴ دسمبر، ۲۰۱۴ آگرہ نو ڈاراستے پر شدید دھند کی وجہ سے ایک تیز رفتار ٹرک یا مونا ایکسپرس وے پر ایک کار کے پچھلے حصے سے ٹکرا گیا جس کی وجہ سے آگے پیچھے آتے ہوئی کئی گاڑیاں آپس میں ٹکرائیں۔ اس ایکسیڈنٹ میں دو افراد ہلاک اور تیس لوگ زخمی ہوئے۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس ارویند کمار نے کہا: ”تیز رفتاری اور شدید دھند حادثہ کا باعث بنی“

لیکن یہ حادثہ دو وجوہات کی بنا پر نہیں بلکہ ایک ہی وجہ یعنی حد سے زیادہ خود اعتمادی کی بنا پر ہوا تھا۔ جب دھند چھائی ہوئی تھی تو ڈرائیوروں کو احتیاطی تدبیر اختیار کرتے ہوئے تیز رفتاری سے گریز کرنا چاہیے تھا۔ لیکن انھیں اپنے اوپر حد سے زیادہ اعتماد تھا جس کی وجہ سے وہ غیر ضروری تیز رفتاری کے مرتکب ہوئے۔ ایسی حالت میں اسی نتیجہ کی توقع تھی لہذا ان کے سفر کا اختتام ایک حادثے پر ہوا۔ جس کو ٹریفک پولیس نے بڑا حادثہ (Mega Crash) قرار دیا۔ خود اعتمادی اچھی صفت ہے لیکن خوش فہمی کا شکار ہونا منفی عمل ہے بہادری فائدہ مند ہو سکتی ہے۔ لیکن خطرہ مول لینا تباہ کن ہو سکتا ہے۔ یہ بہت اہم سبق ہے جو اس حادثے سے سیکھنا چاہیے۔



جب آپ اپنے عروج پر ہوں تو اپنے

سمیت دوسروں کو فائدہ پہنچائیں

ہر انسان کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ہم سب فطرت کے محکوم ہیں۔ لوگ قانون فطرت کی پابندی کر کے اپنا مستقبل تعمیر کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اس قانون سے انحراف کرتے ہیں تو اس دنیا میں ہمارے لیے کوئی جگہ نہیں بچے گی۔

علم حیاتیات کے مطالعے کے مطابق، ہر مرد و عورت اپنی زندگی میں چار مراحل سے گزرتا ہے۔ ان مراحل سے کسی کو استثناء نہیں ہے۔ پہلا مرحلہ اُس کا بچپن ہے جو اُس کی پیدائش سے لے کر تقریباً دس سال کی عمر تک محیط ہے۔ اسی عرصے کے دوران اس کی بنیادی شخصیت تشکیل پاتی ہے۔ دوسرا مرحلہ جوانی کا ہے جو دس سے پچیس سال پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس دوران انسان جسمانی اور ذہنی پختگی حاصل کرتا ہے۔ تیسرا مرحلہ زیادہ سے زیادہ طاقت کا ہے جو کہ پچیس سے پینتیس سال پر مبنی ہوتا ہے۔ بڑھا پا آخری مرحلہ ہے جو کہ جسمانی صحت کے انحطاط کا زمانہ ہوتا ہے۔ عمر رسیدگی کے اثرات پینتیس سال سے شروع ہو کر بقیہ ساری زندگی آہستہ آہستہ گہرے ہوتے رہتے ہیں

علم حیاتیات کے حساب سے ہر شخص کی زندگی میں دس بہترین سال ہوتے ہیں۔ اس عرصہ کے دوران انسان اپنی پوری طاقت سے بہرہ ور ہوتا ہے جو کہ انسان کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے۔ اُس نے اس دوران جو کچھ جسمانی یا ذہنی ترقی کے لحاظ سے حاصل کیا ہوتا ہے۔ وہ بقیہ ساری زندگی اُس کے جسم اور ذہن کو فائدہ دیتا ہے۔ یہ وہ عمر ہے جس میں انسان بڑے بڑے کام کر سکتا ہے۔

ہر انسان کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ہم سب فطرت کے محکوم ہیں۔ لوگ قانون فطرت کی پابندی کر کے اپنا مستقبل تعمیر کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اس قانون سے انحراف کرتے ہیں تو اس دنیا میں ہمارے لیے کوئی جگہ نہیں بچے گی۔

یہ ہر انسان کا فرض اولین ہے کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرے اور اس بات کو سمجھے کہ اس معاملے میں جیت ہیئتگی کی جیت ہے اور اس معاملہ میں ہار ہیئتگی کی ہار ہے۔



خود اعتمادی

خود اعتمادی اس امر کی دلیل ہے کہ ابھی تک آپ زندہ ہیں اور اس سے محرومی موت کی علامت ہے۔ لیکن خود اعتمادی کا منفی پہلو بھی ہے۔ جو کسی بھی وقت کسی کے لیے تباہ کن بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اس منفی پہلو کو حد سے زیادہ خود اعتمادی یا خوش فہمی کہا جاتا ہے۔

خود اعتمادی ایک اہم وصف ہے۔ آپ کو اپنے اوپر بھروسہ کرنا چاہیے۔ آپ اپنے لیے جو ہدف مقرر کرتے ہیں اُس کے لیے مصمم ارادے کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کو اپنا لائحہ عمل بغیر کسی ہچکچاہٹ اور موجودہ وسائل کو ذہن میں رکھ کر تشکیل دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کو اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ آپ مواقع کو دریافت کریں اور اُس کے مطابق اقدامات اٹھائیں۔ یہ تمام چیزیں خود اعتمادی سے منسلک ہیں۔ آپ کو زندگی کے ہر شعبہ میں کامیاب ہونے کے لیے خود اعتمادی کی ضرورت ہوتی ہے۔

خود اعتمادی اس امر کی دلیل ہے کہ ابھی تک آپ زندہ ہیں۔ اور اس سے محرومی موت کی علامت ہے۔ لیکن خود اعتمادی کا منفی پہلو بھی ہے۔ جو کسی بھی وقت کسی کے لیے تباہ کن بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اس منفی پہلو کو حد سے

زیادہ خود اعتمادی یا خوش فہمی کہا جاتا ہے۔

اگر ایک چھوٹی ندی آپ کے گھر کے قریب سے گزرتی ہو اور آپ اُسے چھلانگ لگا کر پار کر جاتے ہیں تو یہ آپ کا خود اعتماد ہونا ظاہر کرے گا۔ لیکن اگر چھوٹی ندی کے بجائے کوئی بڑا دریا ہو اور آپ اُسے چھلانگ مار کر پار کرنا چاہیں تو کامیاب نہیں ہوں گے۔ بلکہ آپ دریا میں گر کر ڈوب جائیں گے۔

اس دنیا میں ہم سب دو اطراف کے درمیان رہتے ہیں ایک طرف ہم ہیں دوسری طرف بیرونی حالات ہیں۔ دوسرے الفاظ میں کوئی بھی کامیابی حاصل کرنے میں آپ کا پچاس فیصد کردار ہوتا ہے جبکہ باقی ماندہ پچاس فیصد کا انحصار بیرونی صورت حال پر ہوتا ہے۔

پھر اس صورت حال میں آپ کو یہ کرنا ہے کہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے آپ دونوں اطراف کے مسائل پر غور و فکر کریں۔ اگر آپ نے صرف اپنی خواہشات کو پیش نظر رکھا اور بیرونی حالات کو نظر انداز کر دیا تو آپ کا منصوبہ لازمی ناکامی سے دوچار ہوگا۔ اور پھر آپ دوسروں کے بارے میں شکایات شروع کر دیں گے جب کہ آپ کے علاوہ کوئی اور آپ کی شکست کا ذمہ دار نہیں ہے۔



خطرناک عادت

اگر آپ نے اپنے غلط رویے کو فوری درست نہ کیا تو یہ ممکن ہے کہ آپ

کا یہ رویہ آپ کی عادت بن جائے

اکثر ایسا ہوتا ہے لوگ اپنے کسی رویے کو عادت میں بدلنے سے روکتے ہیں۔ کیونکہ اگر عادت جڑ پکڑ جائے تو نشے کی طرح اس سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت حال میں متاثرہ آدمی وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوتی ہے۔ اور عملی طور پر وہ آدمی ناقابل علاج ہو جاتا ہے۔ یہ معاملہ ہر بری عادت اور نشے کے ساتھ ہے۔

عادات بہت تیزی سے ناقابل علاج نشے جیسی صورت اختیار کر سکتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو اپنی غلطیوں پر توبہ کریں اور فوراً آپ کو اپنا محاسبہ کرنا چاہیے اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے رویہ کو بدلنا بھی چاہیے۔ اپنی غلطیوں کو درست کرنے میں تساہل نہ کریں آج کا کام کل پر نہ چھوڑیں۔ آپ اپنی غلطیوں کو آج اور ابھی درست کریں۔

اگر آپ نے اپنے غلط رویے کو فوری درست نہ کیا تو یہ ممکن ہے کہ آپ کا یہ رویہ آپ کی عادت بن جائے۔ اور بعد ازاں یہ ناقابل علاج نشے جیسی صورت اختیار کر جائے۔



کیلنڈر پر توارخ

ہر نیا طلوع ہونے والا دن اپنے ساتھ کئی مواقع لے کر آتا ہے۔ یہ مواقع با آواز بلند اپنی آمد کا اعلان نہیں کرتے بلکہ یہ خاموش زبان میں بات کرتے ہیں۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اُن کو پہچانیں اور ایک باقاعدہ منصوبہ بندی سے اُن کو استعمال کریں۔

کسی نے بالکل درست کہا ہے، ”وہ دن جو آپ بھر پور طریقے سے گزارتے ہیں وہ ہی دن آپ کا ہے، باقی ماندہ سارے دن تو آپ کے کیلنڈر پر محض توارخ ہیں“

زندگی گزارنے کے دو طریقے ہیں ایک صرف اپنا وقت گزارنا، دوسرا اپنا وقت استعمال کرنا۔ اگر آپ صرف اپنا وقت پاس کر رہے ہیں تو آپ اپنی زندگی ضائع کر رہے ہیں۔ لیکن اگر آپ اپنا وقت با معنی طریقہ سے گزار رہے ہیں۔ تو آپ واقعی زندگی کا حق ادا کر رہے ہیں۔ اور اس حیران کن رحمت جیسے زندگی کہتے ہیں اُس کو بالکل درست استعمال کر رہے ہیں۔

ہر نیا طلوع ہونے والا دن اپنے ساتھ کئی مواقع لے کر آتا ہے۔ یہ مواقع با آواز بلند اپنی آمد کا اعلان نہیں کرتے بلکہ یہ خاموش زبان میں بات کرتے ہیں۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اُن کو پہچانیں اور ایک باقاعدہ منصوبہ بندی سے اُنھیں استعمال کریں۔ آپ کو اس چیز کی ضرورت ہے کہ ماہرانہ انداز میں مواقع کو پہچان لیں جو آپ کے راستے میں روز آپ کے منتظر ہوتے ہیں۔ آپ کو جاننا چاہیے کہ کون سے مواقع آپ کے لیے ہیں اور کون سے نہیں ہیں۔ آپ میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے وہ مواقع جو آپ کے لیے ہیں اُن کو پرسکون ذہن کے ساتھ استعمال کر سکیں۔ آپ کو ان مواقع کو حقیقت پسندانہ انداز اور بہترین طریقے سے استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ان مواقع کو استعمال کرتے ہوئے ہماری حدود کیا ہیں۔ جس میں رہتے ہوئے آپ نے کام کرنا ہے۔ مزید ان مواقع کو استعمال کرتے ہوئے کسی دوسرے کے دائرے عمل میں مداخلت نہیں کرنی ہے۔

ایک اور اہم چیز جو آپ کو روزمرہ مواقع استعمال کرتے ہوئے پیش نظر رکھنی چاہیے کہ دنیا میں صرف آپ ہی زندگی کی تعمیر کے لیے سرگرم نہیں ہیں بلکہ اور بہت سے لوگ ہیں جو اس

مقصد کے حصول کے لیے تگ و دو کر رہے ہیں۔

اگر آپ زندگی میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو بہت ضروری ہے کہ آپ دوسروں کے ساتھ کشیدگی پیدا نہ کریں۔ آپ کو چاہیے کہ اپنی منزل کو دوسروں کے ساتھ ٹکرائے بغیر تلاش کریں۔ جس طرح آپ کی کچھ دلچسپیاں ہیں اس طرح دوسروں کی بھی ہیں۔ ایک کامیاب شخص بڑی احتیاط سے دوسرے لوگوں کے مفادات سے ٹکرانے سے اعراض کرتا ہے۔ اور اپنے مقصد حیات کو حاصل کرنے کے لیے گامزن رہتا ہے۔

☆☆

آخری لفظ

روحانیت کوئی پراسرار اصطلاح نہیں ہے۔ یہ مثبت سوچ کا دوسرا نام ہے۔ مثبت فکر کا مطلب ہے کہ تمام منفی تجربات کے باوجود مثبت سوچ کے ساتھ زندگی گزارنا۔ یہ ہی روحانیت کی کلید ہے کوئی بھی آدمی یا عورت جو روحانی زندگی گزارنے کے خواہش مند ہیں انھیں منفی تجربات کو مثبت رد عمل میں بدل دینے والا فارمولا اختیار کرنا چاہیے۔ روحانیت وہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک کبھی کمال ہے۔

روحانیت آپ کو ذہنی دباؤ سے نجات کا باعث بنے گی اور مستقل طور پر آپ کے اطمینان ذہن کا سامان کرے گی۔ روحانیت اپنی نوعیت میں غیر مادی خوبی ہے لیکن یہ مادی اور غیر مادی ہر طرح کی کامیابی کی ضامن ہے۔ اگر آپ ایک کامیاب شخص کی طرح زندہ اور مرنا چاہتے ہیں تو آپ کو روحانی زندگی گزارنے کا فن سیکھنا چاہیے۔ روحانیت مرد کو سپر مین اور عورت کو سپر وومن بنا دیتی ہے۔ روحانیت آپ کی فطرت میں پوشیدہ صلاحیتوں کو آشکارا کرتی ہے۔ روحانیت دنیا میں عظیم کامیابی حاصل کرنے کا پوشیدہ راز ہے۔

☆☆

محمد فاروق

منصورہ پوسٹ آفس، وحدت روڈ، لاہور

15/10/2018°

۱۷۔ اے وارث کالونی